

خواہن اور دو شہزادوں کیلئے اس میں کیا شہزادہ ہوا

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی

FEBRUARY
2016

پاک سوسائٹی
پاک سوسائٹی
پاک سوسائٹی

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماڈل: ماریہ رضوی

میک اپ: روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی: موسیٰ رضا

READING
Section



رايان انجسٹ

چيف ايڊيٽر
صالحه محمود

ايڊيٽرز
سدي گورد جفري
ناتھ نري، فزار جفري
E-Mail: rajabri@psl.com
ناتھ UAE، گلبر عسلي جفري
Mail: esra@psl.com
ناتھ لندن، فزار جفري



READING
Section

انٹرویو

سعید وائٹ گہت اکرم ۹

سلسلے وار ناول

چل اڑ جا اب تیری باری عائشہ ذوالفقار ۲۱۲

مکمل ناول

عجبت ہوئی مہرباں افشاں علی ۱۲
عنادل تمہاری ہوئی دل سے ایس حبیب خان ۸۲

ناولٹ کے

عجبت جاوواں ہے فاطمہ خان ۲۸
میری ہر خوشی کا آغاز تم ہو قرۃ العین سکندر ۱۵۰

- ۶۲ یوم بچوں نظیر فاطمہ
۶۶ محبت کے دن ہزار ماریہ یاسر
۷۴ میرے دل کی ملکہ ثناء کنول
۷۶ ویلنٹائن ڈے سونیا چوہدری
۱۰۸ محبت کا دن راجہ افضل خان
۱۱۳ معصوم خریدار فریدہ فرید
۱۲۶ شکستہ آرزو سیدہ فرزانه
۱۳۱ محبت جرم تھا میرا حمیرا قریشی
۱۳۳ اے دل بے خبر ریمیل آرزو
۱۳۴ میرے خواب ریزہ ریزہ صالحہ محمود
۱۶۲ گھوڑی مون شاہ
۱۶۸ محبت دکھ دیتی ہے شہلا گل سحر
۱۷۶ خواب بنے خاک اقراء سیف
۱۸۲ خدا کے فیصلے زینب ندیم ملک
۱۸۸ پچھل پجری حورینہ سعد
۱۹۲ میرا گھر اسویرہ علی
۱۹۸ منزل راہ و قاف فرح نازر فتن
۲۰۶ روشن مستقبل کی آرزو سعدیہ اقبال

زیر سالانہ بڈیٹنگ سوسائٹی

720 روپے

34535726

فروری 2016ء

جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 2

قیمت 60 روپے

انتباہ:-

ماہنامہ "رہا" ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی لی وی جھٹل یا ڈراما، ڈرامائی کھیل اور ٹیلی ویژن کی کسی ناول کی اشاعت پر ادارہ غازی کی ایب آئی آر سرج کلاس اس لئے پیشتر سے اجازت لینا ضروری ہے ورنہ "رہا" کے "کھین"۔

مستقل سلسلے

۲۴۶ صالحہ محمود
۲۵۳ شریا اقبال
۲۵۷ شہلا مشائق
۲۳۵ نورین ملک
۲۵۲ ادارہ

۷ سندھیے
۲۳۳ کچن
۲۳۲ سنگھار
۲۳۹ اشعار
۲۳۷ دوستوں کے نام پیغام

صالحہ محمود
صدف سعد
شہلا مشائق
نورین ملک
نورین ملک

روا کی زبانی
ذرا پھر سے کہنا
خیر
پہلی بارش



READING
Collection



قارئین! آپ سب کا بے حد شکر ہے۔ سال نو نمبر پر روا کی پذیرائی اچھی لگی۔ آپ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں سال کے آغاز میں ہمت و توانائی عطا کر دی ہے۔ فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تب جنوری کی ہواؤں کا زور ٹوٹ چکا ہوگا۔ ٹوٹنے اور جوڑنے کا عمل صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے لہٰذا فصلی زندگی کے فاصلے کبھی کم اور کبھی اتنے طویل ہوتے ہیں کہ ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا اس آنے والے نکل کا جس کا ہمیں ادراک نہیں۔

قارئین! فروری موسم بہار کا آغاز زندگی کی وہی رفتار، کبھی ہم کبھی تم، خوب صورت لہجوں کے سائے زندگی کی یہ اواہن کو بھائی، وقت کی آنکھ مچولی، خوب صورت لہجوں کا ساتھ۔ رب کائنات کی ٹھنڈی ٹھنڈی بارشیں اور سرد ہواؤں کے جھونکے پورے ملک کو حسین بنا رہے ہیں۔ وہیں تھرکی بیماریوں پر آنکھیں بند نہیں ہو سکتیں۔ یہ نرم اور گرم جھونکے زندگی کے ساتھ ساتھ موسم بہار میں زندگی خوشگوار لگتی ہے وہیں کہیں گرم لہریں ہمیں سرد کر دیتی ہیں۔ زندگی رب کائنات میں یکساں رواں دواں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر عمل پر ہم بے بس اور وہ باختیار ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا یا ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایک ایک ذرے کا عمل اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے۔ اس ذات باری تعالیٰ کو ڈھونڈیں یا قریب جائیں اتنے ہی اس کے قرب میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ وہی ایک راز ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ماہ فروری میں آپ سرد ہواؤں سے محفوظ رہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔ اپنا خیال رکھیے سند یہ ضرور لکھیے۔ تو اس ماہ کا ردا آپ کو کیا لگا، سند یہ ضرور لکھیے۔ نئے لکھنے والے ردا کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھیے اپنی تحاریر اس امید کے ساتھ بھیجیں کہ ہم انہیں موقع ضرور دیں گے۔

آپی .

صالحہ محمود

دلچسپ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جانے والے شہید کے علاوہ شہادت کی موت 7 قسم کی ہوتی ہے۔ (1) طاعون سے مرنے والا۔ (2) پانی میں ڈوب کر مرنے والا۔ (3) پہلو کے درد میں مرنے والا۔ (4) پیٹ کی بیماری میں مرنے والا۔ (5) کسی چیز کے نیچے دب کر مرنے والا۔ (6) آگ میں جل کر مرنے والا۔ (7) بچہ جنتے وقت فوت ہونے والی عورت۔“ (ابوداؤد، نسائی، عن جابر بن عتیق)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ”سب سے زیادہ آزمائشوں سے دو چار ہونے والے کون لوگ ہیں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انبیاء ہیں۔ ان کے بعد فضیلت والے لوگ ہیں پس صاحب فضیلت لوگوں میں سے ہر آدمی کو اس کے ایمان کے لحاظ سے آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ اگر وہ دین (کے امور) میں سخت (پابند) ہے تو اس کے لیے آزمائش بھی سخت ہے اور اگر وہ دین کے (امور) میں کمزور ہے تو اس کے لیے آزمائش بھی معمولی ہے۔ اسی طرح وہ آزمائش میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ گناہوں سے پاک ہو کر زمین پر چلنے پھرنے لگتا ہے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ، عن سعد)

مریض کی بیمار پرسی اور بیماری کے ثواب کا بیان

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مسلمان کسی مسلمان کی صبح کے وقت بیمار پرسی کرتا ہے اس کے حق میں شام تک 70 ہزار فرشتے استغفار کرتے رہتے ہیں اور اگر شام کے وقت بیمار پرسی کرتا ہے تو صبح تک اس کے حق میں فرشتے استغفار کرتے رہتے ہیں اور جنت میں اس کے لیے باغ (تیار کر دیا جاتا) ہے۔“ (ترمذی، ابو داؤد، عن علی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مسلمان کسی مسلمان کی بیمار پرسی کرتا ہے اور 7 بار یہ دعا پڑھتا ہے:

أَسْأَلُ اللَّهَ الْعَظِيمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ أَنْ يَشْفِيكَ
(ترجمہ) ”میں اللہ عظیمت والے سے سوال کرتا ہوں جو عرش عظیم کا رب ہے کہ وہ آپ کو شفا عطا فرمائے۔“ اگر اس کی موت کا وقت نہ آ پہنچا ہو تو اس مریض کو شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی، عن عبد اللہ بن عباس)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب بیمار پرسی کے لیے جاؤ تو بیمار کے پاس یہ دعا پڑھو:

اللَّهُمَّ اشْفِ عَبْدَكَ
(ترجمہ) ”اے اللہ اپنے بندے کو شفا عطا فرمائے۔“ (ابوداؤد، عن عبد اللہ بن عمرو)

READING
Section

7 فروری 2016ء

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ اپنے (نیک) بندہ کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں تو اسے (اس کے گناہوں کی) سزا دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اپنے (گناہ گار) بندہ کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کی سزا کو اس سے دور رکھتے ہیں یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے اس کے گناہوں کا بدلہ ملے گا۔“ (ترمذی، عن انسؓ)

(وضاحت: اس لیے بیماری، نقصان، خوف اور غربت سے گھبرانا نہیں چاہیے۔)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کثرتِ ثواب کا تعلق مصائب کی سختی سے ہے۔ بلاشبہ اللہ عزوجل جب کسی جماعت کو محبوب جانتے ہیں تو اسے آزمائشوں میں ڈالتے ہیں پس جو آدمی آزمائش پر راضی رہے اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور جس آدمی نے رونے پینے کا اظہار کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہوتی ہے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ، عن انسؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مومن مرد اور مومنہ عورت کے جسم اس کے مال اور اس کی اولاد پر مسلسل مصائب نازل ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب اس کی ملاقات اللہ سے ہوتی ہے تو وہ گناہوں سے پاک و صاف ہوتا ہے۔“ (ترمذی، عن ابی ہریرہؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیمار کی عیادت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس سے) فرمایا: ”خوش ہو جاؤ۔“ اس لیے کہ اللہ کا فرمان ہے: ”بخار میری آگ سے میں دنیا میں اپنے مومن بندہ کو اس میں مبتلا کرتا ہوں تاکہ

قیامت کے دن یہ اس کے لیے جہنم کا بدلہ ہو جائے۔“ (احمد، ابن ماجہ، بیہقی، عن ابی ہریرہؓ)

ایک آدمی جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوا، مدینہ میں ہی فوت ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد فرمایا: ”کاش، یہ پیدائش کی جگہ کے سوا کسی اور مقام میں فوت ہوتا۔“ صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا۔ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس لیے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی آدمی جب پیدا ہونے کے مقام کے علاوہ کسی دوسرے مقام میں فوت ہوتا ہے تو اس کے پیدا ہونے کے مقام سے لے کر اس کی موت کی جگہ تک کے برابر اس کو جنت میں جگہ دی جاتی ہے۔“ (نسائی، ابن ماجہ، عن عبداللہ بن عمروؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”شہداء اور (طویل بیماری کی وجہ سے) بستر پر فوت ہونے والے ان لوگوں کے بارے میں اپنے رب عزوجل سے جھگڑیں گے جو طاعون (کی بیماری) سے فوت ہوئے۔ شہداء کہیں گے کہ (یہ) ہمارے ساتھی ہیں جیسے ہم قتل ہوئے (یہ بھی) قتل ہوئے (جبکہ) بستر پر فوت ہونے والے کہیں گے یہ ہمارے بھائی ہیں جیسے ہم فوت ہوئے یہ بھی بستر پر فوت ہوئے۔ ہمارا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے زخم دیکھو اگر ان کے زخم مقتولوں کے زخموں کے مشابہ ہیں تو یہ ان میں سے ہیں اور ان کے ساتھی ہیں۔ جب دیکھا جائے گا تو ان کے زخم شہداء کے زخموں کے مشابہ ہوں گے۔“ (احمد، نسائی، عن عرابض بن ساریہؓ)

.....☆.....

ایف ایم 100 کے معروف پریزنٹر

سعید واثق

ملاقات



رات کی تاریکی جب دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہوتی ہے تو ایف ایم 100 لاہور سے سعید واثق اپنے خوب صورت اور منفرد انداز سے اپنی محفل کا آغاز کرتے ہیں۔ جس میں شاعری گیت ہوتے ہیں۔ سعید واثق کا یہ خوب صورت انداز لسنرز کو بے حد پسند ہے۔ راتوں کو جاگنے والے ان کے شوز کا انتظار کرتے ہیں۔ تقریباً 16 سال سے ایف ایم 100 پر غزل ٹائم کر رہے ہیں۔

سعید واثق بطور شاعر بھی نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہیں ان کے 5 شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ سعید واثق سے خصوصی ملاقات ردا ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے۔

☆ السلام علیکم، سعید واثق کیسے ہیں؟

☆ وعلیکم السلام، میں خیریت سے ہوں۔

☆ ایف ایم میں کس نام سے منسلک ہیں۔

☆ سعید واثق کے نام سے۔

☆ ایف ایم پر کس نے متعارف کروایا؟

☆ متعارف کسی نے نہیں کروایا۔ اپنے ہی

تو تعلقات تھے شوکت اقبال صاحب ہوتے تھے اس

وقت ان سے تعلق تھا انہوں نے ایڈریس دیا اور ایف

ایم کا آڈیشن دیا۔

☆ آپ نے آڈیشن میں کیا پڑھا؟

☆ شاعری کا پروگرام تھا۔ اپنی غزل ”کہاں ہوتے

پیش کی۔

☆ ایف ایم پر پروگرام کرنا شوق تھا؟
☆ ایف ایم پر پروگرام کرنا شوق نہیں جنون ہے۔
روح کو تسکین ملتی ہے۔

☆ پہلا پروگرام کون سا تھا اور کہاں سے کیا؟
☆ پہلا پروگرام غزل ٹائم تھا 30 مئی 1999ء
میں کیا۔

☆ آج کل کون سے شوز کر رہے ہیں؟
☆ آج کل ایف ایم 100 سے رات کے شوز
کرنا ہوں۔

☆ آپ کے خیال میں ایک پریزنٹر دوسرے
پریزنٹر کی نقل کرتا ہے؟
☆ بہت سے لوگ کرتے ہیں نقل، آئیڈیاز لیتے

ہیں تو پھر اسی طرح کرتے ہیں۔ اچھا پریزنٹر تو وہ ہے
جو اپنے اسٹائل میں پروگرام کرتا ہے نقل اتارنے کا۔
ہر کسی کی اپنی ہی شناخت ہوتی ہے۔

☆ کس ساتھی پر یونیورسٹی کے ساتھ شو کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے؟
 ☆ کبھی کبھی کے ساتھ مزہ آتا ہے۔ سب بہت اچھے ہیں۔ شو میں ایک دوسرے کے چہنی سٹج پر آجاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ کس طرح بات آگے بڑھانی ہے۔

☆ جب پہلا پروگرام کیا تو کیا کیفیت تھی؟
 ☆ پریشان نہیں تھا۔ عمدہ طریقے سے کیا۔

☆ لسٹرز کی طرف سے آپ کے پروگرام کا کیسا فیڈ بیک ملتا ہے؟

☆ بہت اچھا۔ 17 سال سے اچھا فیڈ بیک نہ ملتا، اتنا پیار نہ ملتا تو میں یہ پروگرام نہیں کر سکتا تھا۔ آج کل تو یہ دور آ گیا ہے کہ اتنے زیادہ ایف ایم چینل آ گئے۔ اچھا پروگرام ہو تو لوگ پسند کرتے ہیں اور پسند کرنے کے لیے غزلوں اور گیتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ رات کو جاگنے والے لوگوں کی اپنی ہی پسند ہوتی ہے۔ اس میں میوزک کا بہت عمل دخل ہے۔ ہر ایک کی پسند کا میوزک ہو ہائی لیول پر جا کر بات کرنی پڑتی ہے۔

☆ کیا کبھی ایسا ہوا پروگرام کرتے ہوئے نیند آگئی ہو؟

☆ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ جتنا زیادہ فریش ہوتا ہوں اتنا ہی زیادہ فٹ ہو جاتا ہوں۔ نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ نیند آنے کی بجائے نیند اڑ جاتی ہے۔

☆ کیسا میوزک پسند ہے؟
 ☆ میڈیم نور جہاں، لتا کے سونگ یا پھر موڈ پر منحصر ہوتا ہے۔

☆ پروگرام کی بہتری کے لیے کیا کرتے ہیں؟
 ☆ بہت زیادہ پڑھتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ علم، نئے لوگوں کی پسند، اب اور 15 سال پہلے کا دور چیلنج ہو گیا۔ میڈیا بھی چیلنج ہو گیا ہے۔ پروگرام کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

☆ فیملی کے بارے میں بتائیں؟
 ☆ والد، سسٹر، بیگم، بیٹا۔
 ☆ چاندنی راتیں کیا پیغام دیتی ہیں؟
 ☆ انسان کو اچھی امید رکھنی چاہیے۔ اندھیری رات کے بعد روشنی بھی آتی ہے۔

☆ مزاجا کیسے ہیں؟
 ☆ دھیمے مزاج کا ہوں۔

☆ وہ لمحہ جس نے قوس قزح کے رنگ دکھیر دیئے؟
 ☆ میرے بیٹے عبداللہ کی پیدائش کا دن۔

☆ جب بارش برستی ہے؟
 ☆ سوتے ہوئے اٹھ جاتا ہوں کہ آج بارش ہے۔

☆ غصہ آئے تو کیا کرتے ہیں؟
 ☆ صبر کرتا ہوں۔

☆ کیا اچھا لگتا ہے دن یا رات؟
 ☆ میرے حصے میں رات آتی ہے۔

☆ دوستوں کو SMS کرنا اچھا لگتا ہے یا فون کال کرنا؟
 ☆ مجھے فون کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔

☆ جب بور ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟
 ☆ کوئی نہ کوئی کام یا پھر شاعری کرتا ہوں۔

☆ کیا کبھی ایسا ہوا کہ پروگرام نہ کرنے کو دل چاہ رہا ہو لیکن پروگرام کیا؟

☆ ایسا بہت کم ہوا لیکن تھکاوٹ، طوفانی بارش میں بھی نہیں رکتا، چلا جاتا ہوں پروگرام کرنے۔

☆ وہ کون سے لسٹرز ہیں جو آپ کے پروگرام میں نہ آئیں تو آپ پریشان ہو جاتے ہیں؟

☆ کوئی ایجنٹیل لوگ نہیں ہیں۔ سب ایک جیسے ہیں۔
 ☆ بچپن کیسا گزرا؟ بچپن کی کوئی یاد؟

☆ میں بچپن میں شرارتیں خوب کیا کرتا تھا لیکن پڑھانی بھی بہت کرتا تھا۔

☆ زندگی کے بارے میں آپ کی رائے؟
 ☆ ہر لمحہ امتحان، ہر لمحہ آزمائش۔

☆ کیا پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے ہیں؟
 ﴿محبت تو نام ہی پہلی نظر میں کسی پر مرنے کا ہے
 تاہم انجام الگ بات ہے۔

☆ سیرت سے متاثر ہوتے ہیں یا صورت سے؟
 ﴿پہلے صورت سے اگر سیرت بھی اچھی ہو تو تعلق
 قائم ہو جاتا ہے۔

☆ کوئی ایسی عادت جو آپ کے دوستوں اور گھر
 والوں کو ناپسند ہے؟

﴿میں من موچی ہوں اس وجہ سے بعض اوقات
 دوست احباب ناراض ہو جاتے ہیں۔

☆ قسمت یا کوشش پر بھروسا کرتے ہیں؟
 ﴿میں ہر کام اللہ پر کامل یقین کے ساتھ کرتا

ہوں۔ کوشش ایک لازمی امر ہے کامیابی، ناکامی اللہ
 کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو قسمت کہتے ہیں۔

☆ آپ کی کتنی کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں
 ان کے نام؟

﴿میری اب تک 5 شعری مجموعے شائع ہو چکے
 ہیں۔ (1) کہاں ہوتے ہو (2) سب بھول چکا (3)

تمہارا عکس ہوں (4) دل میں تم رہتے ہو (5) ہر
 طرف محبت ہے۔ کلیات واثق میں پہلی چار کتابیں

ایک ساتھ دستیاب ہیں۔
 ☆ آپ کی سالگرہ کا دن، سالگرہ یاد رکھتے ہیں؟

﴿بالکل یاد رہتی ہے۔ یکم اپریل جو ہونی اور دھوم
 دھام سے مناتا بھی ہوں۔

☆ حقیقت پسند ہیں یا خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں؟
 ﴿صورت حال پر منحصر ہے ہر وقت خیالات میں تو

نہیں رہتا لیکن خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے۔
 ☆ لوگ آپ کو چاہتے ہیں، یہ احساس کیسا لگتا ہے؟

﴿یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ میں انتہائی عاجز سا
 بندہ ہوں پیارا اور چاہت ملنے پر زیادہ جھک جاتا ہوں۔

☆ کیا راستے کی دشواریاں کامیابی کی دلیل
 بنوتی ہیں؟

﴿ہمارا تو ایمان ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی
 ہے۔ مشکلات کے بغیر کامیابی کا تصور ہی ممکن نہیں۔

☆ ریڈیو کی اہمیت کے بارے میں کیا کہیں گے؟
 ﴿ایف ایم ریڈیو کی لسنرز شپ زیادہ ہو گئی ہے۔

ایف ایم پر بھی اب نیوز اپ ڈیٹ میوزک نئے
 پرانے گلوکار نئے گلوکاروں کو ایف ایم چینل بہت

زیادہ پروموٹ کرتے ہیں۔
 ☆ اسٹاف کے ساتھ آپ کا رویہ؟

﴿بہت زیادہ اچھا ہے۔ سب لوگ اکٹھے ہوتے
 ہیں۔ اعتماد کرتے ہیں ایک دوسرے پر۔

☆ کوئی ایسی شخصیت جو بہت یاد آئے؟
 ﴿ماں باپ۔

☆ دل پسند منظر؟
 ﴿بادل چھائے ہوئے ہوں، بارش ہو رہی ہو۔

☆ پاکستان کے لوگوں کے بارے میں آپ
 کی رائے؟

﴿بہت اچھے ہیں، محنتی ہیں، جس کو موقع ملتا ہے
 آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

☆ جو لوگ ریڈیو کی فیلڈ میں آنا چاہیں ان کے
 نام پیغام؟

﴿ان کو یہ کہنا چاہوں گا کہ پہلے تو آپ سنیے،
 دیکھیں پھر اس فیلڈ میں آئیں۔ اپنی تعلیم مکمل کریں

اور یہ بھی ہو کہ وہ اپنے آپ کو شناخت کر سکتا ہو۔ بڑا
 مشکل اور محنت طلب کام ہے۔

☆ آپ شاعری بھی کرتے ہیں آپ کا پہلا شعر
 کون سا تھا؟

﴿میرا پہلا شعر
 جو حص مری آنکھ کی تپلی میں چھپا تھا

میں شہر کی گلیوں میں اسے ڈھونڈ رہا تھا
 ☆ دولت، محبت، شہرت، صحت ان چاروں میں

سے آپ کا انتخاب؟
 ﴿صحت اور محبت ہو تو تمام باقی چیزیں خود بخود مل

جاتی ہیں۔

☆ پسندیدہ ملک کون سا ہے؟

پاکستان۔

☆ پسندیدہ خوشبو؟

گلاب کی خوشبو۔

☆ پسندیدہ لباس؟

شلوار قمیص۔

☆ چھٹی ہوئی خواہش؟

لیاری میں بہت بڑا ہسپتال بناسکوں۔

☆ رداؤ انجسٹ کے بارے میں آپ کی رائے؟

رداؤ انجسٹ کے بارے میں یہی کہوں گا کہ

سماجی معاشرتی لحاظ سے اچھا ڈانجسٹ ہے۔ اس میں

ہر ایک کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کی ترقی اور

بہتری کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ قارئین کے نام کوئی پیغام؟

زیادہ سے زیادہ اپنی تعلیم پر توجہ دیں۔ جلدی

فیصلہ نہ کریں۔ دوسروں کے کام آئیں اس سے پہلے

کہ آپ کسی کے کام آنے کے قابل نہ رہیں۔

☆ اپنی شاعری سے کچھ اشعار؟

تو مجھ کو جان سے پیارا ہے محبت خود بتا دے گی

کہ میرا عشق سچا ہے محبت خود بتا دے گی

☆

ہجر میں خون رلاتے ہو کہاں ہوتے ہو

لوٹ کر کیوں نہیں آتے کہاں ہوتے ہو

☆

اسی عشق سے اسی چاہ سے اسی پیار سے

میرے ہاتھ میں ایک گلاب دوں بہت دنوں سے اداں ہوں

☆

ہجر میں خون رلاتے ہو کہاں ہوتے ہو؟

لوٹ کر کیوں نہیں آتے ہو کہاں ہوتے ہو؟

جب بھی ملتا ہے کوئی شخص بہاروں جیسا

مجھ کو تم کیسے بھلاتے ہو کہاں ہوتے ہو؟

READI
Section

یاد آتی ہیں اکیلے میں تمہاری نیندیں
کس طرح خود کو سلاتے ہو کہاں ہوتے ہو؟
مجھ سے پھٹے ہو تو محبوب نظر ہو کس کے
آجکل کس کو مناتے ہو کہاں ہوتے ہو؟
شب کی تنہائی میں اکثر یہ خیال آتا ہے
اپنے دکھ کس کو سناتے ہو کہاں ہوتے ہو؟
سرد راتوں میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں؟
آگ سی دل میں لگاتے ہو کہاں ہوتے ہو؟
شہر کے لوگ بھی واقف یہی کرتے ہیں سوال
اب بہت کم نظر آتے ہو کہاں ہوتے ہو؟

☆

وہ ہمارا کہاں ہمارا تھا؟

جاں سے پیارا کہاں ہمارا تھا؟

وہ جو لگتا تھا آشنا ہم کو

وہ نظارہ کہاں ہمارا تھا؟

ہم اندھیروں میں بسنے والے لوگ!

شب کا تارا کہاں ہمارا تھا

ہاں! گزر تو گئی شبِ فرقت

پر گزارا کہاں ہمارا تھا؟

تاؤ اپنی جہان اتاری تھی

وہ کنارہ کہاں ہمارا تھا؟

ہم نے جانی یہ بات تیرے بعد

شہر سارا کہاں ہمارا تھا؟

تیری مرضی سے ہی یہ بہتا رہا

دل کا دھارا کہاں ہمارا تھا؟

ہم ہی کچھ خوش گمان تھے واقف

ہر ستارہ کہاں ہمارا تھا؟

☆ بہت شکریہ سعید واقف آپ کا۔ آپ نے روا

ڈانجسٹ کے لیے ٹائم نکالا۔

☆ آپ کا بھی بہت شکریہ رداؤ انجسٹ کا بھی بہت شکریہ

☆.....

افشاں علی

کمل ناول

محببت ہوئی مہربانی

”یار! تجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ جو تو سوچ رہا ہے وہ صحیح ہے؟“ آفاق نے اپنے سامنے بیٹھے شخص سے سوال کیا۔



”کیونکہ یہ واقعی صحیح ہے اور ایسا سوچنے پر مجھے اس کی حرکتوں اور باتوں نے ہی مجبور کیا ہے۔“ اس نے اضطرازی انداز میں پہلو بدلتے ہوئے اپنی بات برزور دیا۔

آفاق نے اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھا جس کی پریشان آنکھیں اور پیشانی پر پھیلی تشویش کی لکیریں صاف ظاہر کرتی تھیں کہ گزشتہ کئی روز سے وہ مضطرب ہے۔

”انہیں کوئی پریشانی ہے؟“ آفاق نے اس الجھے بکھرے شخص سے دریافت کیا۔

”اچھی جا ب، روپیہ پیسا گھر اور گھر کے تمام اختیارات اس کے حوالے ہیں۔ اس کے باوجود اس کا رویہ اس کی پریشانی سمجھ سے باہر ہے۔“ اس نے پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔

”مثلاً کیسا روپیہ؟“ آفاق نے استفسار کیا۔

”اس کا بیٹھے بٹھائے گم مسم ہو جانا، پہروں خاموش یک ٹک غیر مرئی نقطے کو گھورتے رہنا، راتوں کو بے زبان رونا۔“ وہ متذبذب انداز میں سب بتانے لگا۔



Downloaded From
Paksociety.com

Section

”ہوں!“ آفاق نے پرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔

”ہمارا بیٹا ماضی ہمارے حال پر کافی گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ بعض اوقات بیٹے ماضی کے گہرے اٹوٹ نشان ہمارے لاشعور میں کوئی گزری باندھ دیتے ہیں پھر حال میں ملنے والی محبت، توجہ اور نشان کو مٹانے کا باعث بنتی ہے۔“ آفاق دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ان کی پریشانی کا سبب جاننے کے لیے ان کے ماضی کو جاننا ضروری ہے۔“ آفاق نے سمجھایا۔

”پراس کا ماضی تو سب ٹھیک ہی ہے۔“ سامنے بیٹھے شخص نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہوسکتا ہے سب ٹھیک ہوتے ہوئے بھی کہیں کچھ ٹھیک نہ ہو۔ میری بات مان انہیں میرے پاس یا کسی اور

مشہور سائیکا ٹرسٹ کے پاس لے جانے کے بجائے بذات خود تو ان کی کونسلنگ کر باتوں باتوں میں ان کا ماضی جان اور پوری کوشش کر کہ تو اس گزری تہہ تک پہنچ پائے کیونکہ تیرا اپنا سبب بھرا لہجہ تیرا پیار اور تیرا ساتھ ان کے اعتماد کو بحال کرنے میں مدد کرے گا اور مجھے پوری امید ہے کہ یہ بے بنیاد پریشانی اور نام نہاد الجھنیں جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“ آفاق نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے امید کا جگنو تھمایا۔ تو وہ فرط مسرت سے اپنے دوست ڈاکٹر آفاق کے گلے لگ گیا۔ جس نے اس کی پریشانی کا حل چنگیوں میں بنا دیا تھا۔ وہ اپنے دوست اور مشہور سائیکا ٹرسٹ کی کیبن سے نکلنے کے بعد کچھ حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ پر پریشانی ابھی ختم نہیں شروع ہوئی تھی۔

☆.....☆

یہ 1988ء کا دور تھا۔ جب پاکستانی فلم انڈسٹری میں ندیم اور شمیم پیرزادہ چھانے ہوئے تھے اور یہ اسی کی دہائی تھی جب ضیاء الحق کی آمریت کا اختتام ہوا۔ اس دور میں وہ وزٹ ویزہ پر اپنی والدہ کے ہمراہ دہلی سے پاکستان آئی، جہاں کراچی میں اس کی بیماریاں ستر مرگ پر تھی۔ بیماریاں کی آخری عیادت تو گویا ایک بہانہ بنی۔ اصل میں تو اس کی نسبت اسے پاکستان بھیج لائی تھی۔ مانی کی عیادت کو آئی سلمیٰ بھابی کی نظر جو اس پر ٹھہری تو پلٹتا ہی بھول گئی۔ وہ تھی بھی خوب صورت، گورا چٹا رنگ، دراز قد و قامت، صبح چہرے پر چوڑی پشانی، لمبے سیاہ بال، سلمیٰ بھابی سمیت بہت سی خواتین کی نظروں میں اس کے لیے تعریف و رشک ہوتا۔ مانی کے چالیسویں کے ہوتے ہی سلمیٰ بھابی تو اس کی ماں کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ سلمیٰ بھابی اس کی ماں یعنی روشن آراء بیگم کی ماموں زاد بہوتھیں جو خود تو کراچی میں ہی رہتی تھیں مگر اس کا سسرال میر پور خاص میں رہائش پذیر تھا۔

”آپا! آپ نے ابھی دو بیٹیاں اور بیٹی ہیں۔ نازو کی آج نہیں تو کل شادی تو کرنی ہی ہے تو پھر میرے بتائے ہوئے رشتے میں کیا قباحت ہے۔ دیکھا بھالا لڑکا ہے نہ کوئی آگے نہ پیچھے میرے سسرال میں آتا جاتا رہتا ہے۔ اپنا ذاتی گھر بھی ہے اور سرکاری نوکری کے ساتھ ایک درزی کی دکان بھی۔ اب اور کیا چاہیے۔“

”سب تو ٹھیک ہے سلمیٰ بھابی مگر میں یوں اچانک یہاں اپنی بیٹی کی شادی کیسے کر سکتی ہوں؟ یہ شہر، یہ دیس سب انجان.....!“ روشن آرا نے انکار کیا۔

”یہ دیس انجان ہے ہم تو انجان نہیں تا؟ ہم سب بھی تو ہیں یہاں تو پھر نازو کی فکر کیسی؟ ماشاء اللہ سے اس کی خالہ ہے یہاں۔ دو دو ممانیاں ہیں تو پھر نازو کہاں سے اکیلی ہوئی۔ بس آپ سارے وہم و سوسے دل سے نکالو

اور ہاں کر دو۔“ سلٹی نے حتی الامکان قائل کرنے کی پوری کوشش کی۔

”بات تو آپ کی بھی صحیح ہے پر میں اپنے بھائی بھائی اور اس کے ابو وغیرہ سے مشورہ کروں پھر بتاؤں گی لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا۔“ وہ مطمئن نہ تھیں۔

”ہاں ہاں آپ آرام سے سب سے مشورہ کر لو، آپ ماں ہونا بیٹی کی ماں کا دل ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ بھائی صاحب سے بھی بات کر لو پھر جب کہو گی میں لڑکے سے ملو ادوں گی۔ نیک سیرت ہے لڑکا، اچھی نوکری اپنا گھر اوپر سے تن تنہا اس بارے میں زیادہ ناہی سوچیں بلکہ ہاں ہی کر دیں تو اچھا ہی ہے۔ ویسے بھی لڑکے کو میں نے اپنا منہ بولا بھائی بنایا ہے تو اس کی ذمہ داری تو میری ہی ہے اور ناز دیکھی میری اپنی ہے اس کے لیے میں کچھ غلط تھوڑی نا فیصلہ کروں گی۔ آپ اٹھنڈے دماغ سے بیٹی کی ماں بن کر نہیں بیٹیوں کی ماں بن کر سوچنا دو اور بیٹیاں بھی موجود ہیں ایک کی قسمت کھلی تو باقی بھی جلد اپنے گھروں کی ہو جائیں گی۔ آپ جواب ہاں میں ہی دینا۔“ روشن آرا بیگم کو سوچوں میں گم دیکھ کر سلٹی نے جھٹ سے ان پر اس رشتے کے لیے دباؤ بڑھایا تھا۔

☆.....☆

میرج ہال کے لان میں ویسے کی تقریب عروج پر تھی۔ ہر طرف رنگ و پوکا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، معطر خوشبوئیں، زرق برق آجکل اور شوخی لٹوں کو اڑائے پھیر رہی تھی۔ پرل اور گولڈن کامی نیشن کا اتار کئی طرز کا لائٹ فرائک پہنے صبح پیشانی پر ماتھا بیٹھی سجائے بنی سنوری دلہن اور ساتھ میں تھری پیس سوٹ زیب تن کیے خوب رو دھینڈ سم سادو لہا اس وقت ساری محفل کی توجہ کا مرکز تھا۔ میں یعنی مسز عقیدت علوی اس شاندار تقریب کی میزبان بھی۔ کیونکہ اسٹیج پر بیٹھی چاند سورج جیسی جوڑی میرے بیٹے اور بہو کی تھی۔ ضحاک علوی نا صرف ہمارا اکلوتا بیٹا بلکہ اپنی بہن صبا عنہ کا اکلوتا بھائی بھی تھا، اکلوتا ہونے کے باوجود ضحاک عام لڑکوں سے قدرے مختلف تھا۔ وہ بہت سنجیدگی ہوئی طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے بچپن میں نہ کبھی کوئی بے وجہ ضد کی نہ فضول فرمائش۔ لڑکپن سے جوانی تک اس نے پڑھائی کے علاوہ کسی اور طرف آنکھ نہ اٹھا کر دیکھا۔ اس لیے تو آج کامیاب بزنس مین بھی ہے اور ہمارا فرمانبردار و تابعدار بیٹا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ضحاک ہمارا یعنی اپنے می پاپا کا ولا راتو تھا ہی پر اپنی بہن صبا عنہ کی بھی آنکھوں کا تارا تھا۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے جب ہم نے شادی کے حوالے سے اس کی رائے مانگی تو اس نے ہماری پسند سے ہی اپنی پسند کو منسوب جانتے ہوئے جھٹ سے یہ ذمہ داری ہمارے سپرد کر دی۔ اپنے ہیرے جیسے بیٹے کے لیے کوہ نور ڈھونڈنا گو کہ مشکل کام تھا پر یہ مرحلہ جتنا مشکل لگ رہا تھا اتنی ہی خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوا اور درنہجف کی صورت مجھے وہ کوہ نور مل گیا۔ درنہجف کو میں نے کسی شادی کی تقریب میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہی مدعو تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ عام لڑکیوں سے مختلف لگی کیونکہ باقی لڑکیوں کی طرح اوٹ پٹانگ فیشن و شوخ میک اپ کے بجائے وہ بہت ساوگی سے تیار ہوئی تھی۔ سی گرین فرائک پر ہم رنگ بڑا سادو پٹہ اوڑھے وہ اس کی تقریب میں سب سے منفرد لگ رہی تھی۔ باقی کے مراحل بہت تیزی سے طے ہوئے اور نتیجہ ویسے کی صورت میرج ہال کے لان میں موجود تھا۔ یکدم اسٹیج کی جانب سے شورا اٹھا تو میں ماضی سے خوب صورت حال میں لوٹی اور اسٹیج کی جانب نظریں پھیریں، جہاں میرا راجا بیٹا ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا خوب صورت ساکے لیے اپنی رانی بیوی کو پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر سب یک جہزیشن خوب ہو یا کا شور مچا رہے تھے۔ شرمائی شرمائی ہی درنہجف اور مسکراتا ہوا ضحاک میری متانے

روز اہجست [17] فروری 2016ء

READING
Section

یکدم نظروں ہی نظروں میں ان کی نظریں اتاریں۔ کیونکہ اب ان دونوں ہی کی صورت آنے والے دنوں میں میرے گھر خوشیاں ہی خوشیاں آتی تھیں۔

☆.....☆

ان لوگوں کے لیے یہ شہر، یہ ملک بالکل نیا تھا یہاں کے لوگ رواج پہناوا یہاں تک کے زبان بھی سب الگ، یہاں خالص اردو بونی جانی تھی۔ جب کہ وہاں وہ لوگ ہندی بولتے تھے۔ ہاں مگر ایک بات ضرور تھی ان دونوں ماں بیٹی کو اس ویس میں بہت عزت دی جا رہی تھی۔ ہر کوئی بہت اچھے اور پیار سے پیش آ رہا تھا۔ ناز کو بھی اپنے ننھیال والوں سے مل کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پر یہاں مستقل رہنا وہ بھی اپنے ماں باپ اور بہنوں سے دور اس بات کے لیے اس کا دل راضی نہ تھا مگر اسے اطمینان بھی تھا کہ اس کے ماں باپ جو فیصلہ کریں گے سب کچھ مد نظر رکھتے ہوئے کریں گے اور بالآخر فیصلہ ہو گیا۔ پاکستان سے وہلی میں جب خالہ اور ماموں کے بیٹوں کی غیر برادری میں شادی ہونے کی خبر پہنچی تو اس کے ماں باپ تھوڑے پریشان ورنجیدہ سے ہو جاتے کہ نہ جانے کیوں انہیں اپنی سگی بھانجیاں نظر نہیں آتیں۔ ناز کی عمر پچیس سال ہو چکی تھی۔ جب کہ اس سے چھوٹی دو بہنیں بائیس اور انیس سال کی تھیں گویا تینوں ہی جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھیں۔ اس کے ماں باپ کی پریشانی گھر کی اداس سی فضا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شرمندہ شرمندہ گھر کے کاموں میں خود کو مگن رکھتی۔ پاکستان آنے کے بعد بھی سب کی زبانوں سے ایک ہی نوعیت کے سوال سننے کو ملے۔

”ناز کی کہیں نسبت ملے ہوئی؟“ اور وہ یہاں وہاں خود کو چھپانے کی سعی کرنے لگتی۔ اب بھی وہ ممانی کے بچوں کے کپڑے استری کر رہی تھی مگر اچھے ذہن کے ساتھ اس کا دھیان کسی اور ہی سمت اڑے جا رہا تھا۔ وہ استری کیے ہوئے کپڑے ممانی کے کمرے میں رکھنے آئی تو تھوری حیران سی ہوئی کیونکہ یہاں سب بڑوں کی محفل لگی ہوئی تھی۔ خالہ، ماموں، ممانی سمیت تھوڑی مضطرب سی اس کی ماں بھی موجود تھیں۔

”کیا ہوا ماں؟“ وہ ان کی پریشان صورت دیکھ کر یونہی بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ انہوں نے جواب میں کچھ نہ کہا بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”اماں! کیا بات ہے۔ اس سے آپ سب لوگ یہاں جمع ہیں، کوئی پریشانی ہے؟“ اس کی نگاہ باری باری سب کے چہروں سے ہوتی اپنی ماں کے چہرے پر لگی تھی۔

”نہیں بیٹا! کوئی پریشانی نہیں بلکہ اب تو آپ کی ماں کی پریشانی ختم ہوئی ہے۔“ ممانی نے شوخی سے کہا۔ تبھی ماموں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا یا وہ خاموشی سے ماموں کے سامنے بیڈ کے کنارے ٹک گئی جہاں کچھ ہی فاصلے پر اس کی خالہ بھی موجود تھی۔

”بیٹا! آپ کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے آپ کی ماں سمیت ہم سب نے اس رشتے کو آپ کے لیے مناسب سمجھا ہے پھر بھی اگر آپ نہیں چاہتی ہوں یا کوئی بھی بات ہو تو اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کیجیے۔“ ماموں نے ناز کے سر پر ہاتھ رکھے پیار سے اصل بات بلکہ اصل دھماکا کیا اور ساتھ ہی اس کی رائے پوچھی۔ جس کا اختیار اسے سوچ کر بھی گویا چھین ہی لیا تھا۔ کیونکہ باقی سب نے تو رشتے کو پسندیدگی کی سند دے ہی دی تھی۔

”بیٹا! رشتے کی مجبوری نہ ہونی تو میں پرانے ملک میں رشتہ کرتی ہی نا، مجبوری بھی ایسی ہے تمہارے بعد باقی دو کا بھی سوچنا ہے۔ چلو خیر سے اللہ نے نیک سبب بنایا ہے۔ ہم سب نے دیکھا ہے۔ اللہ پر توکل کر کے بھائی بھائی کی اپنائیت اور بھروسے پر میرا دل مانا ہے باقی اب تم بتاؤ تو ہم ہاں کریں۔“ اس کی ماں سمیت سب اس کی

رائے کے منتظر تھے رائے بھی کیا گویا ہاں سننے کے ہی منتظر تھے اس کا سر بھی خود بہ خود جھک گیا۔ نہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہ تھا اور ہاں کرنا گویا والدین کی پریشانیوں کو قدرے کم کرنا اس کی ہاں سننے ہی ماسوں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر چل دیئے۔ جب کہ اس کی ماں نے آسودگی سے اسے گلے لگا لیا مگر وہ رو بھی نہیں سکتی تھی۔ ان کی پریشانی وہ مجبوری کا طوق اسے مجبوراً اٹھانا ہی تھا۔

☆.....☆

نکاح کی نسبت درنجف ولیمہ ریسپشن میں زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ نوزخ حسن کھل کر گلہاں ہوا تھا۔ ضحاک علوی کمرے میں آنے کو بے تاب ہو رہا تھا تا کہ وہ اس کے حسن کو خراج پیش کر سکے پر اسے دوستیوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ نتیجتاً جب تک وہ گھر آیا تب تک گھر کے کونے کونے میں رات اتر چکی تھی۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ درنجف شاید اس کا انتظار کرتے کرتے نیند کی مہربان دیوی کی گود میں جا سوئی تھی۔ وہ بنا آہٹ کیے واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ چنچ کر کے بعد ضحاک خاموشی سے بیڈ پر آلیٹا جہاں درنجف اپنے ہوش رہا حسن کے ساتھ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اس وقت کسی معصوم سے بچے جیسی دھیمی دھیمی ہی مسکراہٹ تھی ہوئی تھی جب کہ کروٹ کے بل لیٹنے کی بنا پر اس کے بال چہرے و گردن کے اطراف بکھرے ہوئے تھے۔

اس نے آگے بڑھ کر درنجف کے گرد اپنی بانہوں کا دائرہ بنایا اور پیار سے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ درنجف ہلکا سا کسمپاسی تھی پر اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں کھولتی یا کچھ مزاحمت کرتی ضحاک کے لبوں نے ایک میٹھی سی شرارت کر دی درنجف نے یکدم اپنی آنکھیں کھولیں تو ضحاک کو اپنے قریب پایا۔ وہ فاصلہ بڑھاتے ہوئے پیچھے ہٹنے کو ہی تھی کہ ضحاک نے اسے خود سے اور قریب تر کرتے ہوئے اس کے ارادے پر پانی پھیر دیا۔ ”مجھے آج تک محبت نہیں ہوئی پر تمہیں دیکھ کر تمہیں پا کر مجھے عشق ہو چلا۔“ درنجف کو اپنے کانوں کے پاس خمار آلود دم سی سرگوشی سنائی دی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ دھڑکنوں کی دھک دھک اور وال کلاک کی ٹک ٹک کی تال پر ضحاک کے لب اس کے وجود پر داستان عشق کا رقص کرتے رہے اور دھیرے دھیرے رات بیت چلی۔

☆.....☆

اگلے دن ناشتے کے وقت ڈائننگ ٹیبل پر پیسی فیملی کا منظر نمایاں تھا۔ سب کچھ کتنا مکمل اور اچھا لگ رہا تھا۔ ساس کے رتبے پر فائز ہونے کے باوجود مزعقیت کو یوں لگ رہا تھا گویا وہ اب ماں بنی ہوں۔ درنجف کے چہرے پر پھیلی شرمیلیں مسکان، ضحاک کی آنکھوں سے جھلکتی محبت کی چمک ان کا سیرول خون بڑھا رہی تھی۔ وہ بھی نہ روایتی سی بہو رہی تھیں اور نہ ہی اب روایتی ساس بننا چاہتی تھیں۔ بلکہ وہ پرامید تھیں کہ ان کی بہو بھی روایتی بہوؤں جیسی نہ ہوگی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد مزعقیت کے نہ نہ کرنے کے باوجود درنجف اپنی ساس اور نند کی مدد کرنے کے لیے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی۔

”بیٹا! یہ سب کام تم نے ہی کرنے ہیں، پر ابھی نہیں ابھی تو تمہارے ہاتھوں کی نہ مہندی چھوٹی ہے نہ دلہنا کے دن۔“ مزعقیت نے پیار سے اپنی بہو کو کاموں سے روکتے ہوئے کہا۔

”آئی جی! بعد میں بھی تو یہ سب کام کرنے ہی ہیں۔ پھر ابھی کیوں نہیں؟“ درنجف کی بات کے جواب میں

رواڈ انجسٹ [19] فروری 2016ء

READING
Section

وہ کیا کہتیں وہ تو بس اس کے لیوں سے ادا ہونے لفظ آئی میں ہی الجھ کر رہ گئی تھیں۔ شاید نئی جگہ نیا رشتہ نئے لوگ ہیں ایڈ جسٹ ہونے میں رفتہ رفتہ قائم لگے گا اسے اگلے پل مسز عقیدت کے اندر موجود متانے اس الجھن کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! تم ان سب کاموں کو چھوڑ دو اور اپنے گھر..... مطلب میکے جانے کی تیاری کرو۔“
 ”گھر تین حروف سے مل کر بنا یہ لفظ یہ محفوظ ٹھکانہ ہی اگر اجنبی ہو تو پھر پناہ گاہ ہی اگر قید گاہ بن جائے تو..... جہاں کے درو دیوار پاہر سے آتے گرم پھیڑوں اور منہ زور آندھیوں کو روکنے کے بجائے ڈھسے گئے ہوں وہ گھر بھلا کیسا گھر ہوگا؟ ایسے گھر کی پناہ گاہ بھی کیسی پناہ گاہ؟ جو پناہ گاہ کے بجائے سزا گاہ بن جائے۔“
 ”ارے بیٹا! تم اب تک یہیں کھڑی ہو، جاؤ تیار ہو جاؤ۔ ضحاک تمہیں میکے چھوڑ آئے گا۔“ درنجف کو سوچوں میں گم کچن کے دروازے پر ایسا وہ دیکھ مسز عقیدت نے کہا۔

”وہ دراصل آئی میں سوچ رہی تھی کہ میکے پھر آرام سے چلی جاؤں گی تاکہ کچھ دن رک بھی سکوں اور پھر کچھ دنوں بعد صبا عنہ آئی بھی تو واپس جانے والی ہیں پھر کہاں مجھے ان کے ساتھ وقت پینانے کو ملے گا۔“ بہو کی بات پر مسز عقیدت کو حیرانی کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ کچھ کہتیں اس سے پہلے ان کی باتیں سنتی صبا عنہ جھٹ سے آگے بڑھ کر بھابی کے گلے لگی۔
 ”آئی ایم سوپہی۔ دیکھئے می پاپا بھابی نے میری وجہ سے فی الحال میکے جانے سے انکار کر دیا۔“ صبا عنہ نے لاؤنج میں بیٹھے اپنے پاپا کو بھی پر جوش لہجے میں مخاطب کیا۔ جن کے پاس بیٹھا ضحاک بھی سن کر مسکرا دیا۔
 جب کہ مسز عقیدت بھی چھٹکی سی ہنسی ہنس دیں کیوں کہ درنجف کی بات نے انہیں ان دیکھے اندیشوں میں گھیر لیا تھا۔ پر مسز عقیدت کی سوئی ہوئی الجھن اس وقت جاگ اٹھی جب درنجف نے نہ صرف اپنے میکے والوں کو بھی کال کر کے اپنے نہ آنے کی وہی وجہ بتائی بلکہ اسی موقف پر ڈنٹے ہوئے وہ اگلے تین چار روز تک بھی میکے نہ گئی۔



بالآخر پھر فیصلہ ہو گیا۔ روشن آرا بیگم کے سارے وہم اور سو سے سہلی بھابی کی سونے جیسی چمکیلی باتوں تلے دب گئے۔ انہوں نے سوچا شادی تو کرنی ہے پھر یہاں کیوں نہیں؟ جب کہ لڑکا بھی پڑھا لکھا نہیں تو کیا ہوا کماؤ تو ہے ہی۔ ویسے بھی اس دور میں پڑھائی نہیں کمانی دیکھی جاتی تھی۔ شروعات میں تو ناز و کا خیال تھا کہ یوں بات بننا ممکن ہی نہ ہو کیونکہ ان کی واپسی میں اب صرف ڈیڑھ ماہ ہی تو بچے تھے۔ اتنے کم وقت میں شادی کیسے ممکن تھی جب کہ اس کے ابو اور بہنیں بھی یہاں موجود نہ تھیں مگر سب باتیں دھری کی دھری رہ گئیں اور اس کی قسمت کا فیصلہ طے ہو گیا۔ سہلی بھابی کا بتایا ہوا رشتہ ناز و کے لیے قبول کر لیا گیا۔ وقت کی کمی کے باعث بس صرف نکاح کی ہی تقریب رکھی گئی تھی۔ ابھی ابھی نکاح کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ لاؤنج میں مٹھائی کا ٹوکرا دھرا تھا جو سہلی بھابی لائیں تھیں۔ اس نے سر گھما کر اپنی ماں کی جانب دیکھا جو بڑے گمن سے انداز میں ٹوکرے میں سے مٹھائی نکال رہی تھیں۔ ناز و تکی دیر تک اپنی ماں کے منہ تک چہرے کو تکی رہی۔

شادی کے بعد سب لڑکیوں کو اپنا گھر ماں باپ کا ساتھ چھوڑنا پڑتا ہی ہے مگر یہاں اتنی دور پردیس میں رہنا یہ ہی باتیں اس کے اندر توڑ پھوڑ کر رہی تھیں۔ اب بھی اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ ہر لڑکی کی طرح اس کے بھی بے شمار خواب تھے۔ بہت ارمان تھے اس کے ہاتھوں پر مہندی ہو۔ شگن کا پیلا جوڑا پہننے، چمڑی اوڑھنے وہ بھی سکھیوں کے سنگ بیٹھی ہو۔ پر یہاں نہ سکھیوں کے گیت ہونے تھے۔ نہ بہنوں کے سنگ ڈھولکی، یہاں تو

خاموشی تھی۔ اس کے خواب ادھورے سے رہ گئے کتنا بے رحم فیصلہ تھا تقدیر کا۔

باہر تو ہر اک سمیت تھا ہنگامہ محشر

سنانے کا پہرہ تو فقط دل پر لگا تھا

☆.....☆

آج کل دعوتوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ آج بھی ضحاک کے ایک دوست کے ہاں دعوت تھی جہاں سے کچھ دیر پہلے ہی ان دونوں کی واپسی ہوئی تھی۔

صبا عنہ کچن سمیٹ رہی تھی جب کہ ضحاک، صبا عنہ کی بیٹی عیہا کے ساتھ کھینے میں لگن تھا اور مغیث علوی صاحب نیوز دیکھنے میں مصروف تھے۔ بھی مسز عقیدت نے دھیرے سے درجنف کو پکارا۔

”بیٹا! ذرا میرے ساتھ آنا۔“ مسز عقیدت کہہ کر اپنے روم کی جانب چل دیں تو وہ بھی ان کے پیچھے روم میں داخل ہوئی۔

”جی می! آپ نے بلایا۔ کچھ کام تھا؟“ مسز عقیدت کے ہی کہنے پر وہ انہیں می کہنے لگی تھی۔

”بیٹا! کچھ کام نہیں بلکہ ضروری بات کرنی تھی۔ آؤ یہاں بیٹھو۔“ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے درجنف کو بھی

اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ وہ وہیں ان کے پاس ٹک سی گئی۔

”بیٹا! جب سے تم اس گھر میں آئی ہو اس دن سے تمہیں بہو نہیں بیٹی ہی مانا ہے۔ شادی کر کے رخصت ہو کر

جب ایک بیٹی اپنے سرال اپنے نئے گھر آتی ہے تو پرانے گھر سے اس کے تعلقات ٹوٹتے نہیں بلکہ بیٹی یادوں

کے سہارے اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ پر تم واقعی الٹی الٹی ہو جسے اپنے میکے جانے کی طلب نہیں۔ میں نہیں جانتی

اس کے پیچھے کوئی وجہ ہے یا یہ سب میرا وہم، پر اصل بات تو یہ ہے کہ کیا واقعی تمہیں اپنا گھر یاد نہیں آتا، اپنا میکہ؟“

مسز عقیدت کی باتیں سن کر ایک لمحے کو تو درجنف کے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا تھا مگر اسے گلے ہی پل اس نے خود

کو سننا لایا تھا۔

”می! ایسی کوئی بات نہیں۔ یادیں تو ہمیشہ ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ پر آپ تو جانتی ہی ہیں کہ صبا عنہ آپ نے کچھ

ہی ٹائم بعد چلے جانا ہے پھر کہاں روز روز ان کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع مل پائے گا میکہ تو یہیں ہی ہے ابھی

نہیں تو بعد میں سہی اور آج کل دعوتوں کی وجہ سے بھی فراغت نہیں مل پارہی۔ بعد میں آرام سے چلی جاؤں

گی۔“ درجنف نے نسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”بیٹا! تم چاہے سب کو سلی دو پر نہ جانے کیوں میں مطمئن نہیں کیونکہ میں بھی ایک ماں ہوں۔ بیٹا ہر بات

اپنی جگہ مگر ایک بات ایک سچ جو بھی نہیں بدلتا وہ ماں بیٹی کا پیار ہے۔ ایک ماں کا دل اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے

ہمہ وقت تڑپتا اور بے چین رہتا ہے۔“ ان کے لہجے میں ممتا بول رہی تھی۔

”چلو بیٹا! جاؤ اب تم آرام کرو، ہاں مگر کل تم اپنے گھر جا رہی ہو۔“

”می! یہ گھر بھی تو میرا ہی ہے جب وہ گھر چھوڑا مطلب رخصت ہو رہی تھی تبھی ملے کیا تھا اب اصلی گھر تو یہاں

کا ہی گھر ہے۔“ درجنف نے نظریں جھکائے دھیرے سے کہا۔

”نہیں بیٹا! سرال چاہے کیسا بھی ہو بھلے کتنا ہی پیار مل جائے اور اپنا پن بھی پر سرال کا نام سرال ہی

رہتا ہے۔ بس تو اب کل تم میکے جا رہی ہو۔ خوشی خوشی جاؤ وہاں مگر سب کو انتظار ہو گا تمہارا اور اگر رکنے کا دل ہو تو

ایک دو دن رک بھی جانا۔“ بہو کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے تاکید کی تو درجنف ہولے سے اپنا

دہلی سے اس کے ابو کا تار آ گیا جس میں واضح لفظوں میں سارے اختیارات روشن آراء بیگم کو سونپ دیئے تھے، ویسے بھی ان کے سر پر دادر جوان بیٹیوں کا بار تھا۔ اس لیے انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ”آج کل اچھے رشتے آسانی سے ملتے نہیں۔ اللہ نے نیک سبب بنا دیا آگے بھی وہ بہتر کرے گا، میں نے اللہ پر توکل کر لیا ہے۔ آج نہیں توکل شادی تو کرنی ہی تھی اب رشتہ اچھا ہے تو انکار کی گنجائش نہیں۔ میں تو شامل نہ ہو سکوں گا مگر تم ماں ہو وہاں موجود ہو پھر تمہارے میکے والے بھی ہیں اچھے سے دیکھ بھال کر بسم اللہ کر دو۔“ تار کے ساتھ بیجے گئے پیسوں سے ناز و کاہنیز تیار ہونے لگا۔ دوسری جانب اس کی خالہ و ممانیوں نے بھی مل ملا کر اچھا خاصا جہیز اتنے کم میں بھی جمع کر لیا۔ قسمت کیا ہے؟ آج محض وقت کے پلٹنے نے اسے قسمت کی حقیقت بتا دی تھی۔ آنکھوں نے ساون کی جھڑی سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر کئی بار رو چکی تھی۔ پھر ایک ایک کر کے دن بیتتے چلے گئے اور ایک عجب و انوکھا دن آچلا۔ اس دنیا کا کارخانہ بھی عجب تر ہے تدبیر کچھ ہوتی ہے اور تقدیر کچھ ہوتی ہے۔ یوں ایک دوسرے کی ضد اور ٹکراؤ سے دنیا میں عجیب تماثے رونما ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ یہاں بھی ہو رہا تھا۔ ایک انوکھی شادی ہونے چلی تھی جس میں نہ باپ کا دعائیہ ہاتھ سر پر تھا، نہ بہنوں کی چھیڑ خانیاں اور نہ ہی اپنے گھر کی چوکھٹ تھی۔ ایک ایسا رشتہ بننے چلا تھا جس میں دو الگ الگ ذات اور ملک سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک بندھن میں بندھنے چلے تھے۔ یونہی اگست 1988ء میں وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی۔ وہ ناز و جو نیا شہر نیا ملک گھومنے آئی تھی اپنے رشتے داروں سے ملنے اور ساتھ ہی اپنی بیمار تانی کا آخری دیدار کرنے آئی تھی۔ اسے قسمت نے یہیں کا باپ بنا دیا اور واپسی کے در بند کر دیئے۔ وہ حیران تھی۔ اگر سفر میں آپ کے ہمراہ موجود مسافر آپ سے متضاد طبیعت کا مالک ہو تو سفر سمیت اسے برداشت کرنا مشکل سا ہو جاتا ہے۔ پر زندگی کا ہمسفر ہی ان دیکھا اجنبی بن جائے تو اس کے ساتھ زندگی کا سفر طویل تر و مشکل ترین بن جاتا ہے۔

اس کی شادی جو مکمل بار بیچ تھی جس میں اب تک نہ دولہا نے دلہن کو دیکھا تھا نہ دلہن نے دولہا کو پر قسمت نے انہیں ایک راہ کا ہمسفر بنا دیا۔ برأت میر پور خاص سے آئی تھی جس میں دولہا کے کچھ دوست اور سہیلی بھابی کا پورا سسرال شامل تھا اور پھر وہ رخصت ہو کر میر پور خاص کے لیے روانہ ہوئی مگر سوائے قسمت بارات کراچی سے نکلی ہی تھی کہ وہ چھپا جوں چھانچ مینہ برساکہ بارات کی کوچ جب میر پور خاص میں رکی تو یہاں گوڈوں تک پانی کی نہریں بہ رہی تھیں۔ شاید اس دن آسمان کا سینہ بھی بوجھل ہو کر چھٹک پڑا تھا۔ اس بہتی ندی کو عبور کر کے ناز و کو وقتی طور سہیلی بھابی کے سسرال میں ہی پہنچایا گیا۔ وہیں اس کے جہیز کا سامان بھی رکھا گیا تھا اور پھر اس نے اپنے شوہر کو دیکھا جسے آنا فانا اس کی زندگی میں شامل کیا جا چکا تھا۔ شکل و صورت تو واقعی ٹھیک ٹھاک تھی۔ البتہ عمر کے لحاظ سے وہ دو سال چھوٹا تھا۔ اتنی جلدی کوئی رائے قائم کرنا ممکن نہ تھا ویسے بھی سب اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ اس نے تو اب سب کچھ وقت کے حوالے کر دیا۔ اگلے دو تین دنوں تک وقفے وقفے سے بارش برتی رہی جس کے سبب وہ اپنے گھر نہ جاسکی۔ وہ ہی گھر جواب اس کا ٹھکانا اور نیا آشیانہ تھا۔ اس لیے وہ فی الحال سہیلی بھابی کے سسرال میں ہی موجود تھی۔ اس کی شادی کے چوتھے دن کی بات تھی جب اچانک اس کے میکے والے چلے آئے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

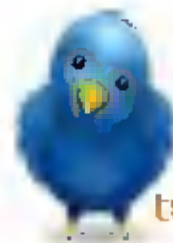
WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

وہ سب سے مل کر خوش بھی ہوئی اور حیران بھی۔

”کل تمہارا دلیرمہ ہے نا، اس لیے ہم سب کچھ دیر میں گاؤں کے لیے نکلیں گے۔“ سلٹی بھابی نے ناز و کو حیران دیکھ کر اس کی لاعلمی دور کرنا چاہی۔

”گاؤں، دلیرمہ.....“ ناز و اب بھی نا سمجھی سے سب کو دیکھے جا رہی تھی۔ تبھی اس کی ممانی نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

”تمہارا دلیرمہ گاؤں میں رکھا گیا ہے تمہارے شوہر کے آبائی گاؤں میں، وہاں اس کے رشتے دار بھی ہیں، چلو اب تم بھی تیار ہو جاؤ ہمیں کچھ دیر میں گاؤں کے لیے نکلتا ہے۔“ وہ ان سب کے کہنے اور ٹوکنے پر تیار ہونے کمرے میں تو چلی آئی مگر اس کا ذہن اب بھی گاؤں رشتے دار، ان ہی الفاظوں میں الجھا ہوا تھا۔

☆.....☆

وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو گھر میں ایک بالچل سی مچ گئی چہرے پر مسکراہٹوں کا ہالہ بنائے وہ ایک قسمت والی بیٹی کی طرح گھر یعنی اپنے میکے آئی تھی۔ وہ گھر جواب اس کا نہ تھا۔ اس کی شادی کے بعد جو پرایا ہو چکا تھا یوں تو ہٹا نہیں کب سے وہ خود کو ہی پرایا کر چکی تھی اور اب تو دنیا کی نظر میں بھی یہ گھر اس کے لیے پرایا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ باتوں میں مگن تھی بھی ڈور بتل بھی۔ دروازے پر اس کے ابو تھے جن کی نماز ظہر سے واپسی ہوئی تھی۔

”ارے میری بیٹی آئی ہے۔“ ابو کی پر جوش سی آواز سنائی دی وہ آگے بڑھ کر باپ کے گلے لگ گئی۔ ماں باپ کا بس انمول ہی ہوتا ہے۔

”پرانی ہی ہو گئی ہے۔“ وہ اسے گلے لگائے پیار سے بولے تو دو آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

”ہنٹا تم خوش ہونا؟ سب ٹھیک ہے نا؟“ ابو کی آواز میں فکر تھی۔ اس نے نظریں اٹھا میں اس کے ابو کی پیشانی پر وہ ہم فکر، پریشانی کی لکیریں نمایاں تھیں۔ ایسی لکیریں جو ہر ماں باپ کے چہرے پر نمودار ہوتی ہیں جب وہ اپنی بیٹی بیاتے ہیں پھر جب پہلی بار بیٹی گھر آتی ہے تو یہ لکیریں پیشانی پر سج سی جاتی ہیں اور جب تک بیٹی کی مسکراہٹ اور اس کی آواز آنکھوں سے جھلکتی خوشی نہ دیکھ لی جائے یہ لکیریں مٹتی نہیں۔

”جی ابو! بہت خوش ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا مگر یہ مختصر جواب بھی گویا امرت کی طرح کام کر گیا۔ ایک لمحہ ہی لگا تھا اس کے ابو کے چہرے سے وہم و فکر دوسو سے کو دور ہونے میں۔ اب اس کی جگہ آسودگی و اطمینان بھری مسکراہٹ بھی تھی۔ وہ بھی ہولے سے مسکرا دی۔ کھانے پر زیادہ اہتمام تو نہ تھا۔ ہاں مگر ان سب نے اسے خاصا پروٹوکول دیا تھا۔ جیسے وہ کوئی مہمان ہو۔ مہمان کیسا لفظ تھا یہ بھی اتنے سال جس گھر میں رہی اب کچھ ہی دنوں میں وہ مہمان ہو چکی تھی۔ یہ رشتے بھی کتنے عجیب سے ہوتے ہیں پل میں جڑتے ہیں تو پل میں ٹوٹتے ہیں۔

”جس کلی کو پیار سے سینتے آئے

وہی پھول بن کر کسی اور کے باغ کی رونق بن چلی

اگلے دن بہت ساری دعاؤں و ہدایتوں اور نصیحتوں کے ہمراہ ایک بار پھر وہ میکے کی دلہیز چھوڑ چکی تھی۔

☆.....☆

مسز عقیدت اور معیث علوی صاحب کی جنت ایک بیٹی اور بیٹے پر مشتمل تھی۔ سب سے بڑی صبا عنہ تھی۔

ریڈا انجسٹ 23 فروری 2016ء

READING
Section

گر بچپن کے بعد ہی اس کی شادی کر دی گئی۔ وہ آسٹریلیا میں رہائش پذیر تھی۔ کیونکہ اس کے شوہر کی جاب وہیں پر تھی۔ اس کی ڈھائی سالہ ایک بیٹی بھی تھی۔ اس کے بعد ضحاک علوی تھا جس نے مارکیٹنگ میں ایم بی اے کیا ہوا تھا اور ایک سپورٹس آٹوموبائل پارلس کا بزنس کرتا تھا جس کے سلسلے میں وہ اکثر آؤٹ آف کنٹری بھی جاتا رہتا۔ علوی فیملی پوش علاقے میں ایک لگژری اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ یہ اپارٹمنٹ چار کمروں اور ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ جسے مسز عقیدت نے بہت خوب صورتی و سمجھداری سے سجایا تھا۔ معیث علوی صاحب بھی ایک ملٹی ٹیکسٹائل کمپنی میں سپروائزر کی جاب کرتے تھے۔ علوی فیملی کے ہاں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ضحاک اور ورنجف کی شادی کو ایک ہفتہ بیت چلا تھا۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی اب ختم چکا تھا۔ بھی ضحاک نے نہ ہی مون پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا پر اس سے پہلے صبا عنہ آسٹریلیا کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ اس کے چلے جانے سے علوی فیملی تو اداس تھی ہی پر ورنجف کو بھیہا گی کی بہت محسوس ہو رہی تھی؟ کیونکہ بہت کم عرصے میں ہی وہ اس کے قریب آ چکی تھی جب کہ صبا عنہ کی شکل میں اسے ایک اچھی دوست ملی تھی۔ ضحاک اور ورنجف بھی تاورن ایریہ ہی مون کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

اس کی الجھن گاؤں جا کر ہی دور ہوئی تھی۔ گاؤں واقعی گاؤں ہی نکلا۔ یہ گاؤں میاری کے قریب تھا۔ مٹی کا اٹھتا طوفان، مویشیوں کی بھر مال، کچے کچے سے مکان، گھاس پھوس کا ڈھیر، اولے تھاپی ہوئی دیواریں، بھینسوں کی بھان بھان اور بکریوں کی میں میں..... وہ حیران نظروں سے آس پاس کے ماحول عجیب سی بونی اور بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب کہ اس کے سیکے کے نام پر ساتھ آئیں اس کی خالہ ان کے بچے ممانیاں اور ان کے بچے یہ سب لوگ تو گاؤں کو دیکھ کر اور یہاں آ کر یوں خوش ہو رہے تھے جیسے کوئی الگ ہی جہاں نظر کے سامنے ہو۔ لڑکے ہالے کھیٹوں پر ٹیوب ویل، فصلوں اور نہروں کو دیکھ کر تو لڑکیاں بکری کے چھوٹے چھوٹے میخنے، چوزوں، کچے گھروں اور بانی کے تنگے (ہینڈ پمپ) کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ جب کہ وہ اس انجانے سے ماحول میں اکیلی سی پڑ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں گاؤں کے کافی لوگ اکٹھے ہو گئے اور تعارف کا تبادلہ ہونا شروع ہوا جو سلیٹی بھابی نے ہی کروانا شروع کیا۔

”نازو! یہ تمہاری ساس ہیں یہ سسر.....“ ایک ضعیف جوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا گیا۔
 ”یہ تینوں تمہاری مندریں ہیں۔“ بالوں میں پراندے لگائے بغل میں بچے و بوائے وہ تینوں تقریباً ایک جیسی ہی لگیں۔

”اور یہ کونے والی چار پائی پر جو بیٹھے ہیں۔ یہ چاروں تمہارے دیور ہیں۔“ اس نے باری باری چاروں کی جانب دیکھا۔ کندھوں پر رومال رکھے۔ بڑھی ہوئی مونچھیں لیے ان سب کی عمروں میں زیادہ سے زیادہ دو تین سالوں کا ہی فرق تھا۔ وہ حیران و پریشان نظروں سے سب کو تنگے جا رہی تھی۔ اگلے لمحے سلیٹی بھابی کی جب زبان حرکت میں آ چکی تھی۔

”بھئی! لڑکا اکلوتا ہی کہلائے گا یا کیونکہ تن تمہا ہی رہتا تو شہر میں ہی ہے۔ یہاں نہ آتا ہے اور نہ ہی رہتا ہے۔“ اپنی طرف سے گویا انہوں نے تسلی کروائی، برابر ہو بھی کیا سکتا تھا۔ میکے والے نے بھی خاموش ہی تھے کیونکہ شادی تو ہو چکی تھی۔ اب وقت واپس تو آ ہی نہیں سکتا کہ مصداق وہ سب سمجھوتا کرنے لگے۔ نہ جانے کون سی زبان تھی جس میں اسے دعائیں دی جاتی رہیں اور نہ جانے کیا کیا بولا جا رہا تھا، وہ اس زبان سے انجانا ہی۔ بس

صدے سے چپ چاپ وہ نکر نکر سب کو دیکھے جا رہی تھی اور پھر ویسے کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے سرال والوں نے مہمان نوازی کی انتہا کر دی۔ سب کو چار پائیوں پر ہی کھانا دیا گیا۔ فرش تو تھا ہی نہیں بس نیچے دھول سے انی زمین ہی تھی۔ اس لیے اٹھنا بیٹھنا کھانا سونا سب چار پائیوں پر ہی ہوتا۔ پر چار پائی پر ایک ایک بندہ کسی جن کی مانند ہاتھ باندھے یوں کھڑا ہوتا۔ گویا مانگی جانے والی چیز وہ پلک جھپکے مہمانوں کو حاضر کر دے یہاں تک کہ ان سب کو کھانا کھلانے کے بعد ہاتھ بھی چار پائی پر بیٹھے بیٹھے ہی دھلائے گئے نازو کے میکے والے اس کے سرال والوں سے کافی مرعوب ہو چکے تھے۔ وہ دو دن وہاں رہے اور ان دو دنوں میں اس کی سرال والوں نے سب کے دلوں میں اتنا اچھا تاثر چھوڑا کہ نازو کے میکے والے نازو کی قسمت کو سراہنے لگے۔ دو دن بعد اس کے میکے والے تو سکلی بھابی کے ساتھ واپس چلے گئے جب کہ وہ کچھ دن اور ٹھہری اور ان دنوں میں اسے بھی کافی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ البتہ وہ ان کی نئی نوپلی زبان سے انجان ہی ان کی باتوں کا ترجمہ اس کا شوہر کر کے اسے سمجھاتا۔ جب تک ان کی واپسی پھر سے میر پور خاص ہوئی تب تک اس کی ای (روشن آرائیگم) کے وہلی جانے کا دن بھی آ گیا اور یوں وہ بہت سی ہدایتیں، نصیحتیں اور دعائیں دے کر نم آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سوچا اب اس کی زندگی کی نئی شروعات ہو چکی ہے مگر وہ انجان تھی زندگی دور کھڑی اس پر ہنس رہی تھی اور آنے والے طوفان کی اطلاع دے رہی تھی۔ جس سے وہ بے خبر اب اپنے نئے آشیانے کو بسانے کے بارے میں سوچنے میں لگن گئی۔



ٹھنڈی ہوائیں، اونچے نیچے سر سبز راستے، پر سکون ماحول، ٹھنڈے ٹھار پانی کے اڑتے چھینٹے، شفاف پانی کا پھروں سے ٹکرانے سے پیدا ہونے والا شور، سر کے اوپر تیرتے روئی کے گانے، ارد گرد کھری روئی کی سفید چاند اور ساتھ میں نرم مزاج اور خیال رکھنے والے شریک سفر کا ہاتھ۔ ان کا ہنی مون حقیقتاً شہد کی طرح بیٹھا اور چاروں کی ٹھنڈی مسرور کر دینے والی روشنی کی طرح روح کو اندر تک سرشار کر دینے کی حد تک خوب صورت تھا۔ سارا دن قدرت کے حسین نظاروں سے آنکھوں کو سیراب کرنا اور رات اپنے ہمسفر کی مضبوط بانہوں کے حصار میں گزارنا، بہت خوشگوار اور مسک سا لگتا۔ ایسے حسین ماحول میں سب کچھ پرفیکٹ تھا اگر کچھ مس فٹ تھا تو درجف کی آنکھیں ہاں! وہی آنکھیں جن میں ضحاک کو اپنے لیے محبت پسندیدگی اعتبار اور چاہت کے رنگ دیکھنے چاہیے تھے ان آنکھوں سے ایک اداسی، گہری جامدی خاموشی بنا چاند جیسی اندھیری رات اور بے چینی چھلکتی تھی۔ ضحاک نے بارہا اس سے وجہ جانی چاہی اپنے پیار و چاہت کے بادلوں کی برسات کر دی پر درجف کے ہونٹوں کا قفل نہ کھلا۔ وقت تیزی سے بیت چلا اور پھر ان لوگوں کی بھی واپسی کا دن آ گیا۔ آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ درجف علوی فیملی کا حصہ بن گئی۔ وقت کا پہیہ چلنا گیا۔ وہ خاص سے عام ہو گئی۔ معیث علوی صبح کے گئے شام کو آتے جب کہ ضحاک کی واپسی اکثر رات تک ہوتی۔ اپارٹمنٹ میں سارا دن ساس بہو ہوتیں اور ان کی ملازمہ جوہن کے تمام کاموں کو چھوڑتی کاموں کے لیے ہوتی۔ درجف نے گھر کی تمام ذمہ داری اٹھالی تھی۔ مسز عقیدت یوں تو خوش تھیں مگر پھر بھی کہیں کچھ بے سکونی تھی۔



میر پور خاص کے سب سے ویران علاقے میں موجود بیری کے درختوں اور خاردار جھاڑیوں کے بیچوں بیچ جارحی دیواروں پر مشتمل ایک کمرے کا یہ مکان نازو کو گاؤں کے کچے گھروں کی یاد دلا گیا۔ یہ ایک ایسا مکان

تھا۔ جس کا فرش تک موجود نہ تھا یا یوں کہا جائے کہ مٹی سے اٹی زمین کو ہی بس فرش بنا دیا گیا تھا۔ ایک کمرے اور چھوٹے سے باتھ روم اور کھلے صحن پر مشتمل یہ مکان باہر سے دیکھنے والے کو بالکل اجازت اور ویران سا لگتا جس کی دیواروں پر رنگ و روغن تو دیر پلستر تک نہ تھا۔ باقاعدہ گنا جاسکتا تھا کہ دیوار بنانے میں کتنی اینٹیں صرف ہوئی ہیں۔ چھت البتہ اتنی پکی ضرور تھی کہ سوائے بارش کے پانی کے اور کچھ اوپر سے نہ گرتا، کھلے صحن میں نلکا موجود تھا۔ یعنی استعمال کے لیے سارا پانی نلکے سے ہی حاصل ہوتا۔ باورچی خانہ سرے سے ہی غائب تھا۔ البتہ کھلے صحن میں بکھرے بیرمی کے تے اور مٹی کا فرش تھا وہیں ایک جانب مٹی سے بنا چولہا اوپن پن کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ایسے اجاڑے مکان نامی گھر میں تن تہا رہنا جہاں کیس مٹی نا بجلی، نا ہی ضروریات زندگی کا مکمل سامان ایسے مکان کو گھر بنانا اور یہاں رہنے کا تصور ہی سوہان روح سا تھا۔ یہ تھا ناز و کانیا گھر۔ اس کے جہیز کا سارا سامان اب تک سلمی بھابی کے سرال میں ہی رکھا گیا تھا۔ ویسے بھی اس گھر میں ایسی جگہ ہی کہاں تھی جو اس کا جہیز یہاں رکھا جاتا۔ اس کے کپڑوں کا صندوق تک وہیں رکھا تھا۔ تو یہ بھی وہ مگرمی جہاں ناز و کو اپنی دنیا بسائی تھی۔ اپنے بہن بھائیوں ماں باپ سکھی سہیلیوں اپنے دیس سے دور۔ وہ کوئی محلوں کی رہنے والی نہ تھی مگر وہ ایسے کچے گھروں کی بھی مکین نہ تھی۔ پر قسمت!!

ہاں! یہ قسمت ہی کا تو کھیل ہے جس پر کسی کا نا بس چلتا ہے نا اختیار، نا کوئی داؤ نا کوئی بیج۔ یہ وہ واحد کھیل ہے جس میں ہوتی ہار یا جیت کو نہ وہ بدل سکتا ہے اور نہ ہی روک سکتا ہے۔

☆.....☆

وہ نا کچھ اسٹینڈر میں تھی اور کل ان کا پہلا پریکٹیکل ہونا تھا۔ وہ بہت زیادہ ایکساٹینڈ تھی اور کیوں نہ ہوتی آخر کو وہ ذہین بچی تھی۔

”امی اکل ہزار پریکٹیکل ہے اور ہمیں یونیفارم نہیں گھر کے عام سے کپڑے ہی پہن کر جانا ہے۔“ اس نے اپنی امی کو پر جوش لہجے میں بتایا۔

”کل اتوار ہے اور اتوار کو کون سا اسکول کھلتا ہے بھلا؟“ سب چونچلے ہیں اور کچھ نہیں۔“ کھانا بناتی نزہت بیگم نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں امی! اتوار ہے بھی پرنسپل نے ہماری کلاس کو کل بلایا ہے تاکہ سکون و آرام سے وہ پریکٹیکل کروا سکیں۔“ اس نے اپنی ماں کو کل اسکول جانے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ اب کل کون سے کپڑے پہن کر جاؤں؟ وہ خود سے مخاطب ہوئی اپنی اور اپنی بہن کی مشترکہ الماری کی جانب بڑھی۔ جہاں ان کے کپڑے موجود تھے۔ فیشن ایبل،

نت نئے اسٹائلش سے نہیں بلکہ ڈھیلے ڈھالے گاؤں ٹائپ جن میں سے زیادہ تر اس کی امی نے ہی سئے تھے بلکہ

سینک کے تھے یہ کہنا بجا ہوگا کیونکہ وہ کپڑے اس کی امی ہی کے تھے جن کو کانٹ چھانٹ کے اس کے ٹاپ کا بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ صرف کوشش۔ وہ اداس اور پریشان ہی اپنے کپڑوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ آج سے پہلے

اسے کبھی ان کپڑوں سے اعتراض نہ ہوا تھا۔ پر کل مسئلہ کچھ اور تھا۔ 34، 35 اسٹوڈنٹس جن میں زیادہ تر یووائے بھی تھے اور پرنسپل و پریکٹیکل سر کی موجودگی میں یہ اول جھول سا حلیہ۔ ”اف! کیا کروں؟“ وہ حینتاً پیشان تھی۔

”الماری گھول کر کیا ڈھونڈ رہی ہے؟“ بھی پیچھے سے اس کی امی کی پاٹ دار آواز آئی۔

”وہ امی! کل کے لیے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا کیا پہنوں کوئی بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں۔“ وہ رو بانسی ہو گئی۔

”کچھ بھی سننے کی ضرورت نہیں، کل تم کہیں نہیں جا رہی ہو، پڑھائی کرنے بیٹھتے ہیں جو چھ دن ہو جاتی ہے۔ اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں یہ اسکول والے تو بہانے بہانے سے بس پیسے اٹھانے کے چکروں میں رہتے ہیں۔“

”پرائی کل پریکٹیکل ہے جانا ضروری ہے ورنہ میں پریکٹیکل لکھوں گی کیسے؟“ وہ اب رو دینے کو تھی۔

”کسی دوست وغیرہ سے لے کر لکھ لینا، بس کہہ دیا جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ اپنا فیصلہ بنا کر چل دیں تو نہ جانے کب سے ر کے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے، پر وہ بھی ان کی ہی بیٹی تھی۔ رات تک ابو کو پریکٹیکل کی اہمیت و ضرورت سمجھا کر وہ راضی کر چکی تھی۔ اسے پریکٹیکل میں جانے کی پرمیشن تو ملی پر اسکول یونیفارم میں ہی۔ اگلے دن وہ اسکول اور اپنی کلاس کی واحد اسٹوڈنٹ تھی جو اسکول کے آف ہونے کے باوجود اسکول یونیفارم میں تھی۔ بہت سے اسٹوڈنٹ نے مذاق بھی اڑایا تو کسی نے کئی سوال بھی کیے پر وہ خاموش رہی اور یہیں سے اس کی زندگی کی نئی شروعات ہوئی۔



وہ ایک عام سا ہی دن تھا۔ گھر کے مرد اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔ درنجف نے مشین لگائی ہوئی تھی۔ جب کہ سز عقیدت لاؤنج میں بیٹھیں ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ سبزی کاٹ رہی تھیں۔ تبھی وہیں پاس رکھے ٹیلی فون سیٹ کی بیل نے ماحول میں ارتکاز سا پیدا کیا۔ سز عقیدت نے ریسیور اٹھایا تو معلوم پڑا فون درنجف کے لیے تھا، دوسری جانب اس کی کوئی اسکول فرینڈ تھی جو اس سے بات کرنے کی خواہش مند تھی۔ سز عقیدت نے اسے ہولڈ کر دیا اور درنجف کو پکارا، کیلے ہاتھوں کو پونجی ہوئی درنجف لاؤنج میں چلی آئی۔

”جی می! آپ نے بلایا؟“

”ہاں بیٹا! یہ تمہاری کسی اسکول فرینڈ کی کال آئی ہے بات کر لو اس سے۔“ سز عقیدت نے اسے بلانے کی وجہ بتائی پر اگلے ہی لمحے وہ چٹکنیں تھیں کیونکہ درنجف کا چہرہ یکدم پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ اس پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

”مئی! کہہ دیجیے میں گھر پر نہیں ہوں۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں جب کہ حیران حیران سی سز عقیدت جاتی ہوئی درنجف کو دیکھتیں رہیں۔

”اس لڑکی کی حرکتیں میری سمجھ سے باہر ہیں پل میں تولہ پل میں ماشہ مجھے ضحاک سے بات کرنی ہی ہوگی۔“ ریسیور کو پھر سے کریڈل پر رکھتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا۔ شام کو براہِ والے اپارٹمنٹ میں سے قرآن خوانی کا بلاوا آنے پر سز عقیدت نے درنجف کو بھیج دیا اور خود رات کے ڈنر کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ بھی اچانک ان کے ذہن میں ایک کوئڈا سالپکا اور انہوں نے اپنے بیٹے کو کال ملائی۔

”خیریت می! اس طرح اس وقت اچانک سے کال؟“ سلام و دعا کے بعد ضحاک نے اپنی حیرانی ظاہر کی۔

”ہاں بیٹا! دراصل مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔“ سز عقیدت کی بات سن کر وہ اور بھی حیران ہوا تھا ایسی بھی کیا ضروری بات ہو سکتی ہے جس کے لیے کال کی رات تک ویٹ نہیں کیا، وہ سوچنے لگا بھی سز عقیدت نے اسے آج کے واقعے سے لے کر اور بھی چھوٹی و معمولی باتیں جو نوٹ کرینی آئیں تھیں سے متعلق بتایا۔ ضحاک یکدم مضطرب سا ہو گیا۔ گویا اس نے جو درنجف کی اداسی و خاموشی نوٹ کی تھی وہ وہم نہیں حقیقت تھی

کیونکہ وہی سب اس کی می نے بھی نوٹ کیا تھا۔

”می! آپ پریشان نہ ہوں میں درجنف سے بات کروں گا اگر اسے کوئی پرابلم ہے کوئی ٹینشن ہے تو میں وہ بھی جاننے کی کوشش کروں گا۔“ ضحاک نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”ہاں بیٹا! ضرور پتا کرنا اور ذرا جلدی پتا نہیں کیا بات ہے۔ جو بچی کو پریشان کر رہی ہے اور وہ اندر ہی اندر سب برداشت کر رہی ہے۔“ مسز عقیدت کے لہجے میں ممتا کی مٹھاس بھی جو ضحاک کو اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔



وہ کیا تھی؟ کیا سوچتی تھی؟ کیا چاہتی تھی؟ کہاں رہتی تھی؟ یہ سب باتیں بس بروہ چلی گئی تھیں۔ اسے رشتہ نبھانا تھا اسے یہ گھر بسانا تھا۔ بس یہ ہی بات اسے از بر رہی۔ کہتے ہیں کہ وقت جیسا بھی ہو گزر رہی جاتا ہے مگر یہ کہنا آسان ہے اس وقت کو گزارنا دل گروے کا کام ہے۔ ان کے گھر سے کچھ میل دوز موجود گھر سے بجلی کا کنکشن لے لیا گیا تھا۔ وہ بھی شام چھ بجے سے صبح کے چھ بجے تک کے لیے یہ کنکشن بھی اس لیے کیا گیا کیونکہ اس ویرانے میں ان کا گھرا کھوتا ہی تھا۔ ایسے میں کئی آوارہ کئی سے لڑکے چوری کی غرض سے بارہا ان کے گھر کے آس پاس منڈلاتے، بھی شاہنواز لغاری نے یہ نام نہاد کنکشن لگایا اور ساتھ میں ڈیوٹی بھی کسی چوکیدار کی نہیں بلکہ خود کی اور اپنی بیوی کی۔ اس کے جہیز کا سامان اب تک سسلی بھابی کے سسرال ہی میں موجود تھا حالانکہ اب تو ان کی شادی کو ایک ماہ ہونے والا تھا۔ وہ جب بھی اپنے جہیز کے سامان میں سے کوئی جوڑا یا کچھ بھی لینے جاتی ہر بار اسے اس میں سے کسی نہ کسی چیز کی غیر موجودگی کا احساس ہوتا، پر اس بار تو اس کے صندوق سے پورے پندرہ جوڑے کم تھے۔ اسے بہت دھچکا لگا اور جب اس نے شاہنواز سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس کے جواب نے اسے خاموش ہی کر دیا۔

”ہاں! وہ جوڑے میں نے سسلی باجی کو دیئے ہیں۔ انہوں نے شادی میں مجھے کچھ پیسے ادا کر دیئے تھے جو لوٹانے کے لیے فی الحال میرے پاس نہیں تو میں نے انہیں کہا اپنی پسند کے صندوق میں سے جوڑے لے لو جوڑے آپ کے کام آجائیں گے اور میرا بھی قرض معاف ہو جائے گا۔“ یہ تھا اس کا شوہر اس کا ساتھی اس کا ہمسفر، جس کے لیے اسے یوں پرولس لانا پڑا تھا۔ اپنوں سے دو رادر جب وہ کچھ کہنے کو کب کھولتی تو اس کا اٹھتا ہاتھ نازو کے لب سی وینا ”سجھوتہ“ یہ لفظ جب کسی رشتے میں آجائے تو رشتہ جیسا بھی ہو بس نبھ ہی جاتا ہے۔ اس نے بھی سجھوتہ کر لیا تھا کیونکہ اسے سجھوتہ کرنا ہی تھا۔ پندرہ دنوں میں ایک بار وہ کراچی لے جاتا تو وہ اپنے رشتے داروں سے مل لیتی، ورنہ چپ کر کے اس ویرانے میں پڑی رہتی۔ یہ سلسلہ بھی بس دو چار مہینے چلا اور پھر چھپ چلی بار جب وہ کراچی اپنی ممانی کے گھر رکنے آئی تو انہوں نے آگے سے ہنگامی اپنے بچوں کے خرچے و گھر کے اخراجات کا وہ علی الاعلان نقشہ کھینچا کہ نازو نے طے کر لیا اب وہ صرف عید یا کسی خاص تہوار یا تقریب کے علاوہ یہاں نہیں آئے گی۔ حالانکہ یہ وہی نام نہاد رشتے دار تھے جنہوں نے اس کی ماں کو بہت یقین سے بہت مان سے کہا تھا کہ ”نازو یہاں اکیلی کبھی نہیں ہوگی ہم سب ہیں نا۔“ اب وہ کہتی بھی تو کس سے اس کے اپنے پرولس میں تھے اور جو نام کے اپنے تھے، انہوں نے ہاتھ جھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ ہاں وقتاً فوقتاً اس کے ماں باپ کا اس کی خیر خیریت پوچھنے کا تارا آ جاتا کیونکہ اس زمانے میں فون تو عام تھا ہی نہیں، اس لیے وہ بھی بدلے میں چھٹی لکھ کر نکلتی لگا کر لال ڈبے میں ڈال دیتی کہ ہاں یہاں سب خیریت ہے اور وہ بہت خوش ہے حالانکہ خوش اور خوشی

کے دونوں لفظ تو اجنبی بن کر اس کی ذات اور زندگی سے نکل ہی چکے تھے۔

☆.....☆

تاکتھ کلاس بہت اچھے نمبرز سے پاس کر کے وہ اب 10th میں آچکی تھی۔ پر 10th میں آتے ہی کچھ وجوہات کی بنا پر اسے پرائیویٹ اسکول سے اٹھا کر سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ صرف گرلز اسکول تھا۔ نیا اسکول، نیا ماحول، نئی کلاس اسے ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ ٹائم نہیں لگا تھا کیونکہ ایک تو وہ ذہین تھی۔ جس کا ثبوت اس کا 9th کا رزلٹ بتاتا اور دوسرا وہ نیچر کی بہت اچھی تھی اس لیے جلد ہی وہ اپنی کلاس سمیت باقی کلاس یہاں تک کہ اپنی ٹیچرز میں بھی مقبول ہو گئی۔ سب اس کی ذہانت سے متاثر تھے اگر کوئی لاپرواہ تھے تو اس کے گھر والے۔ جنہیں اس کی پڑھائی اس کی ذہانت سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اس کی ذات سے بھی۔ وہ اپنی ماں کی پہلو تھی کی اولاد تھی سگی اولاد اس نے جب سے ہوش سنبھالا اپنی ماں کو اور اپنے گھر کے حالات کو ہمیشہ الجھا ہوا ہی پایا۔ اس نے بھی اپنی ماں کو خوش نہیں دیکھا۔ کبھی ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی تیار، اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ اس کی ماں کی تیوری پر ہمیشہ بل پڑے رہتے اور ناک پر ہمہ وقت غصہ دھرا رہتا۔ انہوں نے کبھی بچوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی کبھی کسی بات پر نہ سر لہاتا تھا۔ ان کا انداز ہمیشہ روکھا پھیکا اور سرد ہوتا اب تو خیر وہ سب عادی ہی ہو چکے تھے۔ ہاں تو یہ اس کے 10th اسٹینڈر کی بات تھی جب C سیکشن کی لائبرے سے اس کی دوستی ہوئی اتفاقاً لائبرے کا گھر اسی کے محلے میں تھا۔ ان کا اسکول 8 منٹ کے ہی فاصلے پر تھا۔ اس لیے وہ اپنی بہن کے ہمراہ پیرل ہی اسکول جاتی۔ اس دن بھی وہ اسکول کی جانب رواں دواں تھی جب راستے میں اس کی نظر لائبرے کے گھر کے گیٹ پر پڑی۔

”شایہ! تم اسکول جاؤ میں ذرا لائبرے کو بلا لیتی ہوں اور اسی کے ساتھ اسکول آ جاؤں گی۔“ اس نے اپنی بہن سے کہا۔

”پر آپ! اگر امی کو پتا چلا تو وہ بہت غصہ ہوں گی۔“ اس سے تین سال چھوٹی اس کی بہن شایہ کے لہجے میں ڈرتھا۔

”اے..... امی کو مت بتانا پلیز۔ میں لائبرے کو لے کر اسکول ہی تو روانہ ہوں گی۔“ اس نے اپنی بہن کو سمجھایا اور پھر لائبرے کے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ لائبرے کو اپنے ہمراہ اسکول لے جانے کی غرض سے ہی آئی تھی پر لائبرے کے گھر داخل ہو کر وہ حیران رہ گئی کیونکہ لائبرے ابھی تک سو رہی تھی۔ اس کی باجی ایسے اٹھانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ جب کہ اس کی امی ناشتہ بنا رہی تھیں کہنے کو تو وہ لائبرے کے گھر پہلی بار آئی تھی پر اسے لائبرے کی پوری فیملی نے بہت دمی آئی بی دانی عزت دی تھی۔ لائبرے اٹھ کر اب اسکول جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی اور اب ناشتہ کرنے کے موڈ میں تھی جیسی اس کی امی چائے کے دو کپ اور پرائٹوں و آلیٹ کی پلیٹ لیے کمرے میں ہی چلی آئیں اور ساتھ ہی اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگیں۔ ایک نوالہ لائبرے کو کھلا کر ان کا ہاتھ اس کی جانب بڑھا تو وہ چونکی۔

”نہیں آئی! میں ناشتہ کر کے آئی ہوں۔“

”بیٹا! تم بھی میری لائبرے جیسی ہو، اس لیے آئی نہیں مجھے امی ہی کہو اور امی کی بات کبھی نہیں مانتے۔“ انہوں نے پیار سے کہہ کر نوالہ اس کے منہ میں ڈالا تو اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک اس نے ماں دیکھی تھی پر ممتا نہیں، ماں دیکھی تھی پر پیار نہیں۔ وہ لائبرے کی فیملی خاص کر اس کی امی سے بہت متاثر ہوئی

تھی۔ ان کی ممتا کی کشش ہی اس ممتا کی پیاسی کو لائیبہ کے گھر بھیج لاتی۔ اب وہ صبح تیار ہو کر اسکول کے لیے نکلتی، شاہی کو اسکول اکیلے بھیج کر خود لائیبہ کے گھر چلی جاتی اور پھر لائیبہ کے ہمراہ ہی اسکول روانہ ہوتی۔ وہ اب خوش رہنے لگی تھی۔ لائیبہ کے گھر ملنے والی اپنائیت نے اس کی بے رنگ زندگی میں رنگ سے بھر دیئے تھے۔

☆.....☆

پچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنی طبیعت میں بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ اب بھی وہ فریش ہو کر سونے کی تیاری میں تھی جب کہ ضحاک کمپیوٹر پر شاید کچھ کام کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے نیند آرہی ہے جو اتنی جلدی سو رہی ہو؟“ ضحاک نے اسے مخاطب کیا۔

”ہاں بس تھکن سی ہو رہی ہے۔“ اس نے آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

”درنجف! ایک بات پوچھوں؟“ ضحاک کے لہجے کی سنجیدگی نے اسے چونکایا۔ اس نے آنکھوں پر سے بازو

ہٹایا تو ضحاک کو بیڈ پر بیٹھا پایا۔ وہ جھٹ سے لیٹے سے اٹھی۔

”جی پوچھیں۔“

”عام لڑکیوں کی طرح تمہارے بھی کئی سنے ہوں گے۔ تمہارا بھی کوئی آئیڈیل کا ایج ہو گا پر تمہاری زندگی میں، میں شامل ہو گیا تو کیا میں تمہارے آئیڈیل جیسا ہوں؟ یا تمہارا آئیڈیل کیسا تھا؟“ اس نے کبھی آئیڈیل نہیں تراشا تھا بلکہ اس نے سرے سے شادی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سوچا یا چاہا تھا۔ وہ تو بس اپنی پڑھائی میں ہی محو رہتی اسے زیادہ بڑھنے کا اور پوزیشن حاصل کرنے کا کرہ تھا۔ پر سب ادھورا رہ گیا۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ضحاک کو اس کی مسکراہٹ مصنوعی لگی۔

”میں نے کبھی آئیڈیل کے بارے میں نہیں سوچا، زندگی نے آپ کو میرا ہمسرا بنایا ہے تو آپ ہی آئیڈیل ہیں بس۔“

وہ درنجف کے جواب سے مطمئن نہ ہو پایا تبھی اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

”پر پھر بھی کوئی تو تمہارا مطلب گاررہا ہوگا۔ کسی کی تم پسند یا کوئی تمہاری پسند تو ہوگا ہی۔“ درنجف نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالا۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمایاں تھیں۔

”مجھے نہیں معلوم کسی کے دل و دماغ میں میرے بارے میں کیا تھا پر میں ایسی نہیں ہوں۔ مجھے تو کوئی چیز پسند کرنے کا بھی اختیار حاصل نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو اور لہجے کے اتار چڑھاؤ ضحاک کو واضح محسوس ہو رہے تھے پر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج تو وہ اس کی پریشانی جان کر ہی رہے گا۔

”اچھا کوئی دوست تو ہوگا؟ بلکہ یہ بتاؤ تمہاری سہیلیاں کتنی ہیں؟ اسکول کی، کالج کی، محلے کی، کیونکہ آج تک تمہارے منہ سے تمہاری کسی سہیلی کا نہیں سنا۔“ ضحاک کی نگاہیں اس پر لگی تھیں جس کے چہرے پر عجیب سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

”چھوڑیں بھی یہ باتیں مجھے سونا ہے۔“ درنجف نے جان چھڑانی چاہی مگر ضحاک کا ارادہ آج اٹل تھا۔

”سو جانا، جانم برا بھی تھوڑی باتیں تو کر لو۔ اچھا یہ بتاؤ تم نے کبھی اسکول یا کالج جان بوجھ کر Bunk کیا ہے مطلب جھوٹ بول کر؟“

”آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟“ درنجف کی تیوری پر غصے سے بل پڑ گئے۔

”میں نے ایسا کیا غلط کہہ دیا؟“ ضحاک کا لہجہ تشویش ناک تھا۔ کچھ بھی جواب دیئے بغیر درنجف خاموشی سے

رواذاً مجسٹ 311 فروری 2016،

READING
Section

اس کی شادی کو چھ ماہ بیت چلے۔ اس عرصے میں بارہا اس کے سسرال والے گاؤں سے آتے رہے وہ اپنی ساس نندوں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھی پر کچھ کچھ الفاظ وہ سمجھ لیتی رفتہ رفتہ وہ جان گئی کہ اس شادی کو لے کر شاہنواز کے گھر والے خوش نہیں وہ اس کی شادی اپنے رشتے داروں میں کر دانے کے خواہش مند تھے جب کہ شاہنواز کو بھی اپنی شادی میں کوئی انٹرسٹ نہ تھا۔ جیسے پیٹرول ختم ہو جانے کے بعد کچھ دیر تک گاڑی کو دھکا مار کر چلایا جاتا ہے۔ یونہی ان کی شادی شدہ زندگی دھکا مار کر بس گزر رہی تھی۔ دن، رات، ہفتے، مہینے اور پھر سال آگے پیچھے دوڑتے آگے نکل پڑے۔ ان ڈھائی سالوں میں وہ کسی حد تک سمجھوتا کر چکی تھی۔ ماں باپ پھر پلٹ کر پاکستان نہ آئے۔ نہ وہ جا سکی البتہ آنے والے خطوں سے اسے خیر خیریت کے ساتھ یہ بھی پتا چل گیا کہ اس کی بہن فرحت کی شادی رشتے داروں میں ہو چکی جب کہ مدحت کی بھی عنقریب شادی ہونے کو تھی اس کی پھپھو کے بیٹے سے۔ وہ خوش تو ہوئی پر اس بھی کہ وہ شریک نہیں ہو سکی پر اس سے زیادہ دکھا سے اس بات کا رہا کہ اس کی شادی بھی تو وہیں کہیں کسی بھی رشتے دار میں ہو سکتی تھی پھر اتنی جلدی کیا تھی اسے یہاں دیرانے میں بیٹھنے کی۔ یہ دکھا دل روز سے اندر ہی اندر دیمک کی طرح اسے کھوکھلا کر تاجا رہا تھا۔

☆.....☆

رواج کے مطابق آخری ماہ سے لے کر بچے کی پیدائش اور باقی کا سوا مہینہ لڑکی اپنے میکے میں گزارتی ہے۔ پر درنجف نے میکے جانے سے انکار کر دیا اور سونے پر سہاگا اس کے میکے والوں نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ بس کبھی کبھار اس کے والد ہمراہ اس کی بہن کے چلے آتے، حال احوال لیتے کچھ فردٹ یا جوس وغیرہ دے جاتے، سبز عقیدت کو یہ سب دیکھ کر اچنبھا ہوتا، پردہ خاموش تھیں کہ جس میں بہو کی خوشی۔ ویسے بھی ڈاکٹر نے اسے کسی بھی قسم کا اسٹریس لینے سے صاف منع کیا تھا۔ سبز عقیدت نے سارے کام ملازمہ اور اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ یہاں تک کہ ضحاک کو بھی ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ درنجف سے کسی بھی ایسے ٹاپک پر بات نہ کرے جس سے اس کی صحت پر اثر پڑے۔ اسی لیے ضحاک نے اپنی الجھنیں اپنے تک ہی محدود کر لی تھیں۔ زندگی یکدم مصروفیت کی پگڈنڈی پر دوڑی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک دن آتا اور گزرتا چلا جا رہا تھا اور پھر وہ دن بھی چلا آیا، جب درنجف ماں کے عہدے پر فائز ہو گئی اس نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ علوی نیلی میں تو خوشی کا سماں تھا سبھی خوب چمک رہے تھے یہاں تک کہ اسکاٹپ پر بات کرتیں صبا عنہا اپنی بھی بہت خوش اور پر جوش سی نظر آتیں آخر کو وہ پھپھو جو بن گئی تھیں۔ درنجف کے میکے والے بھی تھے تحائف و مٹھائی لے کر آئے تھے۔ اس کے بہن بھائی سمیت سبھی خوش نظر آ رہے تھے۔ صبا عنہ نے اپنے لاڈلے بھتیجے کا نام ضرغام اور بیٹی کا نام سچی رکھا تھا۔ درنجف کو کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ وہ جانتی تھی علوی نیلی میں بچوں کے نام یونیک ہی رکھے جاتے تھے۔ دونوں ہی بچے دادا، دادی، پاپا سمیت نانا، نانی الغرض سبھی کے بے حد لاڈلے تھے۔ سبز عقیدت کو تو ضرغام میں ضحاک کا بچپن دیکھتا جب کہ معیت علوی صاحب کو ضرغام علوی خاندان کا چشم و چراغ نظر آتا۔ جب کہ درنجف کے ساتھ معاملہ الٹا تھا۔ وہ دونوں بچوں کے ہر کام میں پہلے سچی کے کام کو ترجیح دیتی۔ دونوں روتے تو سچی کے کام کو ترجیح دیتی۔ دونوں روتے تو سچی کو پہلے اٹھا کر چپ کر داتی، فیڈ کروانا ہوتا تو پہلے سچی کو کرواتا۔ پھر ضرغام کو گود میں لیتی۔ یہ بات سبز عقیدت نے بھی نوٹ کی تھی اور ضحاک نے بھی نوٹ کی تھی کہ درنجف کا جھکاؤ بیٹے کے مقابلے میں بیٹی کی طرف زیادہ تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو فی الحال انکو ریکارڈ کیا جا رہا تھا پر آخر تک۔ اس دن تو حد ہی ہو گئی جب پانچ ماہ کی سچی کے رونے کی آواز سن کر بچن میں کام کرتی درنجف چوہے پر پکتی آلو گوشت کی ہانڈی یونہی چھوڑ کر

ضحکی کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئی۔ پورے گھر میں جلنے کی بو پھیلی تو اپنے کمرے میں آرام کر میں مسز عقیدت باہر آئیں جہاں آلو گوشت دیکھی میں چپک کر کالا ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ درنجف کے کمرے میں تھیں۔ جہاں ضرغام تو سو رہا تھا جب کہ صبحی بھی شاید سو چکی تھی پر درنجف اسے گود میں لیے تھپک رہی تھی۔

”بہو بچے ہم نے بھی جنم دیئے پر ارد گرد سے بے نیاز ہو کر بچوں کو لے کر نہیں بیٹھے رہے۔“ ڈھائی سال میں پہلی بار مسز عقیدت کا لہجہ غصیلا ہوا تھا۔ ایک پل کو درنجف بھی چونکی پھر اپنی گود میں سوئی صبحی کو کاٹ میں لٹایا اور مسز عقیدت کے ہمراہ روم سے باہر چلی آئی اور خاموشی سے کچن کی طرف چل دی۔ درنجف نے ساس کی بات کا جواب دیئے بغیر اسے سنا اُن سنا کر دیا۔ مسز عقیدت بھی کچھ دیر اس کے جواب کی منتظر رہیں پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ درنجف کی حرکتوں سے تنگ آ چکی تھیں کبھی کپڑے دھوتے تل کھلا چھوڑ بچوں کے پیچھے بھاگتی تو کبھی چولہا کھلا چھوڑ کر۔ الغرض وہ بچوں خاص کر صبحی کے لیے حساس ہوتی جا رہی تھی۔ مسز عقیدت بھی ماں تھیں وہ ممتا کو سمجھ سکتی تھیں۔ پر اب وہ پریشان تھیں کہ درنجف کی ممتا جنون کی حد اختیار کرتی جا رہی ہے اور جنون کسی بھی چیز کے لیے ہو خطرناک ہی ہوتا ہے وہ اس چیز اور انسان کو اس حد پر لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں ہوتی۔

☆.....☆

ان کے سنسان علاقے میں موجود پیری کے درختوں اور خاردار جھاڑیوں کو کاٹ کر اب پلاٹ فروخت و زیر تعمیر ہو رہے تھے اس لیے شاہنواز لغاری نے اندرون شہر کے ایک بہتر علاقے میں کرائے پر گھر لے لیا۔ یہاں گیس، بجلی کی بھی سہولت دستیاب تھی۔ یوں وہ لوگ یہاں رہنے گئے۔ ویسے بھی اس کی مثال روپوٹ کی طرح تھی۔ جہاں جلنے کو ساتھ کہہ دیا وہ ساتھ ہوئی اسے کہا جاتا اٹھو وہ اٹھتی دہ اسے بلاتا تو وہ پاس چلی جاتی۔ گویا وہ ایک مبینہ زندگی گزار رہی تھی جس کا ریپوٹ شاہنواز کے ہاتھ میں تھا۔ ایسے میں پے در پے سسرال سے ملنے والے طعنے ”بانجھ“ یہ لفظ کتنا بھاری ہے اس کا ادراک صرف وہی عورت کر سکتی ہے جسے یہ طعنے شوہر کے سامنے ملتے ہوں حالانکہ بانجھ بنا عورت کے اختیار میں نہیں اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے مگر لب خاموشی لیے ہوتے۔ وہ شکوہ شکایت سے کنارہ کشی کر چکی تھی۔ انہی دنوں جب وہ بانجھ لفظ کی گھراؤں میں الجھی ہوئی تھی قدرت اس پر تین سال بعد مہربان ہوئی گئی۔ وہ جوان تین سالوں میں اپنوں کو بھلائے غیر واجبی شہر اور لوگوں میں اپنوں کو ڈھونڈتی رہی تھی تخلیق کے عمل سے گزرتے اسے شدت سے اپنی ماں یاد آئی تھی۔ درد کی حالت میں بھی اس کی زبان پر اپنی ماں ہی کی پکار تھی۔ ان کی مالک مکان کافی ہمدرد اور اچھی خاتون تھیں۔ اس نے بخوبی ایک بڑی بہن ہونے کا فرض نبھایا تھا۔ ناز کو مالک مکان خاتون کی صورت ایک سہارا سا مل گیا تھا۔ تکلیف میں درد سے کراہتے اپنی ماں کو پکارتے وہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی، مصروفیت یکدم بڑھ گئی تھی وہ گھر اور بچی کے کاموں میں سہارا دن لگی رہتی۔ بیٹی کی ہی سہی ماں بن جانے پر اس کے سسرال والوں نے بانجھ ہونے کا طعنہ اور شاہنواز کی دوسری شادی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب کہ شاہنواز کی زندگی میں بھی ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ بچی ہی کے سبب وہ معتبر تو ہونے لگی تھی۔ اپنی بیٹی ہی کی خاطر وہ ناز کو کا بھی خیال رکھنے لگا تھا۔ اپنی بیٹی کے لیے کچھ لاتا تو اس کی ماں کے لیے بھی ضرور لاتا۔ ناز کو بیٹی بمشکل ڈیڑھ سال کی ہی ہوئی تھی کہ اس نے ایک بیٹے کو جنم دے کر سسرالیوں کی زبان کو تالا لگا دیا۔ انہی دنوں وہ گنجان علاقہ جہاں شاہنواز کا گھر تھا آباد ہونے لگا تو شاہنواز نے اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اس گھر کے فرش و دیواروں پر پلستر کروانا

شروع کر دیا۔ ساتھ ہی چھت ڈال کر صحن کے ایک کونے میں بادرچی خانہ بھی ہوا لیا۔ دو سال کی بیٹی اور کچھ ماہ کے بیٹے کو گود میں اٹھائے وہ ایک بار پھر اسی گھر میں چلی آئی جو اب قدرے بہتر تھا۔ وقت بیتتا چلا گیا۔ کتنے ہی ماہ و سال آگے پیچھے وقت کے کشکول میں گرتے رہے۔ نازد اب چار بچوں کی ماں بن چکی تھی کہنے کو تو وہ چار بچوں کی ماں کہلاتی پر ان چار بچوں کی ماں نہ بن پائی کیونکہ وہ شاہنواز کے جو بچے تھے اندر دنی طور پر ایک سردی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور جنگ چاہے جیسی بھی ہو ہمیشہ جابہی پھیلاتی ہے۔

☆.....☆

انسان کے اندر اداسی ہو تو اس کا اثر آنکھوں کے راستے ہوتا ہوا کائنات کے ایک ایک عنصر و منظر میں پھیل جاتا ہے۔ گویا آنکھیں اندر کے موسم کی عکاسی کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح درنجف کی آنکھوں میں بھی اداسی، افسردگی اور عجیب سا خالی پن نمایاں ہوتا اس کے وجود کو ڈھانپ لیتا۔ دسمبر کی اس صبح میں خاصی دھند تھی اور دھند میں اپارٹمنٹ کے قریبی پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چہرہ نم ہو جاتا۔ عجیب سی خشک سردی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو رگڑ کر حرارت پیدا کرتے ہوئے درختوں کی اڈٹ سے جھانکتی سورج کی کرلوں کو دیکھا۔ دھوپ میں حدت نہیں تھی اور ابھی سورج کو نکلنے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی۔ وقت گویا رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ مگر اس کا دماغ تند و تیز ہواؤں کی طرح تیزی سے سوچوں میں مگن تھا۔ دھند میں لیٹے ہوئے موسم کی طرح جیسے سارے ہی منظر دھندلائے ہوئے تھے کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا وہ جتنا بھی سوچتا جس طرف بھی دیکھتا۔ کوئی سرا کوئی جواب نہ مل پاتا۔ گویا ہر طرف دھند ہی دھند تھی اور اسے اس گرداب سے درنجف کو نکالنے کی کوئی صورت کوئی راہ نظر ہی نہ آتی۔

سورج چاچا بھی ابھی بادلوں کی اڈٹ سے جھانکتے ہوئے سوچوں میں گم ضحاک کو تکتے اور پھر سے بادلوں کی گود میں جا سوتے۔ کہتے ہیں غم اور زبان کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ غم میں جتنی شدت اور گہرائی ہوتی ہے زبان اتنی ہی زیادہ بند اور خاموش رہتی ہے اور ڈھائی سال سے درنجف کی بند زبان اور خاموش آنکھیں ضحاک کو واضح کر چکی تھیں کہ غم میں کتنی شدت اور گہرائی ہے۔ ان ڈھائی سالوں میں سب کچھ ویسا ہی تھا کہیں کچھ نہیں بدلا تھا سوائے ایک بات کے کہ درنجف بھی کبھار کچھ گھنٹوں کے لیے ہی بھی بچوں کے ہمراہ اپنے میکے چلی جاتی یا پھر اس کے ابو چلے آتے اور بچوں کو ہمراہ لے جاتے کچھ دیر گھما پھرا کر بچوں کی چیزیں دلو کر واپس چھوڑ جاتے۔ ضحاک اپنی ہی تمام کوششیں کر کے اب تھکنے لگا تھا۔ پر درنجف کی جامد خاموشی ٹوٹ کر ہی نہ دے رہی تھی۔ سز عقیدت نے بھی تھک کر بہو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ پر اب ضحاک نہیں چاہتا تھا کہ درنجف کی خاموشی کا اثر اس کے بڑے ہوتے بچوں اور گھر پر پڑے بھی اسے اپنے ایک دوست (آفاق) کا خیال آیا وہ تا صرف ایک مشہور سائیکالوجسٹ تھا بلکہ اس کا دوست بھی تھا۔ دونوں نے ایک ہی اسکول اور پھر کوچنگ سے پڑھا تھا گو کہ یہ پرسنل باتیں ہر کسی سے شہر کرنے کی نہیں ہوتیں پر اگر ان باتوں کی تہہ تک نہ پہنچا جائے تو زندگی میں مضبوط رشتے کی مضبوط دیواریں کھوکھلی سی پڑ جاتی ہیں اسی لیے ضحاک کے قدم اس وقت مشہور سائیکالوجسٹ، دوست کے کلینک کی طرف بڑھنے لگے۔ ڈاکٹر آفاق نے اس مسئلے کو بہت گہرائی سے جانچنے کے بعد ضحاک کو ہی اس معاملے کی گہرائی میں اترنے کا راستہ دکھلایا تھا۔ بقول آفاق کہ نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جنہیں اس راز سے واقفیت ہو جائے کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئیں تھیں۔ ضحاک کو بھی اب پرانی بنیادوں کو دریافت کر کے پر اعتماد و مضبوط نئی بنیادوں کو تعمیر کرنا تھا۔

وقت کا سرپٹ گھوڑا بہت تیزی سے دوڑنے میں مصروف تھا۔ کبھی دن پر رات حاوی ہو جاتی تو کبھی رات کی چادر کی ادٹ سے دن کی روشنی چھلک پڑتی۔ اس دن درات کی ہیر پھیر میں گھڑی کی سوئیاں اور کیلنڈر کی تاریخ بدلتی چلی جا رہی تھی۔ یہ بھی ایک عام سادہ تھا۔ علوی فیملی ناشتے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ می، ضرغام کو تو درنجف، صحنی کو سریلیک کھلا رہی تھی۔ پاپائوز پیر پڑھنے کے ساتھ ساتھ چائے کا کپ بھی ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔ جب کہ ضحاک آفس جا چکا تھا۔ ماحول ایک دم پرسکون سا تھا، براس پرسکون سے ماحول میں ارتکاز ضحاک کی اچانک آمد کی وجہ سے پھیلا۔ درنجف کے بھائی (حذیفہ) کو پولیس نے اریسٹ کر لیا تھا۔ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ چوری کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ حذیفہ کی عادتیں بگڑی ہوئی تھیں وہ اسموکنگ بھی کرتا تھا۔ پر چوری جیسے فعل میں پکڑا جانا ضحاک سمیت علوی فیملی دونوں کو ہی دھچکا لگا تھا۔ معیث علوی تو ناشتہ کرتے ہی آفس کے لیے نکل گئے تھے پر جانے سے پہلے انہوں نے اپنی بیگم کو بہو کے میکے جانے کی بھی خاص تاکید کی تھی۔

”بیٹا! تم ذرا بچوں کو سنبھالنا میں اور درنجف اس کے میکے ہوا تے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہماری وہاں موجودگی لازمی ہے۔“ انہوں نے ضحاک کو ہدایت دی۔

”اور درنجف بیٹا! آپ بھی ریڈی ہو جاؤ میں بھی ڈریس چینج کر لوں پھر چلتے ہیں۔“ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے اپنی بہو کو بھی تاکید کی۔ ضحاک منتظر تھا کہ درنجف کچھ کہے۔ کچھ نہیں تو کم از کم اس پریشانی کے موقع پر روئے نگر وہ پرسکون ہی بیٹھی بچوں کو سریلیک کھلانے میں مگن تھی۔ گویا کچھ دیر پہلے ہی جانے والی بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔

”درنجف! تم نے سنا نہیں می نے کیا کہا؟ بچوں کو چھوڑو ان کو میں سنبھال لوں گا تم جا کر ریڈی ہو جاؤ۔“ ضحاک نے درنجف کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”نی الحال جانا ضروری نہیں گھر میں اور بھی دس کام ہیں۔“ سریلیک کا خالی باؤل اور دیگر برتن سینٹے ہوئے درنجف نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔ ”ڈاٹ ڈو یو مین تم نہیں جا رہی، وہاں جانے سے زیادہ ضروری ہیں یہ کام.....؟“ ضحاک نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نرم رکھا۔ درنجف نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ شاید بھی کچن کی راہ لی۔ اتنے میں مسز عقیدت بھی ڈریس چینج کر کے لاؤنج میں چلی آئیں۔

”ہائیں..... تم ریڈی نہیں ہوئیں.....؟“ آپ ہی سمجھا میں ذرا اس بے وقوف لڑکی کو، یہ جانے سے انکاری ہے۔“ ضحاک نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مسز عقیدت کو بیچ میں گھسیٹا۔

”درنجف بیٹا! کیا بات ہے؟ تمہارا بھائی مصیبت میں ہے۔ تمہاری فیملی کو بھی تمہاری ضرورت ہے۔ اور تم جانے سے انکاری ہو۔ آخر کیوں؟“ وہ درنجف کا ہاتھ تھامے کچن سے باہر لے آئیں۔ پیار سے، غصے سے، اصرار کر کے الغرض ہر طریقے سے دونوں ماں بیٹے نے درنجف کو سمجھایا۔ بالآخر جھنجھلا کر ضحاک اپنی می کو ہی درنجف کے میکے چھوڑ آیا۔ پر آج اس نے تمہیہ کر لیا تھا کہ وہ دو ٹوک بات کر کے سب کچھ جان کر ہی رہے گا۔ وہ گھر آیا تو درنجف، ضرغام کو نہلا کر اب تیار کر رہی تھی جب کہ پاس ہی بیڈ پر صحنی تیار شیار ہو کر اپنے کھلونوں میں مگن تھی۔ ضرغام کے تیار ہوتے ہی ضحاک نے آواز دے کر ملازمہ کو بلایا اور دونوں بچوں کو اس کے حوالے کر دیا۔

”آپ کچھ دیر بچوں کو سنبھال لیں۔“ ملازمہ جب دونوں بچوں کو باہر لادینچ میں لے گئی تو ضحاک اٹھ کر درنجف کی سمت آیا جواب بچوں کے کپڑے اور کھلونے سیٹ کر رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر درنجف کے دونوں ہاتھوں کو تھاما اور اسے اپنے ہمراہ لیے بیڈ کی سمت چلا آیا۔

”کیا بات ہے؟“ درنجف نے حیرانگی سے پوچھا۔

”بات کیا ہے یہ آج تم بتاؤ گی اور سب کچھ بتاؤ گی۔“ ضحاک نے پیار سے اسے اپنے برابر بٹھاتے اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ درنجف نے بہت غور سے دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا گویا آج اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

”ضحاک! آپ چھوڑیں نا یہ سب میں نے ابھی کھانا بھی بنانا ہے۔“ درنجف نے جھٹ سے بات بدلی چاہی۔

”یہ کام بھی ہو جائے گا۔ پر آج خلاصہ ہو کر رہے گا۔ اتنے سالوں میں میرا ساتھ کوئی ایک بل ایک لمحہ تمہارے لیے اپنائیت لایا ہو تو اس کی خاطر آج مجھے تم اپنا دکھ، اپنی تکلیف، اپنا احساس سونپ دو پلیز۔“ ضحاک کا انداز التجا آمیز تھا۔ کچھ ضحاک کا انداز ایسا تھا اور کچھ وقت کا تقاضا کیونکہ درنجف بھی ماضی کی یادوں کا بوجھ اٹھائے تھکنے لگی تھی اس کی اندر کی ٹھٹھن باہر آنے کو بے تاب تھی اور وہ ماضی کے ساغر میں ضحاک کے ہمراہ اترتی چلی گئی۔



”میرے امی ابو کی شادی مکمل طور پر ارنج تھی۔ ارنج بھی ایسی کہ میری امی جو انڈیا سے تعلق رکھتی تھیں اور ابو اندرون سندھ سے ان دونوں کو قسمت نے اچانک سے ملا دیا۔ آخر کو قسمت کے آگے کہاں کسی کا بس چلتا ہے۔ قسمت جو بے جیسا دے سمجھداری تو اسی میں ہوتی ہے تاکہ انسان خوشی سے اسے قبول کرنے، کیونکہ دوسرا کوئی راستہ نہیں بچتا۔ پر میرے ابو شاہنواز لغاری اور امی نازد عرف نرہت بیگم دونوں نے قسمت کے اس لکھے کو قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ اولاد جیسی نعمت پا کر بھی دونوں نے اس بندھن سے جھوٹا نہ کیا۔ میرے والد مذہبی تھے مگر صرف گھر کی بیٹی کے لیے ان میں غیرت ٹوٹ ٹوٹ کر بھری تھی۔ پر صرف بیٹی کے لیے ان کے لیے بیٹیوں کو پیرنا پاؤ ہانپ کر سات پرووں میں چھپا کر رکھنا، ان پر بے وجہ حدود و جہ کی پابندی لگانا ہی۔ عزت و غیرت کی بات تھی دو پٹیاں پا کر خوش تو تھے پر انہیں لگتا یہ ایک بوجھ ہے جو سینے پر دھرا ہے۔ انہوں نے ہمیں اسکول تو بھیجا پر بہت سی لہختوں کے ساتھ۔ رہی میری امی تو انہوں نے بچوں کو پیدا تو کر لیا پر پرورش کرنا بھول گئیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں انہیں چھوٹے بڑوں کی تمیز سکھلانا، آپ جناب سے بات کرنا سکھلانا یا ان بہن بھائیوں کو پیار محبت کے بندھن میں باندھنا یہ وہ یکسر فراموش کر گئیں۔ نتیجتاً ہم سب بہن بھائیوں میں باہمی محبت تو دور البتہ لڑائی جھگڑے کی فضا ہمیشہ قائم رہی۔ باجی آپنی یا بھائی جان کا سابقہ بھلائے ہم ایک دوسرے کو تو اور ناموں سے پکارتے۔ الغرض تربیت و پرورش میں میرے والدین نے توجہ دینا ضروری نہ سمجھا۔ وہ بھول گئے کہ ان کے بچے بھی ہیں جو بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کی کچھ ضروریات بھی ہیں۔ انہیں ہمہ وقت یاد دہانا تو صرف اتنا کہ قسمت نے ان کے ساتھ یہ مذاق کر کے ان دو اجنبی کو ایک سفر کا ہم سفر و ہم قدم بنا دیا۔ اسی تکرار، اسی اختلاف اور اسی اعتراض کو لیے وہ دونوں مخالف سمت محو سفر رہے جس کا اثر ہم سب پر پڑتا رہا۔ میری امی یہ بھولتی گئیں کہ اب وہ صرف کسی کی بیٹی اور بیوی نہیں رہیں، بلکہ وہ اب دو بیٹیوں کی ماں بھی ہیں۔ ان کا چہرہ نہ بھی کھلا ہوا دیکھا۔ نہ

مسکراتا ہوا۔ ہمیشہ سپاٹ، غصیلا اور تیوری پر بل۔ میرے والدین نے ہم پر خاص کراپٹی بیٹیوں پر نہ کبھی اعتبار کیا نہ اعتماد یا اور یوں ہماری شخصیت ٹوٹنے اور بکھرنے لگی۔ ہماری ضرورتوں میں، ہماری کامیابی میں، ہمیں ایک ماں کی ان کی متا کی جب جب ضرورت پڑی اور ہم نے ارد گرد نظر دوڑائی تو نظر اور طلب خالی ہی لونی کیونکہ ماں باپ تو تھے ان کا نام بھی تھا وجود بھی تھا۔ پر احساس نہ تھا۔ اپنائیت نہ تھی، ممتا نہ تھی، شفقت نہ تھی اور ہم ہمیشہ تہی دامان و تشنہ ہی رہے۔ "اس کا گلزار بندھ گیا اور وہ رک گئی۔ ضحاک کو لگا وہ آگے ایک لفظ بھی نہ بول پائے گی۔ اس کی آنکھوں میں غموں کا سیلاب یوں اتر آیا کہ ضحاک کا جی چاہا جو کچھ بھی جیتا ہے وہ بھول جائے، جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سب کچھ ذہن سے نکل جائے، اس کے سچ ماضی کی یادوں کو کاٹ کر وہ اس کی زندگی سے دور پھینک دے۔ پر بھلا یہ کب ممکن تھا۔ اگلے پل وہ پھر سے بولنے پر اتر آئی۔

"لائبہ سے میری دوستی میٹرک میں ہوئی۔ میں اس لڑکی سے متاثر ہوئی کہ نہیں پر میں اس کے گھر، ماحول اور فیملی خاص کر اس کی ای سے مل کر گویا مکمل ہی ہو گئی۔ متا کی ترسی کو لائبہ کی ای کے روپ میں متا کا پورا تجربہ مل گیا تھا۔ ان دنوں میں بہت خوش رہتی پر یہ خوشی بھی عارضی رہی۔ لائبہ سے دوستی اور اکثر اس کے گھر جانے کا علم میری فیملی کو کیا ہوا، گویا طوفان آچلا۔ ان کے نزدیک لائبہ اچھی لڑکی نہ تھی کیونکہ اس کی امی نے دوسری شادی کی ہوئی تھی۔ لائبہ کے والد کی ڈیڑھ تھ کے بعد یہ ان کی دوسری شادی تھی، پر ان کے دوسرے شوہر کی بھی حادثاتی طور پر ڈیڑھ تھ ہو چکی تھی۔ الغرض اس بات کو ایٹھو بناتے ہوئے میری دوست، اس کی والدہ سمیت مجھ پر بھی انگلی اٹھائی گئی کہ میں خود ایسی بد کردار ہوں جو مجھے ایسی ہی دوست پسند آئی۔ اس دن پہلی بار میری زبان کھلی تھی ان کے خلاف اور پھر تو سارا الزام لائبہ کی سنگت اور اس کی والدہ کے زیر سایہ رہنے پر لگ گیا۔ وقت تھوڑا اور سرکا، اب میں فرسٹ ایئر میں آچکی تھی۔ یعنی جوانی میں قدم رکھ چکی تھی پر اس کے ساتھ ہی مجھ پر بے جا پابندیاں لگ گئیں۔ جیسے چھت پر نہ جانا، گیٹ پر نہ جانا، موبائل فون نہ اٹھانا، چاہے کسی کا بھی فون آئے، نہ کسی دوست سے دوستی رکھنا، نہ اسے گھر بلانا اور نہ ہی اس کے گھر جانا۔ کالج جو صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہی تھا۔ وہاں تک چھوڑنے اور لینے بھی ای ہی آئیں۔ گویا اتنا بھی بھروسہ نہ تھا اور ساتھ ہی طے سے اس کی پڑھائی مکمل ہو تو یہ روز کے باہر کے چکر ختم ہوں۔ یہ عذاب تلے تو راحت تلے۔ چھوٹی شاہی تو ابھی ناکتھ میں تھی اس لیے وہ آزاد تھی جب کہ دونوں بھائیوں پر تو نہ کبھی کوئی پابندی لگی تھی نہ ہی کوئی تنقید۔ الغرض یہ روز صرف بیٹیوں اور خاص کر میرے لیے ہی بنائے گئے اور لاگو ہوتے تھے۔ ان دنوں مجھے غصہ آتا، چڑچڑاہن مزاج پر حاوی رہتا۔ باقی دوستوں سے جب ان کی گھریلو باتیں اور والدہ کی بھرپور ممتا سے بھرے قصے سنتی تو حسرتیں سر اٹھاتیں۔ جب کسی دوست کے منہ سے فلموں گانوں کی باتیں نکلتیں تو تصور کی آنکھ سے خود کو کوئی وی کے آگے براجمان دیکھتی کیونکہ باقی پابندیوں کی طرح گانے سننے تو دور گنگنانے کی بھی پریشن نہ تھی کہ کہیں میں گلوکارہ ہی نہ بن جاؤں۔ چوڑی دار، ہاف سلیوف پہننے کی اجازت نہ تھی کہ کہیں میں رقاصہ نہ بن جاؤں۔ چھت یا باہر جانے پر یوں پابندی تھی گویا کسی پرندے کی طرح اڑ ہی نہ جاؤں اور ان دنوں سچ پوچھیں تو میں پرندوں کو خوش قسمت سمجھتی۔ کیونکہ وہ ہر قید و پابندی سے مبرا آسانی کہیں بھی اڑ جاتے۔ جہاں دل چاہتا پہنچ جاتے۔ میں ایک جیتا جاگتا وجود تھی۔ پر مجھے بے جان پتلا سمجھ کر کسی کو نے میں رکھ چھوڑا تھا۔ لڑکیاں ایسے حالات میں خود کو قیدی محسوس کرنے لگتیں ہیں جب ان پر سختی اور حد سے بڑھ کر پابندی لگ جائے۔ ایسے میں وہ باغیانہ خیالات کا شکار ہو کر کبھی کبھار ایسا قدم بھی اٹھاتی ہیں جو ان کو سچ سچ تباہی کے گڑھے کی جانب لے جاتا ہے۔ تاریکیوں میں گھری مجھے روشنی کی تلاش تھی

اور لائبرے کے گھر مجھے وہ روز ملتا، وہ روشنی ملتی جس کی مجھے اندرونی طور پر ضرورت تھی اور یوں فرسٹ ایئر کی کچھ کلاس Bunk کر کے میں اس کے گھر جانے لگی۔ مجھے وہاں اپنائیت وہ پیار ملتا جس کی کھلی مجھے برسوں سے تھی۔ لائبرے کے گھر آ کر مجھے یوں لگتا جیسے کسی نفس سے وقتی طور پر ہی سہی آزادی مل گئی ہو، پر یہ آزادی میرے لیے اور پابندیاں لے آئی۔ میری فیملی کو میری کلاسز Bunk کرنے کا پتا چل گیا اور مجھے اور میری سوچ کو باغی قرار دیتے ہوئے باہر تو آنا جانا بند کر دیا ہی پر کالج بھی چھوڑا دیا۔ اعلیٰ تعلیم، کچھ بننے کا اپنی ذہانت کو ثابت کرنے کا ہر خواب ختم ہو گیا۔ ابونے مجھ سے بات کرنا بند کر دی، میری شان میں وہ القابات دئے گئے کہ میں اپنی غلطی ہی ڈھونڈتی رہ گئی۔ اتنا بڑا گناہ نہ تھا جس کی سزا دی گئی۔ ای تو ویسے ہی ہم سے لا تعلق ہی تھیں۔ والد نے بھی منہ پھیر لیا۔ ساری پابندیاں مجھ پر لگاتے ہوئے بیٹوں کو یکسر بھولتے گئے جس کے نتیجے میں وہ خود سر آوارہ اور بد تمیز بنتے چلے گئے۔ حذیفہ نے چھوٹی موٹی چیزیں چوری کرنا بھی شروع کر دیں۔ دن بدن وہ بگڑتے چلے گئے۔ ہوش آیا تب جب پانی سر پر سے گزر چکا تھا۔ ہاتھوں میں سگریٹ انداز میں ہٹ دھری اور ہونٹوں پر گالیاں تھیں۔ ہم بہنوں سے بھی ان کا رویہ تنگ آمیز ہوتا میں جو سب سے بڑی تھی تمیز سے بات کرنا تو دور الٹا میری چوکیداری کی جانے لگی۔ کہیں موبائل فون کے پاس کھڑی کسی عاشق کو تو فون کرنے کے چکر میں نہیں، آج کا جل لگایا ہے تو کسی عاشق کو دیدار تو نہیں کروانا، ناخن بڑھائے ہیں یعنی فیشن کرنے کا شوق چڑھا ہے۔ مختصر اپنے ہی گھر میں اپنے ہی ہاتھوں میں پتھر لیے نظر آتے۔ انہی دنوں میں آپ کا رشتہ آ جاتا، ایک غنیمت سا لگا۔ جب انسان طویل عرصے تک اندھیرے میں رہ کر یکا یک تیز روشنی میں آئے تو اس کی آنکھیں جو اندھیرے کی عادی تھیں وہ روشنی سے مانوس نہیں ہو پاتیں۔ وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ روشنی ایک حقیقت ہے یا وہم؟ میرے ساتھ بھی تو ایسا ہوا۔ علوی فیملی کا حصہ بن کر بھی ان روشنیوں سے مانوس نہ ہو پائی جنہوں نے چمکتے جگنو اور ٹنٹھماتے تاروں کی طرح میرے آس پاس اجالا بکھیر دیا۔ میرے اندر موجود اندھیرا، میری باہر کی دنیا پر بھی اکثر حاوی ہونے لگا۔ بارہا آپ نے، می نے مجھ سے پوچھنا چاہا، مجھے اندھیروں سے نکالنا چاہا پر میں تنہا ہی بھٹکتی رہی، پر اب تھک گئی ہوں میں ضحاک میرا وجود چھلنی ہے، میرے پاؤں آبلہ پانی سے زخمی ہیں۔ مجھے اب سکون چاہیے۔

وہ بول بول کر جیسے ٹڈ حال ہو چکی تھی یا شاید ماضی کی بھولی بھلیوں میں بھٹک کر تھک گئی تھی۔ اس نے ضحاک کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ آنکھیں میچ کر اپنے لب بھینچ کر وہ ضبط کی انتہا پر تھی پر نا کام ہو گئی۔ آنسو ہر بند توڑ بیٹھے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ساکن بیٹھے ضحاک نے اسے چپ کروانے کے بجائے کھل کر رونے دیا۔ وہ چاہتا تھا اسے اپنے ماضی پر جتنے آنسو بہانے ہیں سب آج ہی بہا ڈالے اور پھر آنسو کبھی اس لڑکی کا مقدر نہ بنیں۔ کیونکہ آنسوؤں کا پانی اگر بہہ جائے تو اچھا ہے ورنہ یہ من کے اندر اکٹھا ہو کر ایسی آگ لگاتا ہے کہ انسان کی روح تک جھلس کر رہ جاتی ہے۔ غبار چھٹا تو اب وہ قدرے بہتر حالت میں تھی۔ ضحاک نے پانی کا گلاس اسے تھمایا تو گھونٹ گھونٹ پانی اپنے اندر تارتے ہوئے اس نے ضحاک کی سمت دیکھا۔

”بیٹا ہوا کل، بیٹا ہوا لمحہ، بلکہ کوئی بھی پل واپس نہیں آتا جو بیت گیا سو بیت چلا اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ پر جو بیت رہا ہے اسے تو بہتر بنایا جاسکتا ہے نا؟“ ضحاک کی بات پر اس نے بھیگی پلکوں سے سوالیہ نظریں ضحاک پر ڈالیں۔

”یوں حیران ہونا تمہارا جائز ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تمہاری باتیں سن کر میں بھی دم بخود سا رہ گیا۔ میں مانتا

ہوں جو ہوا بہت غلط ہوا۔ تمہارے ساتھ، تمہاری خواہشوں کے ساتھ زیادتی کر کے تمہارا معصوم بچپن چھین گیا۔ انہوں نے جو غلط کیا اس بات کا انہیں احساس نہیں تو تم احساس جگاؤ۔ وہ ماں باپ کا فرض اگر نہیں نبھائے تو تم بیٹی کا فرض نبھاؤ کیونکہ تم ان کی طرح نہیں سوچتیں یہ ثابت کر کے دکھلاؤ انہیں۔“ ضحاک دھیرے دھیرے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ جو بھلی پلکوں کو اٹھائے ایک تک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو لگتا ہے کہ میں غلط ہوں اور میں ان کے پاس جاؤں سب کچھ بھلا کر ہر زیادتی کو بھول کر۔“ درنجف کا لہجہ کرجی کرجی ہو چکا تھا اور اب تک وہ ان کرجیوں کو سمیٹتے جیتی آئی تھی۔ پر آج صبر کا جام چھلکا تو کرجیاں بھی پکھر چلیں۔

”نہیں میری جان! میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم غلط ہو۔ غلط ان کا رویہ رہا ہے۔ پر غلط کو غلط کہتے رہنے کے بجائے اسے صحیح کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے نا.....“ ضحاک نے اس سے تائید چاہی وہ خاموش نظروں سے زمین پر نہ جانے کیا تلاش کرتی رہی۔ بھی ضرغام کے رونے کی آواز سنائی دی۔

”اچھا چلوئی الحال یہ سب فکریں، یادیں اور ساری باتیں چھوڑ دو، وقتی طور پر ان سب کو بھول جاؤ کیونکہ اس وقت تمہارا یہاں ہونا زیادہ ضروری ہے۔“ ضحاک نے اس کے چہرے کے آگے چنگی بجاتے ہوئے کہا تو وہ مدہم سی مسکراہٹ لیے کھڑی ہو گئی کیونکہ اب ضرغام باقاعدہ گلا پھاڑ کر رونے کا شغل کر رہا تھا۔ جب کہ پیچھے موجود ضحاک اس اداس جانی ہوئی لڑکی کو دیکھتا سوچوں کے دریا میں غوطہ زن ہو چکا تھا۔

☆.....☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آواز سن کر بغل میں سویا ضحاک بھی جاگ اٹھا اور چونک کر درنجف کی جانب دیکھا جس کا وجود پسینہ پسینہ تھا اور ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

”درنجف..... جان..... کیا ہوا.....؟“ اس نے ٹیبل لیپ آن کیا۔

”وہ..... وہ..... وہ میں اکیلی.....“ اس کے لہجے میں انجانا سا ڈر خوف تھا۔ تنہائی کا احساس ہر چیز پر حاوی تھا۔ ضحاک نے پانی کا گلاس اسے تھمایا جسے وہ ایک ہی سانس میں غناغٹ پی گئی۔

”بری چیزیں، سچ یا دوس بھول جانے کے لیے ہوتی ہیں اور اچھے مل ہمیشہ یاد رکھنے کے لیے۔ تم اکیلی نہیں ہو میں ہوں تمہارے ساتھ، ہمارے بچے اور پھر می پاپا بھی تو ہیں تم اکیلی نہیں ہو بس یہ یاد رکھو۔“ وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے دھیرے دھیرے کہنے لگا۔ درنجف نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھیں نینڈوٹنے کے سبب بوجھل تھیں۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”میری وجہ سے آپ پریشان ہوتے ہیں نا؟“ درنجف یونہی لیٹے لیٹے بولی۔

”یہ تو سچ کہا۔“ اس کی آواز میں شرارت نمایاں تھی۔ درنجف نے چہرہ اٹھا کر ضحاک کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کی شرارت سمجھ کر ہلکے سے مسکرا دی تو ضحاک نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر اس میں قید کر لیا۔ درنجف نے بھی آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆

یاسیت بھری راتیں اور مصروفیت بھرے دن گزر رہی رہے تھے۔ درنجف حال میں جیتے ہوئے بھی ماضی میں سانس لیتی تھی۔ ضحاک نے اپنی می کو بھی سب حقیقت بتادی تھی۔ وہ اب پہلے سے بڑھ کر درنجف کا خیال رکھتیں۔ وہ ماضی کا ازالہ تو نہ کر سکتیں تھیں پر وہ اس کے حال میں کوئی کمی رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ دونوں ماں بیٹے

رداؤ ایجنٹ [39] فروری 2016ء

READING
Section

سمیٹ معیث علوی بھی ہمہ وقت اس کی دل جوئی میں لگے رہتے۔ کبھی کبھار اسے لگتا کہ اس کی ماں شاید سوتیلی ہیں۔ بھی تو وہ اور ماؤں کی طرح اپنی بیٹی کی پسند ناپسند اس کی خواہش اس کے خواب کچھ بھی نہ سمجھتی ہیں نہ جانتی ہیں اور نہ ہی اہمیت دیتی ہیں۔ کبھی کبھار اس کا دل چاہتا وہ دنیا کو ہی آگ لگا دے۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ نہ بولنا تھا۔ پر جب وہ بولتی اپنی صفائی میں تو اسے منہ پھٹ اور بد زبان کہہ دیا جاتا، ایسے میں اس کے گلے سے آواز نکلنا بند اور آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو جاتے۔ ایک چیز اس کے اندر گھر کر چکی تھی کہ اس گھر اور یہاں کے لوگوں کے لیے وہ ایک خالی بوجھ اور بے جان سی چیز ہے جس کی نہ کوئی اہمیت ہے، نہ کوئی اوقات اور نہ ہی اس کا اعتبار۔ اس کے دل میں پھوٹا لاوا۔ آتش فشاں بن چکا تھا۔ بغاوت کا ننھا سا پودا تناور درخت بنا چلا گیا۔ سارے خواب پورے ہونے کے لیے نہیں ہوتے پر ساری خواہشات بھی اوصوری رہنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ اس نے جلنا کڑھنا چھوڑ کر بس آنسو بہانا شروع کر دیا تھا اور انہی آنسوؤں سے اپنے دل میں لگے بغاوت، نفرت، بے اعتباری، احساس کمتری کے پودوں کی آبیاری کرتی رہتی۔ وہ ہمہ وقت ایک خول میں قید رہنے لگی تھی۔ بے اعتباری، بے سکونی، بدگمانی اور احساس کمتری کے خول میں خاموش، تنہائی، اداسی، بے اعتباری کبھی مل کر بے تحاشا تھکن، دکھ اور یاس سے دل کو رنجور کر رکھ دیتی۔

☆.....☆

حذیفہ جیل سے فرار ہو گیا تھا اور اب پولیس اسے جگہ جگہ تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے گھر کے حالات کیسے تھے۔ وہ وہاں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی بہ خوبی جانتی تھی۔ ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ عجیب سی بے بسی و اداسی کا شکار تھی۔ مات بہ بات جڑیچہ اپن عود آتا۔ آج کل تو وہ بچوں پر بھی ٹھیک سے توجہ نہیں دے پارہی تھی۔ الغرض وہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھی۔ یہاں تک کہ راتوں کی نیند بھی اس سے منہ موڑ چکی تھی۔

”تمہیں آرام کی نہیں، بلکہ منہ کھولنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی ضرورت ہے کیونکہ سب کچھ اتنی جلدی و آسانی سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔“ ضحاک کافی تھہرے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ درنہجف جو آنکھوں پر بازو رکھے سونے کی کوشش کر رہی تھی بغیر کچھ کہے یونہی لیٹی رہی۔

”زخم دل پر لگے ہوں یا جسم و روح پر، اسے بھرنے میں ٹائم لگتا ہے۔ پر ان کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو زخم بھرتے نہیں۔ بلکہ بگڑ جاتے ہیں۔“ وہ نیم دراز بیٹھا اس پر نظر س جمائے دھیما دھیما بول رہا تھا۔

”ذرا خود بر غور کرو۔ آج کل تم خود بھی اس راستے پر گامزن ہو گئی ہو جس پر تمہاری ای چلی تھیں۔ انہوں نے قسمت کے لکھے کو قبول نہ کیا اور ہمیشہ اپنے درد کا بدلہ تم لوگوں سے لیا۔ اگر اس وقت وہ بجائے خاموش رہنے کے اپنے دل کی بھڑاس نکال دیتیں تو نفرت کی آگ اتنا نہ بھڑکتی اور اب تم بھی خاموش رہ کر وہی سب کچھ دہرا رہی ہو۔ کیا تمہیں بھی مجھ سے میری فیملی سے ہماری شادی اور اب بچوں سے شکایت ہے۔“ ضحاک کی بات پر وہ سوتے سے اٹھ بیٹھی۔

”آپ ایسا..... میرا مطلب ہے آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا؟“ اس کے اندر آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی وہ تو ضحاک کے منہ سے ایسی بات سن کر چونک ہی پڑی تھی۔

”میں اب تک اپنے وجود سے نفرت کرتی آئی تھی لیکن آپ کے آنے سے ہی تو مجھے جینے کے لیے آکسیجن ملی۔ تاریکی سے دور بھاگنے کے لیے محبت کے جگنو ملے۔ ابھی تو میں نیند سے جاگی ہوں ابھی تو آپ کے ساتھ نئے مجھے دنیا کی رنگینیاں دکھلائی ہیں۔ میں بیتے وقت کو بری یادوں کو خ باتوں کو بھول جانا چاہتی ہوں مگر نا کام ہو

جاتی ہوں۔

درنجف نے درو سے پھٹے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”میری جان!“ ضحاک نے درنجف کو بانہوں میں جکڑ لیا۔

”میری ایک بات مانو گی؟“ ضحاک کے سوالیہ انداز پر اس نے اپنا چہرہ اٹھایا اس کی آنکھوں میں سوالیہ

نشان تھا۔

”میں تمہیں یوں روتے تڑپتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ماضی کا تمہارے حال کے رونے کا اثر ہمارے کل پر پڑے۔ اس لیے اپنی انا، اپنی خودداری سب بھول بھال کر تم لب کھول ہی لو۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ انتہائی نرم اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں۔

”کس کے سامنے؟“ درنجف نے استفسار کیا۔

”اپنی فیملی کے سامنے، ہاں درنجف نفرت کی آگ کو بجھانے کے لیے محبت کا نہ سہی احساس کا پانی ہی کافی ہوتا ہے پھر تمہارے ساتھ، تمہارے ہمقدم، تمہاری راہ میں، میں ہوں نا سو پلیز اب ہمت دکھلا دو اور اس لڑائی کو ختم کرنے کی پہلی کوشش تو کر کے دیکھ لو۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں امی ابو کے سامنے ہر بات ہر تظانی پر سوال رکھ دوں؟“ ضحاک کی بات پر

درنجف نے پوچھا۔

”ہاں بالکل اور تمہارے ساتھ تمہارے پاس میں بھی ہوں گا تم نہ اکیلی ہونہ تھا۔“ اس نے اس کی پیشانی پر لب رکھ دیئے تو وہ اندر تک سیراب ہوئی۔

”اپنے لیے نہیں تو ہمارے لیے ہی سہی ایک کوشش۔“ ضحاک کی بات پر اس نے آنکھیں موندتے ہوئے

اثبات میں سر ہلایا۔

”میری جان!“ ضحاک نے فرط محبت سے اسے اپنے گلے سے لگایا جو

اندر سے سراپا آگ تھی

اور باہر سے جلی ہوئی برف

”وہی بیٹی اپنے سرال میں خوش دسر اٹھا کر جیتی ہے جسے اپنے پیچھے میکے کا مضبوط سہارا حاصل ہو۔“ ضحاک

کے ذہن میں مسز عقیدت کی بات گونجی مسز زہت نے بھی اپنے سرال میں آدھی ادھوری سی زندگی جی اور اب

ان کی بیٹی بھی اپنے سرال میں خوش ہوتے ہوئے بھی خوش نہیں رہ پارہی تھی۔

☆.....☆

موسم سرما کی بارشوں کا موسم تھا۔ صبح سے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سردی کی شدت میں یکدم ہی اضافہ ہو

چلا تھا۔ جنوری کا اختتام اور فروری کی شروعات تھیں۔ اس بخ بستہ شام میں درنجف کی اداسی عروج پر تھی۔

عجیب سی بے چینی و وحشت ہی ہونے لگی اور دل کی ویرانیاں حد سے بڑھنے لگیں تو وہ بچوں کو مسز عقیدت کے

حوالے کر کے خود باہر چلی آئی۔ باہر آنے سے پہلے تک اسے خبر نہ تھی کہ اسے کہاں جانا ہے پر اب اس کے

قدم اس منزل کی طرف رواں دواں تھے جہاں سے اس کی شروعات ہوئی تھیں۔ گھر کی فضا میں ایک عجیب

بو جھل پن کا احساس در آیا تھا۔ اداسی اور ویرانی و درو دیوار سے لپٹی بین کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ وہی صحن تھا

جہاں اس کا بچپن بیتا تھا۔ یہ وہی گھر تھا جس کے درو دیوار جوانی میں قید گاہ لگتے۔ وہ خاموشی سے ہر چیز کو تک

رداؤ انجسٹ [41] فروری 2016ء

READING
Section

رہی تھی تبھی اسے کچھ جلنے کی بو آئی اس کے قدم کچن کی سمت بڑھے جہاں کھانا بناتے کتنی بار کبھی ہاتھ جلاتھا۔ تو کبھی گرم تیل کے چھینٹے سے دروے گئے تھے اور کتنی بار اس نے اپنے آنسو نہیں بہائے تھے۔ چوبے پر کبھی چائے کی کیتلی کا پانی جوش پر جوش کھا کر ابل ابل کر نیچے بہ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چولہا بند کیا تبھی اس کی بہن در شہوار چلی آئی۔

”ارے آپنی! آپ اور یہاں..... آپ کب آئیں؟“ وہ اس کے گلگتی خوشی سے بولی۔

”چلیے اندر چلیے۔“ وہ اپنی آپنی کا جواب سے بغیر اس کا ہاتھ پکڑے اسے روم میں لے آئی۔ وہی مشترکہ روم جہاں سب بیٹھ کر کھانا بھی کھاتے اور تبصرے بھی کرتے، جہاں فیصلے بھی کیے جاتے اور وہیں سزائیں بھی نامزد کی جاتیں۔ آج بھی سبھی موجود تھے۔ وہ حیران ہوتے ہوئے سب کو دیکھے گئی۔ اس کے ساتھ کھڑی در شہوار۔ کار پیٹ پر لپ ٹاپ لیے بیٹھا ہریرہ۔

بیڈ پر بیٹھے اس کے ابو شاہنواز لغاری اور الماری کھولے اپنے ارد گرد کپڑوں کا ڈھیر پھیلائے انہیں تہہ کرتیں اس کی ای یعنی نزہت بیگم۔ سب کچھ ویسا ہی تھا پر پھر بھی نہ جانے کیوں در نجف کو کچھ انوکھا، کچھ نیا پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اندر کا موسم باہر کے مناظر پر حاوی تھا اس لیے یا پھر واقعی کچھ الگ تھا۔

”آؤ..... آؤ بیٹا۔“

اس کے ابو نے اسے پکارا تھا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پاس رکھے صوفے پر ٹپک سی گئی۔ ایک پل کو تو وہ بھول ہی گئی وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ اسے کیا کہنا تھا؟ تبھی اس کے ذہن میں خفاک کی باتیں ابھریں تب اس کا ذہن ان لفظوں کو ترتیب دینے لگا جو اس کے لبوں سے ادا ہونے لگے۔

”کیا بات ہے بیٹا؟“ شاہنواز لغاری نے خاموش بیٹھی در نجف سے پوچھا۔

”آئی؟“ تبھی در شہوار نے اسے جھنجھوڑا۔

”آئی اکوئی بات کہنی تھی؟“ در شہوار کے سوال پر اس نے باری باری سب کی جانب دیکھا۔

”ہاں مجھے کچھ کہنا تھا۔ کچھ بہت ضروری اتنا ضروری جو بہت پہلے کہہ دینا چاہیے تھا پر میں خاموش رہی اور خاموشی لے ڈوبی۔“ در نجف کے لب ہلے تھے اور سب ساکن ہو چلے تھے۔

”کہتے ہیں کہ عورت اور مرد از دو واجی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے لازم اور

برابر۔ از دو واجی زندگی کی گاڑی خوشی خوشی چلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ذہنی ہم

آہنگی ہو، تبھی تو وہ اپنی زندگی اور آس پاس کے ماحول کو پرسکون و خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ شادی کسی جنگ کا نہیں

بلکہ ایک خوشگوار تعلق کا نام ہے پر آپ لوگوں نے اسے جنگ بنا دیا۔ قسمت نے آپ دونوں کا ملن ایسے ہی لکھا

تھا۔ پر آپ لوگوں نے اس لکھے کو کبھی قبول نہ کیا۔ ہمیشہ ایک دوسرے کو زیر کرنے میں ہماری تربیت کو ڈھیر کر دیا۔

ہماری شخصیت کے میناروں کو گرا کر اس پر اپنی قسمتوں کا ماتم کرتے رہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا مثالی گھر موجود

نہیں جس میں کوئی اونچ نیچ اور توکار نہ ہوتی ہو پر وہاں ایک سکون، ایک اپنا پن ایک بھر و سا ہوتا ہے۔ جو ہمارے

گھر میں کبھی نہ رہا اور رہتا بھی کیسے؟ آپ لوگوں نے تو کبھی گھر کو گھر جیسا بنایا ہی نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ننھے

ننھے آنسو اتر رہے تھے۔ اس نے ان آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ان سب پر نظر دوڑائی جو کسی صدے کے زیر

اثر تھے اور خاموشی طاری کیے اسے دیکھ رہے تھے جو کہنے کو ان کی بیٹی تھی پر آج اس بیٹی کے روپ میں ان کے

سناٹے آئے رو برود تھا۔ جو انہیں ان کا اصل روپ دکھا رہی تھی۔

”اولاد..... ماں باپ کی پر چھائی ہوتی ہے، ان کا عکس۔ وہ جو بھی سیکھتے ہیں اپنے ماں باپ سے ہی سیکھتے ہیں پر ماں باپ ہی اگر ان پر بھروسہ نہ کریں ان پر یقین نہ کریں انہیں اعتبار نہ دیں تو پھر وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر غیروں میں سہارا اور گھر سے باہر راہ فرار ڈھونڈتے ہیں ایسے میں غلط کون وہ بچے جنہوں نے خود اعتمادی کھو کر احساس کمتری کا شکار ہو کر باہر کی راہ لی یا پھر وہ والدین جنہوں نے اپنی آپس کی لڑائی میں اپنے بچوں پر سے توجہ ہٹا دی۔ آپ دونوں نے اپنے نصیب کی غلطی کی سزا ہمیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے گھر کی بے جا قید سے نکل آ کر باہر کی دنیا میں جینا چاہا تو آپ کو گوارا نہ ہوا۔ پھر حذیفہ نے بھی اپنے لیے دوسری راہ چن لی جس کا انجام اب سامنے ہے۔ جب ماں باپ اپنے بچوں پر اعتبار نہیں کرتے ان کی شخصیت کو سنوارنے کے بجائے بے جا تشدد بے جا پابندیاں عائد کر کے ان کی شخصیت کو مسخ کر دیتے ہیں تو بچے بھی راہ سے بھٹک ہی جاتے ہیں۔ ہر کوئی در نجف نہیں ہوتی جو اس گھٹن میں رو دھو کر چپ ہو جائے۔ میں غلط نہیں تھی میرا اتنا بڑا قصور نہ تھا جتنی سزا دی۔ میں غلط نہیں۔“ اس کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی کیونکہ ممکن آنسوؤں کا گولہ اب کسی پھندے کی مانند اس کے گلے میں اٹکا تھا جب کہ آنسوؤں کی قطار در قطار لڑیاں دونوں آنکھوں سے بہ رہی تھیں۔ بھی اسے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا اس نے سر اٹھا کر بہتی آنکھوں سے دیکھا وہ کوئی اور نہیں اس کی اپنی ماں تھی۔

”معافی بہت ہی چھوٹا لفظ ہے۔ مجھے یہ لفظ کہنے میں دس بار بھی عار محسوس نہیں ہوگی، اس بیٹی کے سامنے جس کے جیتے جاگتے وجود سے ہمیشہ آنکھیں موندھے کھڑی رہی۔ حالانکہ یہ وہی وجود تھا جس نے مجھے بانجھ سے ماں کہلانے کا سکھ دیا۔ جس نے مجھے طعنہ زدہ زندگی سے توجہ دلائی اور میری گود کو بھی ہرا کر کے مجھ پر سوکن جیسا عذاب مسلط ہونے سے بچایا۔ میں ماں ہو کر بھی اپنی اولاد سے غافل رہی۔ انا کی جلتی آگ میں ہمارے بچے بھی جھلس گئے۔ مجھے معاف کر دے میری بچی۔ ہمارا گناہ معافی کے قابل نہیں پھر بھی معاف کر دے۔“ وہ اسے اپنے گلے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رو دین۔ ہر آنکھ اشکبار ہو چلی تھی ماں بیٹی دونوں نے مل کر بے اعتباری کی آگ کو آنسوؤں کے بہتے دریا سے بجھانا شروع کر دیا۔

”ماں باپ، اولاد کو سکھاتے ہیں صحیح غلط کی تمیز بتلاتے ہیں پر ہم وہ نادان ماں باپ ہیں جنہوں نے اولاد جیسی نعمت تو پالی پر اس کی قدر نہ کر سکے۔ آج اولاد نے ماں باپ کو صحیح غلط سکھلا دیا۔“ خاموش بیٹھے شاہنواز لغاری بھی چل کر روتی ہوئی ان دونوں ماں بیٹی کے قریب آئے اور در نجف کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے وہیں اس قدموں کے پاس بیٹھ چلے۔ 48 سالہ مرد بھی آج رو دیا۔ در نجف جھٹ سے صوفے سے اتر کر اپنے باپ کے گلے لگ گئی۔ ماضی کے اندھیرے چھٹنے لگے تھے۔ سالوں سے جی بے اعتباری کی برف کھلنے لگی تھی۔

”اگر وہند چھٹ گئی ہو تو ذرا ادھر بھی نظر گھمالیں۔ ہم بھی موجود ہیں۔“ در شہوار کی آواز پر ان تینوں نے روتی در شہوار اور ہریرہ کی جانب دیکھا جن کے چہروں پر بھی آنسو کے قطرے چمک رہے تھے۔ شاہنواز لغاری نے ہاتھ آگے بڑھا کر ان دونوں کو بھی اپنی طرف بلا دیا۔ وہ دونوں بھاگ کر باپ کی محبت اور ماں کی متا کے حلقے میں قید ہو گئے۔

”ارے واہ! یہاں تو پیار کی برسات ہو رہی ہے اگر اجازت ہو تو میں بھی چلا آؤں؟“ تبھی ضحاک کی آواز نے سب کو چوکا دیا۔ سبھی نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں ضحاک موجود تھا۔

”آؤ..... آؤ بیٹا! تم ادھر آؤ میرے گلے لگو۔“ شاہنواز لغاری نے آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگایا تھا جب کہ ردتی ہوئی درنجف نے بھی اپنے آنسو پونچھ کر حیران حیران نظروں سے ضحاک کو دیکھا تھا۔
”آپ یہاں کیسے؟“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”ارے میری چندا! یہ بھی تو ہمارا بیٹا ہے نا۔“ نزہت بیگم نے مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔ وہ اب تک حیران تھی تبھی ضحاک ہی کو اپنی بیوی پر ترس آیا جس کی آنکھوں میں حیرانگی کی داستان رقم تھی۔
”ارے! کسی نے میری لاڈلی بیوی کو بتایا ہے کہ..... ضحاک نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ درنجف نے سب کی طرف گھوم کر دیکھا ہر چہرے پر وہی دبی دبی مسکراہٹ تھی جب کہ امی کے چہرے پر خوشی۔

”کیا بات ہے کچھ بتانا تھا؟“ درنجف نے اس سے پوچھا۔
”بتا ہے آپنی دولہا بھائی نے ای کو ایک گفٹ دیا ہے۔“ درشہوار نے خوشی سے ہنستے ہوئے بتایا۔
”گفٹ؟“ وہ الجھی الجھی نظروں سے ضحاک کی سمت دیکھے گی۔

”ہاں گفٹ.....! دولہا بھائی نے ای کو انڈیا کا دیزہ لگوا کر دیا ہے۔“ ہریرہ نے جھٹ سے اگلا۔
”کیا؟ سچ میں.....؟“ وہ حیرت و خوشی کی ملی جھلی کیفیت لیے کبھی ضحاک کی طرف دیکھ رہی تھی تو کبھی اپنی ماں کے چہرے کی سمت جہاں خوشی پھوٹ رہی تھی اور مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

”ہاں بیٹا! سچ میں جو کام بہت پہلے مجھے کرنا چاہیے تھا وہ ضحاک نے کیا۔ میرے ذمے کا کام اس نے کر دکھایا۔ نہ صرف تمہاری ماں بلکہ ہم سب کے جانے کا بھی بندوبست کیا ہے۔ یعنی ہم سب تمہارے ننھیال جا رہے ہیں اس مہینے کی 14 کو.....“ شاہنواز صاحب نے اصل حقیقت بتائی تو وہ خوشی کے مارے چیخ اٹھی اور جھٹ سے ماں کے گلے لگ گئی۔

”واؤ، ای! ہم سب انڈیا جا رہے ہیں۔“ اس کے لہجے میں خوشی تھی۔ مسرت تھی۔ صرف اسی کے لہجے میں نہیں بلکہ وہاں موجود ہر شخص کے چہرے پر بھی۔ کیونکہ محبت کے دیئے کی روشن لونے غلط فہمیوں و نظرتوں کے اندھیروں کو چاک کر دیا تھا اور یہ سب ضحاک علوی ہی کی بدولت ممکن ہوا تھا۔ درنجف کی آنکھوں میں تشکر تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھی کہ ضحاک کا شکر یہ ادا کر سکے۔ پر آج ہی تو اس گھر میں خوشیاں لونی تھیں۔ اس لیے یہاں تو گویا جشن کا سماں تھا۔ حذیفہ کی کمی گو کہ سب کو محسوس ہوئی پر غلط صحبت کا انجام غلط ہی تو ہوتا ہے اسے اس کی غلطی کا احساس ہو جائے بس اس کے لیے یہ ہی دعا کی جاسکتی تھی۔ ایک خوشگوار یادگار سادہ گزار کر وہ ضحاک کے ہمراہ ہی رات کو لونی تھی۔ بچوں کی فکر کچھ اس لیے بھی نہ تھی کہ بچے اب بڑے ہو رہے تھے اور داد دادا سے مانوس ہو چکے تھے۔ وہ فیڈر بنا کر ان کی داد مسز عقیدت کو دے کر آئی تھی اور ویسے بھی دونوں بچے سارا دن گمن رہتے، بس رات کو ہی اپنی ماں کے پاس آتے تھے۔ وہ جب اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تو مسز عقیدت کو دونوں بچوں کے ہمراہ لاڈلج میں ہی بیٹھے پایا۔

”سوری می! آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ بچوں نے تنگ تو نہیں کیا؟“ وہ ان کی جانب بڑھی۔
”ارے نہیں بیٹا! ماشاء اللہ میرے بچے بہت سمجھدار اور پیارے ہیں۔“ انہوں نے ممتا سے پر لہجے میں کہا۔
”ویسے تمہیں اتنی دیر لگ گی۔ سب خیریت تو تھی؟“ اس سوال پر درنجف نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر ان کے گال کو چوم لیا۔

”ارے واہ لگتا ہے میری بہو آج بہت خوش ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”صرف آپ کی بہو نہیں۔ آج بیٹی بھی بہت خوش ہے۔ آج اسے وہ مل ہی گیا جس کی بچپن سے اسے طلب تھی۔ آج نہ صرف ماں واپس ملی۔ ان کی متا بلکہ ماں باپ دونوں کا اعتماد بھی۔“ درنجف کے لہجے سے چھلکتی خوشی اس کے خوش ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

”ماشاء اللہ! میری دعا ہے میری بیٹی اور سب بچے یوں ہی خوش اور ہنستے مسکراتے رہیں۔“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”پہلیے می! آپ جا کر آرام کیجیے آپ نے اور پاپا نے ڈنر تو کر لیا تھا نا؟“
 درنجف نے می کی گود سے جلی کو اٹھایا۔ جبکہ ضرغام پاس رکھے کاٹ میں لیٹا ہوا تھا۔
 ”ہاں بیٹا! ضحاک نے فون کر کے ہمیں بتا دیا تھا کہ تم لوگ ڈنر وہیں کرو گے اس لیے میں نے اور تمہارے پاپا نے ڈنر کر لیا۔ اب تم بچوں کو سلا دو یہ بھی نیند میں ہی ہیں۔“ وہ اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے پولیس تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بچوں کو لیے کمرے میں چلی آئی۔ جہاں ضحاک بیڈ پر لیٹا تھا۔ ایک ہاتھ آنکھوں کے اوپر رکھے شاید سونے لگا تھا یا سوچکا تھا۔ اس نے بچوں کو فیڈ کروا کر کاٹ میں سلایا اور خاموشی سے لائٹ آف کر کے ضحاک کے برابر میں آ لیٹی۔

”یہ کتنے اچھے ہیں کتنے آرام سے انہوں نے مجھے میری سب سے بڑی خوشی دے دی اور امی کو ان کی ناممکن ہوتی خواہش اتنا کچھ ہمارے لیے کتنی آسانی سے ممکن بنا دیا۔ مجھے میرے میکمل گیا اور امی کو ان کے میکے جانے کا ٹکٹ۔“ درنجف نے سوچتے ہوئے ضحاک کی سمت دیکھا جو نامعلوم سوچکا تھا یا سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

”ان کو Thanks کہنا تو بنتا ہی ہے۔ آخر اتنا سب انہوں نے میرے لیے ہی میری خوشی ہی کی خاطر تو کیا۔“ وہ سوچتے ہوئے ضحاک کے قریب کھسک آئی۔

”ضحاک سنئے۔“ اس نے اسے پکارا اور جواب نہ دیا۔
 ”کہیں سو تو نہیں گئے۔“ اپنے جواب کی تصدیق کے لیے وہ بیڈ پر سہارا لیے ذرا ترچھی ہو کر ضحاک کے چہرے کی جانب جھکی۔ مخصوص نکلون کی خوشبو درنجف کو اپنی سانسوں کے ذریعے اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”ضحاک۔“ اس نے پھر ہولے سے پکارا۔
 ”جی میری جان۔“ اس نے آنکھیں کھول کر اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔
 ”آپ جاگے ہوئے تھے؟“

”ہاں! کسی کے منہ سے کچھ پیار بھری باتیں جو سنی تھیں۔“ ضحاک نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔
 اسے یکدم شرمندگی نے آگھیرا۔ پورا دن بیت چلا تھا اور اس نے اب تک اس کا شکریہ ادا نہ کیا تھا جس کے سبب اس کی زندگی مکمل ہوئی تھی۔

”ضحاک! میں آپ کا شکریہ.....“

”ہش..... ش..... پلیز میری جان! اب تم شکریہ اور سوری جیسی فارمیٹی میں تو نہ پڑو، تم سے شادی کی تمہیں اپنی شریک سفر بنانا تم میری نصف بہتر ہو پھر بھلا تمہاری خوشی اور دکھ کا خیال مجھے نہیں ہوگا تو کسے ہوگا۔“

ویسے ایک بات بتاؤں۔“ ضحاک لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

”یہ سچ ہے کہ تمہاری ڈسٹر بس کا اثر پہلے گھر اور پھر بچوں پر پڑنا اشارت ہو چکا تھا اور جیسے ہی مجھے تمہاری ڈسٹر بس کی وجہ پتہ چلی اسی دن سے میں کوششوں میں لگ گیا کہ یا تو تمہارے ماضی کا وہ مغلوب حصہ الگ کر دوں یا پھر اسے ٹھیک کر دوں مگر سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو اور تمہاری زندگی میں خالی پن برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور پھر میں نے تمہیں مکمل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالی جس کا رزلٹ تمہاری اداس آنکھوں میں خوشیوں کا چمکنا ہے۔“ ضحاک نے اپنے پاس بیٹھی درنجف کا ہاتھ تھامتے ہوئے لبوں سے لگایا۔

”ضحاک! آپ بہت اچھے ہیں۔“ درنجف نے فرط جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا۔
تشرک آمیز دو ننھے ننھے آنسو اس کی پلکوں کی باڑ توڑ کر گال پر بہہ نکلے جسے ضحاک نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے سمیٹ لیا۔

”دھوپ کی ہوائیں ہو یا کانٹوں کی راہیں۔ پانی کی دیواریں ہوں یا نفرتوں کی فضا میں۔ تمہارے لیے میری محبت کی دنیا ساغر سے بھی گہری اور فلک سے بھی وسیع ہے۔“ محبت کی شدتوں سے چور لہجے میں کہتے ہوئے ضحاک نے اپنے دونوں بازو کر دیئے تو درنجف نے خود کو ان مضبوط و محفوظ حصار میں سوینے میں لہجہ بھی نہ لگایا۔
”آئی ریگی ٹو یو۔“ ضحاک نے اس کے بالوں پر اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے اس کے کانوں کے پاس مدھری سرگوشی کی۔

”ی ٹو۔“ درنجف نے جھکی نظروں سے آہستہ سے کہا۔

میرے ہمسفر تیری نذر ہیں میرے دل کی یہ شدتیں
میرے خواب میری بصارتیں میری دھڑکنیں میری جاہتیں
میرے بروز و شب کے نصاب میں، میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں
تیرا قرض ہے میری زندگی، میری سانسیں تیری امانتیں

ضحاک نے آہستہ سے اس کی گردن کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کر دی۔
”آج کے بعد تم کبھی نہیں روؤ گی۔ نہ کبھی اداس ہو گی۔ مجھ سے وعدہ کرو آئندہ کوئی پریشانی ہو کوئی بھی مسئلہ ہو تم مجھ سے شیئر کرو گی۔“ ضحاک نے اپنی تھیلی پھیلائی جس پر درنجف نے اپنا نازک سا ہاتھ رکھ کر گویا ہای بھر لی ضحاک نے بے خودی سرشاری و محبت سے اس کے نازک ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط کر دی۔ درنجف کے ہونٹوں پر شوخ مسکان حیا بن کر بکھر گئی۔ جسے ضحاک نے بے حد پیار سے دیکھا۔ باہر شاید موسم سرما کی بارش برس رہی تھی۔ پر اندر محبت و چاہت کی نرم گرم ہی پھوار درنجف کے وجود کو بھگور رہی تھی۔
زندگی قسمت کا کھیل ہے اور قسمت صرف موقع ڈھونڈتی ہے اور وہ کب کیسے کس کی زندگی بدل دے کوئی نہیں جان سکتا۔ پر درنجف نے جان لیا تھا کیونکہ قسمت نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اور

محبت نے بہت پیار سے اسے اپنوں سے ملا کر خوش نصیب بنا دیا مہربان محبت نے اپنا فرض نبھایا تھا کیونکہ اب محبت مہربان ہو چکی تھی۔

☆.....

ردا اناجسٹ 46 فروری 2016ء

READING
Section

فاطمہ خان

ناولٹ

محبت جہاں دل کا

رات اپنی مخصوص مہک کے ساتھ اس پہاڑی علاقے پر قطرہ قطرہ اترتی جا رہی تھی۔ پہاڑوں کی خوشبوؤں کے ساتھ بندھی اس وادی کے مکینوں کی اکثریت اس وقت نیند کی وادی میں اتر چکی تھی۔



DIN
Section

ہیں، اس لیے ویرانی اور تہائی بھی یہاں ایک نئے انداز کے ساتھ اپنا رنگ جماتی نظر آتی ہے۔ اس کی منزل اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ خاموشی کے اس عالم میں دریا کا وہ گیت اب اسے بہت واضح انداز میں سنائی دینے لگا تھا۔ دو دریاؤں کے خوب صورت ملاپ سے جو دکش آواز ابھرتی تھی، وہ اسے کسی مغنیہ کے ایسے گیت کی طرح لگتی تھی جسے سن کر انسان کسی اور ہی جہان میں چلا جائے اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ جب وہ پہلی بار اس شہر میں آیا تھا۔ تب اسی آواز نے اس پر ایک سحر طاری کر دیا

ایسے عالم میں وہ اکیلا لے لے ڈگ بھرتا ہوا اپنے مخصوص پہاڑی راستوں سے گزر رہا تھا۔ ان چند ماہ میں یہ تمام راستے اسے ازیر ہو چکے تھے۔ وہ اندھیرے میں بھی ان پرچ راستوں سے بغیر کسی دشواری کے گزر سکتا تھا۔ پہاڑی علاقوں کی راتوں کا مزاج میدانی علاقوں سے بہت مختلف ہوتا ہے، یہاں کی ٹھور اندھیری راتوں میں چھپے اسرار سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جو ان پر اسرار اندھیروں کے ساتھ کچھ وقت گزار چکے ہوں پھر یہاں کے لوگ بھی جلد سو جانے کے عادی ہوتے



READING
Collection

تھا۔ اس کے پاؤں کئی ان دیکھی زنجیروں میں بندھ گئے تھے اور ان زنجیروں کو پہنے وہ خوشبوؤں کے ایسے جہان میں چلا گیا تھا۔ جہاں سے واپسی کا سفر اسے اتنا ہی مشکل لگ رہا تھا مگر اب اس کے پاس واپسی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ رات کے خطرناک قسم کے جنگلی جانور بھی انسانوں کو لقمہ اجل بنانے کے لیے پہاڑوں سے نیچے اتر آتے تھے مگر وہ تو جیسے ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ بہت بے خوفی سے پہاڑوں سے نیچے اتر رہا تھا، ویسے بھی وہ تو ایک انسان کا ڈسا ہوا تھا اور انسان کے ڈسے کو تو خطرناک سے خطرناک جنگلی جانور بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے پورے وجود سے ایک عجیب قسم کی مایوسی پھٹک رہی تھی۔ بالآخر اس کے قدموں کا سفر مکمل ہوا اور دریا کے سامنے آ کر اس کے قدم خاموش ہو گئے۔ دریا کے پانی کے وہ رنگ جو اسے دھنک رنگ جیسے لگتے تھے، اس لمحے وہ تمام دھنک رنگ سیاہ رنگ میں تبدیل ہو چکے تھے، یہ شاید اس کے نصیب کی وہ سیاہی تھی جس نے دریا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ دریا کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی تمام محرومیاں اس کے سامنے کھڑی ہو کر زور زور سے اس کی بے بسی پر تھہرے لگانے لگیں۔ دریا کی وہ دلکش آواز اب ایک المیہ گیت میں ڈھل چکی تھی۔ اس نے سامنے نظر دوڑائی تو دور تک پھیلے بلند و بالا پہاڑ بھی اسے اپنے ساتھ روتے ہوئے نظر آئے۔ وہ پورا علاقہ ہی شاید اس کی ناکام محبت کا ماتم منار ہا تھا۔ ناکامی کا لفظ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ زندگی میں بہت دفعہ اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر ناکامی کے بعد اس کے اپنے اس کے اندر سے مایوسی کے سارے اجزاء نکال دیتے تھے اور وہ پھر سے ایک نئے راستے پر چل پڑتا تھا مگر اس بار کی چوٹ بہت

گہری تھی۔ زخم دینے والے کوئی اور نہیں اس کے اپنے تھے۔ جذباتی تو وہ شروع سے ہی تھا اس لیے ہر بارگی طرح اس بار بھی بدگمانی کی عینک پہن کر ہی سب کو دیکھ رہا تھا۔ منفی سوچیں پوری طرح اس کے دل و دماغ میں پھیل چکی تھیں، وہ کچھ دیر آنسو بہاتا رہا اور پھر ایک بے خودی کے عالم میں اس نے اپنا آپ دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا، صبح سورج کی آمد کے ساتھ ہی اس شہر میں اس کی خبر پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اس کی لاش بھی جلد ہی مل گئی، اس کی موت پر سب سے زیادہ آنسو بھی اسی انسان نے بہائے تھے جس سے وہ سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا۔

وہ شہزادی پچھلے کئی ماہ سے ایک ظالم دیو کی قید میں تھی۔ اپنے شہزادے کا انتظار کرتے کرتے اسے بہت دن بیت چکے تھے۔ اس زندان میں اپنی خوداری اور عزت نفس کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے اسے نہ جانے کتنا وقت ہو چکا تھا۔ اپنی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ وہ شخص روزانہ ہی اس کی عزت نفس کو پامال کرتا اور زبردستی اس سے ایک ایسی بات منوانا چاہتا تھا جو اس کے بس میں نہیں تھی۔ اتنے دنوں میں اسے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شخص کون ہے اور اس کا اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ شاید اسی رشتے کا پاس تھا جو ابھی تک اس کی عزت محفوظ تھی۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک چکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ ایک روز اسی زندان میں وہ اپنی زندگی کی بازی ہار جائے گی، اسے اب انسانوں سے اب خوف آنے لگا تھا۔ اپنی ذہنی حالت بھی اسے اب ٹھیک نہیں لگتی تھی۔ ان تمام دنوں میں وہ بہت کمزور ہو چکی تھی ویسے بھی اسے کھانے پینے اور سونے جانے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، دیکھنے میں وہ ایک زندہ لاش ہی نظر آتی تھی۔ اپنے مسیحا کی آمد کا وہ روز انتظار کرتی تھی مگر وہ بھی لگتا تھا کسی پہاڑی راستے پر اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کہیں کھو گیا ہے۔

اپنے رب کے آگے اس نے کتنے ہی سجدے کر ڈالے تھے مگر رب کائنات کو بھی ابھی اس کا اور امتحان مقصود تھا۔ وہ اس شخص کی منتیں کرتی ہے نہ جانے کون کون سے واسطے دیتی تھی مگر وہ شخص اس کی ہر ایک بات کو ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔ وہ بہت تھک سی گئی تھی اور شاید وہ اس شخص کی بات مان کر اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیتی مگر کاتب تقدیر کو اس پر رحم آ ہی گیا اور ایک روز اس زندان کا دروازہ کھل گیا۔ شہزادی کے آنسوؤں کو سمیٹنے اس کا شہزادہ آن پہنچا تھا، اس کا میاں سے لینے آ گیا تھا۔

☆.....☆

بارش کو پھر چناسی کے ان پہاڑوں پر برسنا ہمیشہ سے بہت پسند تھا، یہی وجہ تھی کہ آئے روز بادلوں کے چند ننھے ننھے مسافر پانی سے بھرے ہوئے شاملن کے ساتھ پہاڑوں کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور پھر بھی کم اور بھی زیادہ پانی کی بوندوں سے اس پورے علاقے کو سیراب کر دیتے تھے، سورج وہاں اپنا رنگ کم ہی جھاتا تھا اور سورج اور بادلوں کی آنکھ پھولی سے اکثر وہاں کے مین محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ اس روز بھی بارش کی چند بوندوں نے ہلکی ہوا کے ساتھ مل کر موسم کو ایک حسین رنگ دے رکھا تھا۔ تمام سیاح بس سے اتر کر اب اپنے اپنے انداز میں اس جگہ کی خوب صورتی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ عمارہ اور حرا بھی ان دلکش نظاروں کو دیکھنے میں محو تھیں۔

”عمارہ! میری ایک تصویر تو بنا دو۔“ حرا نے وہاں موجود ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ایک اور پلیز.....“ اب وہ ایک درخت کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

عمارہ کچھ دیر تو حرا کے ساتھ تصویروں کا یہ کھیل کھیلتی رہی مگر چند تصویریں اتارنے کے بعد وہ حد

درجہ بیزار دکھائی دینے لگی تھی۔

”حرا ڈیڑا! کچھ دیر کے لیے یہ کیمرا ایک طرف رکھ دو، وہ دیکھو سامنے پہاڑیوں لگ رہا ہے جیسے دھنک کے سارے رنگ گرنے لگے ہوں۔ اس خوشبو کو محسوس کرو جو ہمارے دائیں، بائیں، اوپر، نیچے آگے پیچھے محسوس ہے۔“ عمارہ ایک جذب کے عالم میں بول رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ یہ ساری خوشبو اپنے اندر اتار رہی ہو۔

”او کے یار! بس یہ لاسٹ کچر بنا دو، پھر گوتم بدھ کی طرح کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر زردان حاصل کر لینا، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔“

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے حرا کے چہرے پر شرارت کے سات رنگ جمع ہو گئے تھے۔ اس کی طنزیہ مسکراہٹ کو عمارہ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ حرا اب پہاڑ پر بنے ہوئے ایک مزار کے پاس کھڑی تھی اور عمارہ نے اسے نیچے کھڑے ہو کر فوکس کرنا تھا۔

”تھوڑا اور پیچھے جاؤ یار! یہ پیچھے والی پوری پہاڑی نظر آنی چاہیے۔“

حرا کی اس بات پر عمارہ تھوڑی اور پیچھے ہوئی، وہ تصویر اتارنے میں اس قدر محو تھی کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ بالکل کنارے پر کھڑی ہے اور نیچے بہت گہری کھائی ہے، وہ تصویر کا زاویہ درست کر رہی تھی کہ اچانک سے اس کا پاؤں پھسلا کیمرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا اور وہ لڑکھاتی ہوئی نیچے کی طرف گرنے لگی۔ اس سے پہلے کہ زندگی بھی اس کے ہاتھ سے پھسل جانی اچانک سے دو بھاری مضبوط ہاتھوں نے اسے اوپر کی طرف کھینچ لیا۔ یہ سب اس قدر اچانک ہوا تھا کہ کچھ دیر کے لیے عمارہ کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس کے ساتھ یہ ہوا کیا ہے۔ وہ جب حواسوں کی دنیا میں واپس آئی تو دیکھا کہ تمام لوگ اوپر کھڑے اس کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے اور حرا کی تو رورو کر آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں مگر اب وہ سب کے درمیان تھی اور خوش تھی کہ

زندگی اسے دوبارہ مل گئی ہے۔ وہ کئی بار شکر گزار نظروں سے اپنے اس حسن کو دیکھ چکی تھی جس کی جرات اور ہمت کی بدولت وہ سب کے درمیان تھی، ورنہ تو وہ شاید کب کی ان پہاڑوں کے درمیان فنا ہو چکی ہوتی مگر معجزہ رونما ہو چکا تھا اور اسے خراش تک نہیں آئی تھی۔ اس کے حسن کا نام کیپٹن ریان تھا جو اپنی پہلی کے ساتھ وہاں گھومنے کے لیے آیا تھا۔ اس بھوری آنکھوں والے فوجی نے عمارہ کو پہلی ہی نظر میں بہت متاثر کیا تھا اور آنے والے دنوں میں اسے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنا دل ریان کے آگے ہار چکی ہے مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اسی جگہ پر وہ کسی اور کی نظروں کے حصار میں آ چکی ہے اور ان نظروں نے ہمیشہ کے لیے اسے اپنانے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔

☆.....☆

کرنل خاور کے گلشن کے دو ہی پھول تھے جو ان کی کل کائنات تھے۔ ان کی چمکی اور بے رنگ زندگی میں بہار ان کے دونوں بیٹوں ایان اور ریان کے دم سے ہی تھی۔ ان کے دونوں بچے ابھی بہت چھوٹے تھے کہ ایک روز ایک کار حادثے کے نتیجے میں ان کی بیگم انہیں ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئیں۔ اس خوفناک حادثے نے انہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کی بیگم اگر ان کی صرف شریک حیات ہوتیں تو وہ اسے ایک اتفاقی حادثے سمجھ کر کچھ عرصے کے بعد دوبارہ سے اپنی زندگی میں ملن ہو جاتے مگر وہ تو ان کی محبت تھیں اور اپنی محبت کو منوں مٹی تلے دفنانا کوئی آسان کام تھوڑی ہوتا ہے۔ وہ کوئی عام آدمی ہوتے تو اپنی محبت کے زیر اثر شاید اپنے بچوں پر توجہ نہ دے پاتے یا پھر کسی وقتی سہارے کو تلاش کرتے مگر وہ تو ایک فوجی تھے اور فوجی تو بڑے سے بڑے امتحان سے بھی ہنس کر گزر جاتا ہے۔ سوانہوں نے بڑی جرات اور ہمت کے ساتھ

اپنے بچوں کی پرورش کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ بیک وقت اپنے بچوں کے باپ بھی تھے اور ماں بھی اور یہ دونوں کردار وہ بخوبی نبھارے تھے۔ ریان ان کا بڑا بیٹا تھا اور اپنی ماں کی طرح سمجھدار اور انتہائی ذمہ دارانہ شخصیت کا مالک تھا۔ جب کہ اس کے مقابلے میں ایان انتہائی لاپرواہ اور شرارتی ذہن کا مالک تھا۔ ریان کا تعلیمی ریکارڈ انتہائی شاندار تھا۔ اس کی طرف سے انہیں کبھی کوئی شکایت نہیں ملی تھی بلکہ اس کے اسکول اور پھر کالج میں انہیں ہمیشہ ایک خاص اہمیت ملتی تھی۔ اپنے بیٹے کی تعریفیں سن کر ان کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا مگر انہی اداروں میں اساتذہ کی زبانی جب وہ ایان کی شکایات سنتے تھے تو انہیں شدید قسم کی شرمندگی محسوس ہوتی تھی اگر وہ شکایات صرف ہوتیں پڑھائی کے حوالے سے ہوتیں تو انہیں اتنی شرمندگی نہ ہوتی مگر اکثر شکایات اس کے کردار اور بدتمیزیوں کے حوالے سے ہوتی تھیں جن کا نشانہ اس کے ساتھی طلباء اور اساتذہ بنتے رہتے تھے۔ کرنل خاور اب اس پر بہت سختی کرنے لگے تھے مگر وہ کسی کی سنتا کب تھا۔ ریان ایسے موقعوں پر اکثر اپنے بھائی کی ڈھال بن جایا کرتا تھا۔ ایان کی بدتمیزیاں صرف اس کے تعلیمی اداروں تک محدود نہیں تھیں۔ بلکہ وہ ریان کے ساتھ بھی بہت بدتمیزی سے بات کیا کرتا تھا۔ ان دونوں کی عمروں میں دو ہی سال کا فرق تھا اور ایان کی نظر میں یہ فرق کوئی فرق نہیں تھا۔ ریان اپنے بھائی کی ہر بدتمیزی کو ہنس کر سہہ جاتا تھا اور کرنل خاور کو بھی صبر کی تلقین کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ایان کا رویہ خود ہی بہتر ہو جائے گا مگر افسوس ایسا نہیں ہو سکا، وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا اور کرنل خاور کے گلشن کے یہ دونوں پھول اسکول کی دنیا سے نکل کر اب کالج کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے لگے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بچے ان ہی کی طرح فوج میں شامل ہوں۔ ریان نے اپنی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

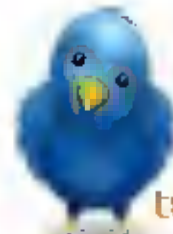
WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

گر بچویشن مکمل کرنے کے بعد فوج میں کمیشن حاصل کر لیا تھا اور اب وہ ایک کمیشنڈ آفیسر تھا، جب کہ ایان فوج میں بھرتی کے لیے ابتدائی ٹیسٹ ہی پاس نہیں کر سکا تھا۔ اس نے دو سے تین بار کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔ وہ بے نا کامیوں نے اس کے مزاج پر بہت برا اثر ڈالا تھا، وہ اپنی ہر ناکامی کا ذمہ دار اپنے بھائی کو سمجھتا تھا۔ بھائی سے نفرت کا معمولی بیج اب ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ کرنل خاور نے اس کا داخلہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں کروا دیا تھا مگر اب اسے پڑھائی سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ ریان جو اب کشمیر میں پوسٹڈ تھا۔ اس نے کچھ عرصے کے لیے ایان کو اپنے پاس بلا لیا تاکہ اس کے مزاج کی کئی کچھ کم ہو سکے وہ تو اپنے والد کو بھی اپنے پاس بلانا چاہتا تھا مگر وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا آبائی شہر چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ ویسے بھی انہوں نے اپنے آبائی شہر کو ہاٹ میں ایک اسکول کھولا تھا اور وہ تمام تر توجہ اب اپنے اسکول کو دینا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اب ریان کے سر پر سہرا سجا دیکھیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے دوست کی بیٹی کو پسند کر چکے تھے۔ بس انہیں ریان کی رضامندی کا انتظار تھا انہیں امید تھی کہ ان کا فرمانبردار بیٹا اس معاملے میں بھی ان کی پسند پر اپنا سر جھکا دے گا۔ مظفر آباد آ کر ایان کے مزاج پر بہت اچھا اثر پڑا تھا۔ اسی لیے ریان اسے اپنے ساتھ لے کر پیر چناسی کے پہاڑوں پر چلا گیا تھا، جہاں پر ایک حادثے کے نتیجے میں عمارہ ان کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور عمارہ کے آنے کے بعد ان سب کی زندگی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔

☆.....☆

عمارہ کو پہاڑوں سے عشق تھا۔ اسی لیے وہ سال میں دو مرتبہ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر پہاڑوں سے ملنے ضرور آتی تھی۔ ان پہاڑوں سے اس کی

دوستی بہت پرانی تھی۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس کے بابا اسے اور اس کی مہی کو لے کر پہاڑوں پر کچھ وقت گزارنے آئے تھے تب پہلی بار اس نے پہاڑوں کی سرگوشیوں کو محسوس کیا تھا۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کو بہت قریب سے سنا تھا۔ بارش کے قطرے کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر پہاڑوں سے باتیں کی تھیں، پہاڑوں کے ساتھ ہنستے مسکراتے اس نے اپنا ہاتھ دوستی کے لیے پہاڑوں کی طرف بڑھا دیا تھا اور اسے یوں لگا کہ پہاڑوں نے بھی مسکرا کر اس کی دوستی کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا۔ اپنے شہر واپس آ کر وہ کتنے ہی دن اپنے بابا سے ان بلند یوں پر دوبارہ جانے کی ضد کرتی رہی تھی اور ان دنوں تو اس نے ان کو سہاروں کے قریب ہی ایک خوب صورت سا گھر بنانے کی اپنے بابا سے فرمائش بھی کر دی تھی۔ اس کے بابا اسے ہر سال کو سہاروں کے پاس لے جاتے تھے مگر اس کی گھر والی خواہش کو انہوں نے کبھی پورا نہیں کیا۔ اس کے بابا ڈاکٹر شہر کے ایک معروف ڈاکٹر تھے۔ جب کہ اس کی والدہ ڈاکٹر حلیمہ کا شمار بھی انتہائی قابل ڈاکٹرز میں کیا جاتا تھا۔ اپنے والدین کی ہی خواہش پر اس نے میڈیکل پروفیشن کا انتخاب کیا تھا، اب وہ میڈیکل کے چوتھے سال میں تھی، میڈیکل کی سخت پڑھائی نے بھی اس کے سیر و سیاحت کے شوق کو کم نہیں کیا تھا، اس لیے وہ اکثر چھٹیوں میں اپنی کسی نہ کسی دوست کو لے کر پہاڑوں سے ملنے پہنچ جاتی تھی۔ اس روز بھی وہ اپنی ایک دوست کو لے کر کشمیر کے خوب صورت پہاڑی مقام پیر چناسی کو دیکھنے پہنچ گئی تھی۔ یہاں وہ پہلے بھی آچکی تھی مگر ہر بار یہ پہاڑی راستے اسے نئے نئے سے لگتے تھے۔ اس کے ساتھ پہلے بھی کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا مگر ان پہاڑوں پر نہ جانے کیسے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ کمپین ریان کی بروقت مدد سے اس کی زندگی اسے واپس مل گئی تھی۔

اس حادثے سے وہ کچھ خوفزدہ تو ضرور ہوئی تھی مگر کسی کی جرأت و ہمت نے اسے بہت متاثر بھی کیا تھا۔ کچھ دن بعد وہ اور حرا واپس جا رہی تھیں مگر اس بار واپسی کا سفر بہت خوب صورت تھا۔ تمام رستے ایک خوب صورت انسان کا خیال اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور ان پہاڑوں کو الوداع کہتے ہوئے اس نے ہنستے مسکراتے محبت کی حسین وادی میں قدم رکھ دیا۔

☆.....☆

اپنے خوابوں کو کبھی کہہ نہ سکا تھا تم سے ان کو چپ چاپ لگا ہوں میں چھپا لیتا تھا عمر بھر جو کبھی آباد بھی نہ ہو شاید اب وہ لڑکا تو تمہیں یاد بھی نہ ہو شاید ایان نے غزل کھل کر کے اپنی ڈائری بند کر کے رکھ دی اور گلاس وینڈو سے باہر ہونے والی بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ اب اسے اس من موئی صورت والی اپسرا کا سراغ لگانا تھا جس نے پہلی ہی نظر میں اسے اپنا اسپر بنا لیا تھا۔

ڈاکٹر یوسف کا شمار شہر کے انتہائی قابل باہر امراض دل میں ہوتا تھا۔ وہ روزانہ کتنے ہی آپریشنز کرتے تھے۔ ان کی اپنی صحت قابل رشک تھی اور کوئی خاص بیماری بھی نہیں تھی مگر ایک روز جب وہ آپریشن تھیٹر سے باہر آئے تو اچانک سے انہیں اپنے سینے میں شدید قسم کے درد کا احساس ہوا۔ وہ اس مرض کے ماہر تھے اس لیے فوراً سے پہلے اپنی بیماری سمجھ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی دوا لیتے انہیں دو تین شدید قسم کے درد کے جھٹکے محسوس ہوئے اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ انہیں ایمر جنسی میں شفٹ کر دیا گیا۔ عمارہ جسے کشمیر سے واپس آئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے یہ خبر سنتے ہی وہ شدید پریشانی کے عالم میں اسپتال کی طرف بھاگی تھی۔ یہی حال ڈاکٹر حلیمہ کا بھی تھا۔ ڈاکٹر یوسف کی حالت ٹھیک نہیں تھی، ڈاکٹر زان کی زندگی بچانے کی کوششوں میں مصروف

تھے۔ اسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان جنگ لڑتے ہوئے ڈاکٹر یوسف کو دو دن ہو چکے تھے۔ انہیں ہوش تو آ گیا تھا مگر ابھی بھی ڈاکٹر زان کے حوالے سے زیادہ پرامید نہیں تھے۔ عمارہ کمزوروں کی مالک نہیں تھی مگر اپنے بابا کی بیماری نے اسے دو دنوں میں نڈھال کر دیا تھا۔ اس روز بھی عمارہ ایمر جنسی روم کے باہر بچھے بیچ پر بیٹھی اپنے بابا کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی کہ اچانک اس نے کیپٹن ریان کو شعبہ ایمر جنسی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کے بابا کے ایک دوست بھی تھے جو ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ان کے گھر مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے تھے۔ اسپتال کے شعبہ ایمر جنسی میں روزانہ کتنے ہی لوگ آتے ہیں۔ اس لیے اس کا یوں اچانک شعبہ ایمر جنسی میں آنا کوئی اچھے کی بات نہیں تھی۔ حیرت کا جھٹکا عمارہ کو تباہ لگا جب ریان اور اس کے ساتھ آنے والے اپنے بابا کے دوست کو اس نے اپنی والدہ کے ساتھ اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی کہ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر حلیمہ باہر آ کر اسے اپنے ساتھ لیے اندر کمرے میں آگئیں۔ اس کمرے میں اپنے والد کو اس طرح مشینوں کے زیر اثر لیٹے ہوئے دیکھ کر درو کی ایک شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر حلیمہ نے اسے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے والد ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا رہے ہیں، وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھتی ہوئی زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اپنے والد کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ ان کے قریب ہو کر ان کی بات غور سے سننے کی کوشش کرنے لگی۔

”عمارہ بیٹا! میری حالت اچھی نہیں ہے، کوئی پتا

روز پہلے تو ریان اپنے والد کرنل خاور کے حکم پر کراچی چلا گیا تھا۔ وہ تو ایان کو بھی اپنے ساتھ لے کر جانا چاہ رہا تھا مگر ایان ابھی فی الحال اس خوب صورت شہر کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا، اس لیے اس نے جانے سے معذرت کر لی تھی۔ بلکہ اسے اکیلے رہنے میں زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ وون نے اس نے بہت سکون سے گزارے تھے مگر تیسرے دن فون پر ریان کے ایمر جنسی میں نکاح کی خبر سن کر اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ اپنے والد کی زبانی نکاح کی تمام تفصیلات سن کر اسے کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی تھی، ویسے بھی اسے ریان اور اس کی منکوحہ کے ذکر سے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی، اس لیے اس نے رسمی طور پر مبارک باد دے کر فون بند کر دیا، وہ اب جلد از جلد اس لڑکی تک پہنچنا چاہتا تھا جس نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ وہ اس لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے موبائل پر اس کی کچھ تصویریں بھی اتار لی تھیں۔ جنہیں وہ دن رات دیکھتا رہتا تھا۔ ایان نے اپنے اور اس لڑکی کے حوالے سے ڈھیروں خوشنما سے خواب دیکھ لیے تھے۔ ریان کے آنے سے پہلے اس نے اس لڑکی کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اب اسے کسی طریقے سے اس لڑکی سے رابطہ کرنا تھا مگر ریان کے واپس آتے ہی ایک ول ہلا دینے والا انکشاف اس کا منتظر تھا۔

☆.....☆

کراچی ریان احمد کے لیے بالکل ایک اجنبی شہر تھا مگر اجنبی شہروں سے انسان کو مانوس ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا، ہاں اگر ہمسفر اجنبی ہو تو پھر ول کو پہنچنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ اسے وہ لڑکی اچھی طرح یاد تھی، جسے بچپن کے لیے اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی، اس وقت بھی اس کے ول میں اس لڑکی کی مدد کے علاوہ کوئی اور جذبہ کار فرما

نہیں اس سرجری کے بعد میں زندہ بھی رہ پاؤں یا نہیں، یہ میرے بچپن کے دوست کرنل خاور ہیں، تم انہیں جانتی ہو، یہ کچھ ماہ پہلے بہت سالوں بعد مجھے حادثاتی طور پر ملے تھے، انہوں نے اپنے بیٹے ایان کے لیے تمہارا رشتہ مانگا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ابھی میرے سامنے تم دونوں کا نکاح ہو جائے، اپنے مرتے ہوئے باپ کی اس خواہش کو تم پورا کرو گی؟“ ابھی ڈاکٹر یوسف کچھ اور بھی کہنے والے تھے مگر عمارہ نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے اپنا سراپا میں ہلا دیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈاکٹر یوسف کی ہتھیلیوں پر گرتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر حلیمہ نے آگے بڑھ کر اسے خود سے قریب کر لیا، کرنل خاور اور ریان کی آنکھوں میں بھی یہ منظر دیکھ کر نمی ٹھکنے لگی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں نکاح خواں اور کچھ گواہان کا انتظام کیا گیا اور اسپتال کے اسی کمرے میں ڈاکٹر یوسف کے سامنے عمارہ کو کیپٹن ریان احمد کے نکاح میں دے دیا گیا۔ ڈاکٹر یوسف بھی شاید جان گئے تھے کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے فریضے سے سبکدوش ہونا ضروری سمجھا، ان کے دل کا آپریشن کیا گیا مگر آپریشن کے دوران ہی وہ زندگی کی بازی ہار گئے، ان کی موت عمارہ اور ڈاکٹر حلیمہ کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ایسے میں کرنل خاور اور ریان نے انہیں بہت سہارا دیا۔ تب عمارہ کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر یوسف نے اس کے حق میں کتنا حق اور بروقت فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے کے مثبت اثرات تھوڑے ہی عرصے بعد اس پر ظاہر ہونے لگے تھے۔

☆.....☆

مظفر آباد کے خوب صورت موسم اور دلکش نظاروں نے ایان احمد کے اندر کی اواسیوں کو بہت حد تک کم کر دیا تھا اور اب تو کسی کی محبت کی ہلکی پھوار نے اس کی روح تک کو سرشار کر دیا تھا۔ ابھی تین

نہیں تھا اور اب بھی صرف یہی ایک احساس دامن گیر تھا کہ اسے اپنے بابا کی خواہش پوری کرنی ہے۔ اس کے بابا جان نے محض ایک فون کال پر اس کی مدد مانگی اور اس نے فوراً سے پہلے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ ہمسفر کے روپ میں اسی ڈیری سبھی لڑکی کو دیکھ کر ایک خوشگوار قسم کی حیرت ہوئی تھی۔ عمارہ اس کے بابا کی پسند تھی اور اپنے بابا کی پسند سے دل و جان سے قبول تھی۔ ریان کے نکاح کے محض ایک دن بعد ڈاکٹر یوسف کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر یوسف پہلے صرف اس کے بابا کے دوست تھے مگر اب یہ دوستی رشتہ داری میں بدل گئی تھی اس لیے ان کی موت کے بعد تدفین تک کے تمام تر انتظامات انہوں نے ہی سنبھالے تھے۔ ریان نے صحیح معنوں میں ان کے بیٹے ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ صدموں سے پچو عمارہ اور ڈاکٹر حلیمہ کو بھی دینی دونوں زندگی کی طرف واپس لا رہے تھے۔ ریان حیران تھا کہ نکاح کے محض چند یولوں میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ اب اس لڑکی کے آنسو اسے اپنے دل پر گرتے محسوس ہونے لگے تھے۔ کسی کا دکھ اس کے اندر کی دنیا کو بھی اداس کر رہا تھا۔ اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ اب اسے کشمیر واپس جانا تھا۔ کرنل خادرو عمارہ کو بھی اس کے ساتھ بھیجنا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر حلیمہ ابھی عدت میں تھیں۔ اس لیے رخصتی کے لیے عدت کے بعد کا وقت رکھا گیا تھا۔ ریان کو پہلی بار کشمیر اکیلے جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ددبھنگی بھنگی آنکھیں اسے اپنے ساتھ جاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ جاتے سے کسی کی ہلکی سی مسکراہٹ نے جیسے اسے اقرار کی ڈور تھما دی تھی۔ وہ بہت خوش تھا اور مستقبل کے حوالے سے ڈھیروں خواب اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ اس کے پاس ایان کو سنانے کے لیے ڈھیر ساری باتیں تھیں۔ اس نے عمارہ کی ایک تصویر بھی اپنے موبائل میں محفوظ کر لی تھی، اب اسی تصویر کو دیکھ کر اس نے یہ چند

باہ گزرنے تھے، یہی تصویر اس نے ایان کو بھی دکھانی تھی اسے امید تھی کہ ریان کو بھی معصوم سی شکل و صورت والی انہی بھالی بہت پسند آئے گی۔ انہی سوچوں میں کم مستقبل کے تانے بانے بننا وہ منظر آباد پہنچ گیا۔ جہاں ایان نے انتہائی سرد مہری سے اس کا استقبال کیا وہ ایان کے ایسے رویے کا عادی تھا، اس لیے اس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا اور پہنچتے ہی اسے اس ایمر جنسی شادی اور یوسف انکل کی اچانک وفات کا بتانے لگا مگر ایان کی بیزاری اس کے پورے وجود سے عیاں تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان ساری باتوں سے اسے بہت کوفت ہو رہی ہو، باتوں ہی باتوں میں ریان نے اپنا موبائل نکالا اور عمارہ کی تصویر نکال کر ایان کی نظروں کے سامنے کر دی تصویر دیکھ کر ایان کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ساکت آنکھوں سے ریان کی عمارہ کے متعلق تمام گفتگو سن رہا تھا۔ ایان تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایان کتنی ہی دیر سر کو پکڑے بیٹھا رہا۔ اپنے بھائی کے لیے اس کے دل میں جو تھوڑی بہت محبت تھی۔ اس انکشاف کے بعد تو جیسے وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ زندگی نے اس کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے باپ اور بھائی نے جان بوجھ کر اس کی محبت کو اس سے چھین لیا ہے۔ اسے ہر حال میں اپنی اس محبت کو پانا اور اپنے بھائی کو اس حرکت کا مزہ چکھانا تھا۔ اس رات وہ کئی اشتغالی کارروائیوں پر غور کرتا رہا، اگلی صبح اس نے ریان سے اجازت لی کہ اب وہ واپس جانا چاہتا ہے۔ ریان اسے اپنے پاس مزید کچھ دن رکھنا چاہتا تھا مگر اس کی ضد کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اسے واپس جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اپنے والد کے پاس نہیں جا رہا تھا۔ اس کی منزل اب کچھ اور تھی۔ اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ کر وہ اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہر گیا تھا اور اب

اسے اپنے دوست کے ساتھ مل کر اپنے منصوبے کو حتمی شکل دینی تھی۔

ریان عمارہ کی زندگی میں حادثاتی طور پر ضرور شامل ہوا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی محبت نے عمارہ کے دل میں پہلے سے ہی اپنی جگہ بنائی تھی۔ وہ جو اپنی محبت کو پانے کے خواب دیکھنے میں مصروف تھی۔ یوں اچانک سے محبت اس کی جھولی میں آن کرے گی۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے اس غم سے باہر نکلی تو اسے احساس ہوا کہ قدرت نے اس پر کس قدر مہربانی کی ہے۔ وہ ان خوش قسمت ترین لوگوں میں شامل ہو گئی ہے جن کا نصیب ان کی محبت کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے وہ شدت سے اب اس دن کی منتظر تھی جس دن ریان احمد اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ پہاڑوں پر لے جائے گا۔ ریان احمد کے حوالے سے بچانے کیسے کیسے خواب اس کی پلکوں پر آ کر ٹھہر گئے تھے۔ اب جب کہ ڈاکٹر حلیمہ کی عدت ختم ہونے والی تھی اس لیے انہوں نے کرنل خاور سے باقاعدہ طور پر رخصتی کی بات کی تھی۔ طے یہی ہوا تھا کہ ان کی عدت ختم ہونے کے ایک ہفتے بعد ریان چھٹی پر آئے گا اور تب ایک ساوہ سی تقریب میں چند افراد کی موجودگی میں عمارہ کو ریان کے سنگ رخصت کر دیا جائے گا۔ عمارہ کو رخصت کرنے کے بعد ڈاکٹر حلیمہ کا ارادہ بیرون ملک جا کر اپنے شعبے سے متعلق چند کورسز کرنے کا تھا، ویسے بھی کینیڈا میں ان کی بہن رہتی تھیں اور ان حالات میں وہ کسی اپنے کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھیں۔ عمارہ کی تو خواہش تھی کہ وہ اب اس کے اور ریان کے ساتھ رہیں مگر ڈاکٹر حلیمہ اپنی بیٹی پر کسی قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتیں تھیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک نہایت سوشل قسم کی خاتون تھیں مگر اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ اس غم سے اب باہر نکلنا

چاہتی تھیں۔ اس کا واحد طریقہ یہی تھا کہ وہ خود کو بہت زیادہ مصروف کر لیں۔ ڈاکٹر حلیمہ کے ہی کہنے پر عمارہ نے اپنی چند دوستوں کے ساتھ مل کر اپنی شادی کے لیے کچھ خریداری کی تھی، اپنی آنے والی زندگی کے حوالے سے اسے کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا بلکہ وہ خوش تھی کہ وہ ایک بہت خوب صورت دل رکھنے والے انسان کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے جا رہی ہے۔ ایان اب اس کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں دنیا کے سب سے خوب صورت رشتے میں بندھ چکے تھے۔ ریان باقاعدگی سے اسے فون کرتا تھا۔ اس سے بات کر کے عمارہ کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ صرف ظاہری طور پر نہیں بلکہ باطنی طور پر بھی ایک بہت اچھا انسان تھا۔ اس روز بھی ریان کی پسند کی کچھ چیزیں خرید کر وہ واپس گھر کی طرف جا رہی تھی ابھی اس نے اپنی گاڑی اشارت کی تھی کہ اچانک سے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا، کچھ ہی دیر میں وہ بے ہوش ہو گئی، اس کے بعد اسے نہیں پتا چلا کہ اس نے کتنا طویل سفر طے کیا تھا، جب اس کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک کمرے میں بند پایا، تب اسے معلوم ہوا کہ وہ اغوا کی جا چکی ہے۔ ہر تکلیف اور پریشانی ہمارے وجود کو اندر سے کسی نہ کسی حد تک توڑتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی پریشانیوں اور تکلیفوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کا اختتام بالآخر ہمارے پورے وجود کی تباہی پر ہوتا ہے، ڈاکٹر حلیمہ کی اچانک موت سے ریان کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ کیسے غموں کے یہ پہاڑ لہجوں میں مضبوط سے مضبوط انسان کو مٹی کی ڈھیری میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حلیمہ ابھی اپنے شوہر کی موت کے صدمے سے باہر نکلنے کی کوششوں میں مصروف تھیں کہ اچانک سے عمارہ کے اغوا کی خبر نے ان کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ ریان، کرنل خاور کے کہنے پر انہیں اپنے

اپنی ذہانت اور اچھے رویے کے باعث سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ ایان اسے دیکھ کر سوائے جلنے اور کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا اور پھر فوج میں کمیشن حاصل کرنے کے بعد تو وہ ہر کسی کا منظور نظر بن گیا۔ ایسے میں ایان کے دل میں نفرت کا پتہ نہ تھا۔ جذبہ تھوڑا اور جوان ہو گیا تھا۔ عمارہ، ریان کی بیوی ہے یہ انکشاف ایان کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اپنی محبت کو پانے کے لیے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ عمارہ سے زبردستی اپنی بات منوالے۔ اس مقصد کے لیے وہ کراچی گیا اور اپنے ایک دوست کی مدد سے عمارہ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لیں اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا اور پھر وہ وقت آیا ہی گیا، جب وہ عمارہ کو اغوا کر کے کشمیر لے آیا اسے لگتا تھا کہ وہ زور زبردستی سے عمارہ سے طلاق کے کاغذات پر دستخط کروا کر اس سے نکاح کر لے گا مگر عمارہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر ایان کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بہت کمزور ہو گئی تھی مگر ایان کے لیے سوائے نفرت اور غصے کے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ انہی دنوں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایان نے جب یہ خبر عمارہ کو سنائی تو عمارہ کو لگا جیسے کسی نے کھولتا ہوا گرم پانی اس کے اوپر انڈیل دیا ہو۔ کمزور تو وہ پہلے ہی بہت ہو چکی تھی۔ اس خبر کے بعد اسے لگا کہ جو تھوڑی بہت سانسیں اس کے وجود کے اندر باقی رہ گئیں ہیں وہ بھی اب باہر نکل جائیں گی۔ اس کے اندر موجود مزاحمت بھی اب دم توڑ چکی تھی۔ وہ بہت خاموش رہنے لگی تھی اور ایک روز جب ایان نے اپنا پرانا مطالبہ دہرایا تو اس نے سر جھکا دیا۔ ایان بہت خوش تھا اسے لگ رہا تھا اب وادی میں موجود خزاں رسیدہ لحوں میں بہا رہنے دستک دینی شروع کر دی ہے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆.....☆

پاس لے آیا تھا مگر ان کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آ رہی تھی۔ عمارہ کو تلاش کرنے کے لیے کرنل خاور اور ریان نے اپنے تمام ذرائع استعمال کیے تھے مگر اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ ایان نے بھی اس موقع پر ان دونوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر عمارہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ایان نے جس طرح عمارہ کی تلاش میں ان دونوں کی مدد کی تھی۔ اس سے کرنل خاور کے دل میں اپنے بیٹے سے متعلق جو شکوے شکایات تھے وہ ختم ہو گئے تھے۔ انہیں خوشی تھی کہ ان کے بیٹے نے ان کے دکھ کو محسوس کیا ہے۔ عمارہ کے اغوا کے ٹھیک ایک ماہ بعد ایک روز اچانک ہی سوتے میں ڈاکٹر حلیمہ کا دل بند ہو گیا اور وہ اپنی بیٹی کا غم لے کر اس دنیا سے چلی گئیں۔ ان کی موت نے ان کے سبھی ملنے جلنے والوں اور دوستوں کو افسردہ کر دیا تھا۔ ریان کو اب ہر حالت میں عمارہ کو تلاش کرنا تھا۔ اب یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔

☆.....☆

منظر آباد سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر لیپا کی خوب صورت وادی ہے۔ جس کے دلکش نظاروں کو دیکھ کر جنت کا گمان ہوتا ہے۔ ایان نے عمارہ کے لیے اس جنت کی ایک پہاڑی پر چھوٹی سی دورخ بنا رکھی تھی۔ جہاں وہ جب بھی آتا تھا اسے ذہنی اور جسمانی طور پر بہت بری طرح تشدد کا نشانہ بنانا تھا۔ عمارہ اسے بہت اچھی لگتی تھی اور وہ تو بچپن سے ہی ایسا تھا جو چیز پسند آ جاتی تھی اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے ہی رہتا تھا۔ اسے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت اپنے بھائی سے تھی۔ اسے لگتا تھا ریان ہر جگہ ہر کسی سے اس کے حصے کی محبت چھین لیتا تھا۔ وہ اپنے بابا اور اساتذہ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہر بار کچھ نہ کچھ الٹا سیدھا کرنا رہتا تھا۔ جس سے اسے توجہ تو مل جاتی تھی مگر اس کی شخصیت کا محض منفی تاثر ہی قائم رہ پاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ریان محض

حزہ بلال، کرنل خاور کے اسکول کا ایک انتہائی ذہین طالب علم تھا۔ اس کی اسکول کی تعلیم اب مکمل ہونے ہی والی تھی۔ انہیں امید تھی کہ وہ کالج جا کر بھی ان کے ادارے کا نام روشن کرے گا۔ اب کی بار وہ چھٹیوں کے بعد واپس آیا تو انہیں کچھ پریشان سا لگا۔ وہ حزہ کو اپنے اسکول کا بہت بڑا اثاثہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انتہائی پریشانی کے باوجود وہ حزہ سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکے۔ جواب میں حزہ نے انہیں ایک بہت عجیب بات بتائی جسے سن کر وہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔ حزہ نے انہیں بتایا تھا کہ اب کی بار جب وہ گھر گیا تو ان کے گھر سے چند کوس کے فاصلے پر واقع ایک خالی مکان میں کوئی رہنے کے لیے آ گیا تھا مگر عجیب بات یہ تھی۔ وہ جب بھی اس گھر کے پاس سے گزرتا وہاں سے رونے کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ عجیب سی درد بھری سسکیاں تھیں جو اسے بہت بے چین رکھنے لگی تھیں۔ گھر کے باہر سخت قسم کا پھرہ تھا جس کے ہوتے ہوئے حزہ کا اندر جانا بہت مشکل تھا۔ مگر اتنا اسے احساس ہو گیا تھا کہ اندر موجود لڑکی کسی مشکل میں ہے۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر یہ مدد کیسے ہوگی؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا، اسی دوران اس کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وہ اپنے ادارے میں واپس تو آ گیا تھا مگر وہ آوازیں اسے سونے نہیں دیتی تھیں۔ کرنل خاور کو یہ سب سن کر دکھ تو بہت ہوا تھا مگر ساتھ میں حزہ پر فخر بھی محسوس ہو رہا تھا جو کسی کے دکھ کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ حزہ کی ہر طرح کی مدد کے لیے تیار تھے کہ شاید اس طرح اس کی پریشانی کم ہو جائے مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ساتھ پوکیس اور فورسز کے کچھ لوگوں کو لے کر جائیں، پہلے اپنے ایک دوست کے ذریعے انہوں نے حزہ کی بات کی تحقیق کروائی تو پتا چلا کہ حزہ کی کہی ہوئی بات میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور تھی۔ اس جگہ پر واقعی میں

کوئی لڑکی مشکل میں ہے۔ اب انہیں جلد از جلد اس لڑکی کو وہاں سے نکالنا تھا جہاں وہ اپنی زندگی کے اذیت بھرے دن گزار رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ریان کو بھی لے کر جانا چاہتے تھے۔ ویسے بھی ریان کشمیر کے راستوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور انہیں امید تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے انہیں راستوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ فورسز کے چند جوانوں حزہ اور ریان کے ساتھ کشمیر کی طرف چل پڑے اور ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد وہ حزہ کی بتائی گئی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے۔ وہ ایک پہاڑی پر بنا ہوا چھوٹا سا مکان تھا، جس کے باہر ایک پھرے دار بندوق تانے کھڑا تھا۔ ریان اور اس کے ساتھیوں نے پھرے دار کو قابو میں کیا اور مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ ایک مختصر سا صحن عبور کرنے کے بعد انہیں ایک کمرہ نظر آیا۔ کمرے کا دروازے بند تھا۔ ریان نے ایک جھنگلے سے دروازہ کھولا تو سامنے والا منظر اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ بھائی جس کو وہ دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی منگولہ کا ہاتھ پکڑتے نہ جانے کیا کچھ بول رہا تھا اور وہ پھرے بالوں اور گلجے حلیے والی لڑکی اس کی عمارہ تو ہرگز نہیں تھی۔ خود سے بے نیاز، خلاؤں میں گھورتی لڑکی وہی طور پر کسی طرح بھی نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ ریان ابھی حیرانگی کے عالم میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس اذیت ناک منظر نے اس کے اندر کی ساری توانائی چھین لی ہے۔ کرنل خاور نے آگے بڑھ کر ایان کو گریبان سے پکڑ لیا اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ایان کو مار رہے تھے۔ ریان نے بڑی مشکلوں سے انہیں قابو کیا۔ اب انہیں کسی نہ کسی طرح اس مسئلے کا حل نکالنا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب لوگ ایان اور عمارہ کے ساتھ واپس منظر آباد جا رہے تھے۔ ریان اور کرنل خاور کو لگتا تھا کہ اس انکشاف

کہے سنے بغیر وہ اسے دائمی جدائی کا غم وے کر چلا گیا۔ ابھی وہ ایان کی موت کے غم سے باہر نہیں نکلا تھا کہ ایک روز اس کے بابا کرنل خاور بھی ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان حالات میں عمارہ اگر اسے نہ سنبھالتی تو وہ کب کا خود کو ختم کر لیتا۔ یہ عمارہ کی محبت ہی تھی جو اسے زندگی کی طرف واپس لے آئی تھی۔

☆.....☆

یہ کوہاٹ شہر کے ایک شہر خاموشاں کا منظر ہے جہاں پہاڑوں کے درمیان دو قبریں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں پر روزانہ ایک شخص آتا ہے بھی وہ اکیلا آتا ہے اور بھی اس کی بیوی اور بیٹا بھی اس کے ساتھ آتے ہیں۔ یہ قبریں ایان اور کرنل خاور کی ہیں۔ اس شخص کا نام کرنل ریان ہے اور یہ قبریں اس کے باپ اور بھائی کی ہیں۔ اسے ہمیشہ یہ لگتا تھا کہ اس کا باپ اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے اور اس کے بھائی کے جانے کے بعد اس کا باپ بھی اپنے بیٹے کے پاس ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اس نے ہمیشہ کے لیے اپنے قیمتی رشتوں کو کھو دیا۔ ان مشکل حالات میں اس نے اور عمارہ نے کیسے ایک دوسرے کو سنبھالا یہ وہی جانتے تھے مگر ان دونوں کے درمیان محبت نے غم کے اس احساس کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام ایان رکھا تھا مگر اس نے اسے ویسا ایان نہیں بنانا تھا بلکہ اسے زندگی سے محبت کرنے والا ایان بنانا تھا اور اسے امید تھی کہ یہ ایان کسی سے نفرت اور حسد نہیں کرے گا۔ اب وہ واپس اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں عمارہ اور ایان اس کے منتظر تھے۔ اسے امید تھی کہ آنے والے وقت میں اب کوئی ایان کسی عمارہ کو اپنی ضد کی بھیٹ نہیں چڑھائے گا اسے محبتوں کا ایک جہان بسانا تھا اور وہ پر امید تھا کہ وہ ایسا کر گزرے گا۔

☆.....☆

کے بعد وہ اندر سے ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ اندرونی زخم بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ان کو ٹھیک ہونے میں مدت لگ جاتی ہے مگر ٹھیک ہو کر بھی یہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ایان کا ویسا ہوا زخم بھی ایسا ہی تھا۔ ریان کو عمارہ کی بھی بہت فکر تھی۔ کچھ دن منظر آباورہنے کے بعد وہ عمارہ کو لے کر کراچی آ گیا اور وہاں کے ایک مشہور باہر نفسیات سے اس کا علاج کروانے لگا۔ ریان کی محبت اور توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمارہ تھوڑے ہی عرصے میں زندگی کی طرف واپس لوٹنے لگی، اپنا ماضی وہ ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔ اب اسے ریان کے ساتھ ایک محبت بھری نئی زندگی کی شروعات کرنی تھی۔

کرنل خاور ایان سے نفرت کرنے لگے تھے بلکہ کرنل خاور ہی کیا، ریان بھی جب عمارہ کو روتے ہوئے دیکھتا، اسے ایان سے اتنی ہی نفرت محسوس ہوتی۔ اس کے کراچی جانے کے بعد منظر آباو میں اب ایان اور کرنل خاور ہی رہ گئے تھے۔ کرنل خاور کا ارادہ بھی کچھ دنوں بعد اپنے آبائی شہر جانے کا تھا۔ وہ ایان سے بات نہیں کرتے تھے مگر وہ باپ تھے آخر کب تک اپنے بیٹے سے نفرت کرتے۔ اس کے چہرے پر ندامت اور پشیمانی دیکھ کر ان کا دل پسینچ گیا۔ وہ خود کو ایان کی اس متنی شخصیت کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ایان انہیں ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ وہ بہت چپ چپ رہنے لگا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی خاموشی کے پیچھے کیا راز ہے۔ اگر جانتے ہوتے تو اسے کبھی بھی اس رات اکیلے دریا پر نہ جانے دیتے۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی اور ایان انہیں بتائے بغیر آدھی رات کو دریا کی طرف چل پڑا۔ صبح صادق کو انہیں اس کی موت کی خبر مل گئی۔ جوان بیٹے کی موت نے انہیں آدھا کر دیا تھا۔ ریان بھی اپنے بھائی کی موت پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ ایان نے بھی اس کی محبت کو نہیں سمجھا تھا اور اس بار بھی کچھ

یومِ مجنوں

کون مجنوں کی طرح لیلیٰ کے عم میں پاگل ہو جائے اور گریبان چاک کر کے بکھرے بالوں کے ساتھ صحراؤں کی خاک چھانٹنے جائے۔ اوپر سے تم یہ کہ اظہارِ محبت بھی نہ کر سکے۔ ویلنٹائن کی طرح صاف ستھرے پینٹ کوٹ اور ٹائی میں سر پر ہیٹ رکھ کر ہاتھوں میں ایک خوب صورت گلاب لیا اور بس اظہارِ محبت کر دیا۔“ عدیل نے بڑی بے رحمی سے مجنوں پر تنقید کی۔

”مرے تو دونوں محبت میں ہی تات۔“ ماجد بھائی نے اکڑ کر ویلڈی دی۔

”ہاں! مگر ویلنٹائن نے محبت کا اظہار تو کروا تھا۔ پھر بھلے سے مر گیا..... اور..... مجنوں صرف لیلیٰ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے اس کی گلی کے سوچکر لگاتا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو پاگل ہو گیا اور اب یومِ مجنوں منانے کا مطلب ہے کہ ہم بھی اپنے سروں میں خاک ڈال دیں۔“ سبحان کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

اب کے ماجد بھائی کو خاموشی اختیار کرنا پڑی کہ بہر حال یہ ایک حقیقت تھی کہ ویلنٹائن ڈے منانا قدرے سہل تھا مگر انہوں نے زبان سے اس بات کا اقرار نہ کیا کہ آخر تھے تو مجنوں کے پکے پیروکار۔

☆.....☆

ماجد بھائی کو ہر سال فروری کے مہینے کے شروع میں یہ احساس ہونا شروع ہو جاتا تھا کہ وہ فلاں لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں مگر ہر سال یہ احساس صرف ان کے دل تک ہی محدود رہتا تھا۔ ان کی یہ

فروری کا مہینہ شروع ہوتے ہی ماجد بھائی کے اندر کا مجنوں پوری شدت سے جاگ اٹھتا تھا۔ ویسے تو مجنوں کے علاوہ فرہاد، رانجھا، پنوں اور نہ جانے کون کون سے عاشقوں کی فہرست ہے مگر ماجد بھائی مجنوں کے بہت بڑے عقیدت مند تھے۔ ان کا بس چلنا تو وہ پاکستان میں ویلنٹائن ڈے پر پابندی لگا کر ”یومِ مجنوں“ منانے کا حکم صادر کر دیتے لیکن کیا کیا جائے کہ لوگ مجنوں کا نام سن کر برے برے منہ بنانے لگتے ہیں۔ تو جوان ویلنٹائن کے اتنے دیوانے ہیں کہ ویلنٹائن ڈے کی تیز و تند آندھی میں ان سوکھے پتوں کی طرح اڑنے لگتے ہیں جنہیں یہ پتا نہیں ہوتا کہ وہ آندھی تھمنے کے بعد گریں گے کہاں؟

”تم لوگوں کو ویلنٹائن ڈے مناتے ہوئے شرم آتی چاہیے۔ اتنا بڑا عاشق موجود ہے تم لوگوں کے پاس مجنوں مگر تم لوگ مغرب کی اندھی تقلید میں اس عظیم ہیرو کو بھول چکے ہو۔ تم سب کو تو مجنوں کے حوالے سے محبت کا عالمی دن منانا چاہیے اور وہ بھی عین 14 فروری کو تاکہ مغرب والوں کو اس ویلنٹائن ڈے کا منہ توڑ جواب دیا جاسکے۔“ ماجد بھائی کے پانچ دوستوں کا گروپ چھپ چھپا کر ویلنٹائن ڈے منانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ چھپ کر اس لیے کہ اگر ان کے اباؤں کو پتا چل جاتا تو چھترول لازمی تھی۔ وہ سب تیاریوں میں مگن تھے اور ماجد بھائی انہیں شرم دلا رہے تھے۔

”ارے جاؤ..... بڑا آیا مجنوں کا جانشین..... اب

Downloaded From
paksociety.com

READING
Section



کیفیت فردری کے اینڈ تک رہتی۔ شاید یہ ویلنٹائن ڈے کے غلطی کی وجہ سے ہوتا تھا کیونکہ مارچ شروع ہونے کے ساتھ ہی یہ کیفیت پورے سال کے لیے کہیں جاسوتی تھی۔ اس سال ماجد بھائی کو یونیورسٹی میں اپنی ایک کلاس فیلو مشی سے محبت میں جلا ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ دل میں ٹھان چکے تھے کہ وہ اپنے دوستوں کو ”یوم بچوں“ منا کر دکھائیں گے۔ آج فردری کی پانچ تاریخ تھی۔ ان کے پاس آٹھ دن تھے جن میں انہوں نے اپنے پروگرام کو ترتیب دینا تھا اور نوں دن اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ ماجد بھائی ہر روز مشی کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ مختلف طریقوں سے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے لگے۔ مگر ادھر کسی کو پروا نہیں تھی۔ مشی برقعے میں لپٹی ہوئی آتی۔ کلاسز لیتی اور خاموشی سے واپس چلی جاتی۔ وہ کبھی بھی کلاسز کے بعد کسی سرگرمی یا تقریب کے لیے نہیں رکتی تھی۔ ماجد بھائی اپنی ایک طرفہ محبت کی ٹنگیں چڑھاتے گئے..... چڑھاتے گئے..... یہاں تک کہ تیرہ فردری کا دن آن پہنچا۔

”ہائے! اب میں کیا کروں؟ ویلنٹائن ڈے منانے والوں نے تو گلاب اور امپورٹڈ چاکلیٹ خرید لیے ہیں میں کیا خریدوں؟“ اب انہیں بچوں کی تہی دہشتی کا شدت سے احساس ہوا۔

”اچھا چلو کوئی بات نہیں..... میں امپورٹڈ کی بجائے لوکل چاکلیٹ لے لیتا ہوں اور سرخ گلاب کون سا ویلنٹائن کی ملکیت ہے۔ میں ویسی سرخ گلاب خرید لوں گا۔ اب بھلے ”یوم بچوں“ ہی منانا ہو۔ ”محبوبہ“ کے پاس خالی ہاتھ تو نہیں جایا جاسکتا۔“ انہوں نے خود کو تسلی دی۔

☆.....☆

چودہ فردری کی صبح ایک اور مسئلہ ان کا منتظر تھا کہ وہ اپنی ”محبوبہ“ کو یہ چیزیں کیسے پہنچائیں۔

”ہاں! میں کون سا ویلنٹائن ڈے جیسا وہاں

دن منا رہا ہوں۔ میں سیدھا مشی کے گھر چلا جاؤں گا۔“ ماجد بھائی نے اپنے اس ”بے وقوفانہ خیال“ پر خود کو ایک خیالی پھکی دی۔

ماجد بھائی نے لوکل چاکلیٹ کا ایک بڑا ڈبہ خریدا، ایک ویسی گلاب لے کر مشی کے گھر کے دروازے پر جانے اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

”السلام علیکم!“ ایک مضبوط تن دتوش والا آدمی باہر آیا تو ماجد بھائی نے فوراً سلام جھاڑا۔

”وعلیکم السلام!“ اس آدمی نے ماجد بھائی کا گھور کر جائزہ لیا تو وہ تھوڑا سا کھبرا گئے۔

”مشی، میری کلاس فیلو ہے۔ میں اسے یہ چاکلیٹ اور پھول دینے آیا ہوں۔“ ماجد بھائی نے جھٹ سے دونوں چیزیں اس آدمی کے سامنے کر دیں۔ اس کے چہرے پر جلال چھا گیا۔

”ارے! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ویلنٹائن ڈے جیسی بے ہودہ رسم کا قائل نہیں ہوں۔ میں تو چودہ فردری کو ”یوم بچوں“ قرار دے کر آیا ہوں۔“ ماجد بھائی نے تھوڑا سا سینہ پھلا کر کہا۔ اس آدمی نے گردن گھما کر گھر کے اندر آواز دی۔

”ارے! سب سن رہے ہو..... یہ لوٹا..... بچوں کا جانشین بن کر اپنی مشکو کو پھول اور چاکلیٹ دینے آیا ہے۔“ آنا قاناتا سات آٹھ اونچے لمبے آدمی جو مشی کے بھائی تھے ہاتھوں میں ڈنڈے اور ہاکیاں پکڑے باہر آئے اور سب مل کر ماجد بھائی پر ٹوٹ پڑے۔ سب نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔ ماجد بھائی اپنا سجاؤ کرتے ہوئے ضربیں کھاتے رہے اور منہ سے نکلنے والی چیخوں کا گلا گھونٹتے رہے جو روکتے روکتے بھی حلق سے برآمد ہو رہی تھیں۔

”ارے! اسے چھوڑ دو..... یہ اب اٹھنے کے قابل نہیں رہا..... جاؤ..... اندر سے کتالے کر آؤ اور اس پر چھوڑ دو تاکہ اسے ہماری مشکو کو پھول اور چاکلیٹ دینے کا مزہ ساری زندگی یاد رہے۔“ کتا شاید زیادہ

قارئین متوجہ ہوں

☆ اکثر قارئین کی شکایات کے مطابق کہ یہاں پر پرچہ دستیاب نہیں ہے۔
☆ ایجنٹ کی سہولت کے لیے پرچہ نہ ملنے کی صورت میں آپ ادارے سے رابطہ کریں۔

☆ اپنے شہر اور علاقے کا نام۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر پرچہ دستیاب نہیں ہے، ہو سکے تو بک اسٹال کا کنٹیکٹ نمبر لکھ کر ادارے کو بتائیں۔

☆ ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ ردا آپ کو بروقت مل سکے۔

الصلحہ کتب

ردا پبلی کیشن

021-34535726

خط و کتابت کا پتہ:

129-D - بلاک 2

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

ہی طاقت ورتھا جو سب کے سب اندر دوڑ گئے۔ ماجد بھائی کے دوستوں کے لیے بس اتنی مہلت کافی تھی۔ وہ سب جوگلی کے کٹڑ پر چھپ کر ماجد بھائی کو پتے دیکھ رہے تھے۔ دوڑ کر آئے، ان کو ٹانگوں، بازوؤں، گردن، سر، بالوں، غرض جہاں کسی کا ہاتھ پڑا ڈالا اور انہیں اٹھا کر بھاگ گئے اور گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا..... جب وہ لوگ کتالے کر آئے تو خالی گلی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ وہ سب ناک پرائگلیاں دھرے حیران کہ لوٹنے کو زمین کھا گئی یا آسمان۔

☆.....☆

”یہ لے..... مر، اب..... اگر تیری پراسرار حرکتوں کی وجہ سے تیرا بیچھانہ کرتے تو آج تو مر ہی مرا تھا۔“ ماجد بھائی کے دوستوں نے انہیں اسپتال کے بستر پر بٹھا۔
”ارے جگر ایوم مجنوں ہو یا ویلنٹائن ڈے کسی کے گھر جا کر علی الاعلان نہیں بلکہ چوری چھپے کرنے والے کام ہیں۔ سر عام کرو گے تو یہی حال ہوگا تو کیا سمجھ رہا تھا کہ یوم مجنوں منانے پر ہمیں پھولوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔“ سبحان نے ان کو آئینہ دکھایا۔
”ویسے یار! ہم وہی کام چھپ کر کرتے ہیں جو غلط ہو۔ تو کیا ویلنٹائن ڈے منانا بھی غلط ہے۔“ عدیل نے مصحومیت سے پوچھا۔

”ہے تو غلط..... اب ہم مانیں یا نہ مانیں..... انجوائے منٹ کہہ کر گزر جائیں یا کچھ اور مگر حقیقت حقیقت ہی رہے گی۔“ سبحان نے کندھے اچکا کر پتے کی بات کی۔

ماجد بھائی ان کی باتوں کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ہونٹوں سے آہ دیکا کے علاوہ کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ البتہ ایک بات ان کی سمجھ میں بہت اچھی طرح آگئی تھی کہ ویلنٹائن ڈے ہو یا یوم مجنوں، تجدید و اظہارِ محبت کا ہر وہ طریقہ جو ہمارے معاشرے اور دین کے اصولوں کے خلاف ہو غلط ہے اور اس میں اسی طرح پٹنے کا اندیشہ ہے۔

☆.....☆

ماریہ یاسر

افسانہ

سحبیت کے دو کاہنوں

زوہیب نے چوتھی بار کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔
”جی جی بس لارہی ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی

”سہادیہ یار! جلدی سے مجھے چائے پلاؤ، میں
نے ضروری کام سے صفدر کی طرف بھی جانا ہے۔“

Downloaded From
Paksociety.com

READI
Section

چکر میں، یہ تو چائے نہیں پائے بن گئے ان کے چکر
میں میرا ضروری کام رہ جاتا۔“ اس نے جلدی جلدی
چائے کے گرم گھونٹ بھرتے طنز کیا۔
”زوہیب! میرا ہاتھ جل گیا تھا چائے سے اس
لیے تھوڑی دیر لگ گئی۔“ اس نے اپنا جلا ہاتھ شوہر
کے آگے کیا۔

”کمال ہے یار کوئی کام تم سے ٹھیک سے نہیں
ہوتا۔“ اس نے خالی پیالی ٹرے میں واپس رکھی اور
جلدی جلدی جوتے پہن کے نکل گیا۔
”حد ہے زوہیب! آپ کو دو منٹ دیر ہو گئی تو

چائے پیالیوں میں ڈالنی چاہی تو پتلی سے تھوڑی سی
چائے اس کے ہاتھ پر گر گئی۔
”آئے اللہ ہی.....“ تکلیف سے اس کی
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”یار! چائے لار ہی ہو یا میں جاؤں۔“ اب کی بار
زوہیب کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔
”یہ لیں چائے۔“ ایک ہاتھ میں چائے کی ٹرے
پکڑے دوسرے ہاتھ پر ٹوتھ پیسٹ لگا کے اس نے
زوہیب کو چائے پکڑائی۔
”کمال ہے یار! اتنی دیر کرا دی تم نے چائے کے



Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

خاص موقعوں پر ان سے لپا بھی کرو۔“ عنائے نے اپنے کنگنوں پر فخریہ نظر دوڑائی۔

”کہاں یار میں تیار ہوتی ہوں تو دھیان ہی نہیں دیتے۔ میں خود سے پوچھوں کہ کیسی لگ رہی ہوں تو بغیر نظر ڈالے بول دیتے ہیں کہ ٹھیک ہی لگ رہی ہو تو اس وقت اتار دینا آتا ہے کہ کیا بتاؤں اور گفٹ کا تو نام بھی مت لو۔ پچھلے ہفتے جب میری سالگرہ تھی تو میں نے پہلے تو انتظار کیا کہ شاید خود ہی دے دیں لیکن گفٹ دینا تو دور کی بات دس تک نہ کیا تو میں نے بھی گلہ کر دیا تو بجائے شرمندہ ہونے کے کہنے لگے کہ یاد ہی نہیں رہا، میں نے کہا کہ اب دے دیں تو کہنے لگے کہ آج کل تو بالکل بھی نائم نہیں، جب نائم ملے گا تو دے دوں گا۔“ ساویہ بالکل روہا سی ہو گئی۔

”اچھا تم فکر مت کرو ایسا کرو کہ تم ویلنٹائن ڈے پر زد ہییب بھائی کو گفٹ دینا اچھا سا اور ابھی سے بول دو کہ 14 فروری کو ڈنر باہر کروائیں تمہیں ٹھیک ہے ناں ان کو بول دو کہ ابھی تین دن رہتے ہیں ویلنٹائن ڈے میں تو جتنے بھی کام ہیں نمٹالیں۔ اس دن کوئی بہانہ نہیں ہونا چاہیے۔“ اس کے کہنے پر ساویہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں نے تو فیصل کو ابھی سے بول دیا ہے کہ گفٹ میں مجھے ڈائمنڈ رنگ چاہیے اور سچ یا ڈنر میرے فیورٹ ریسٹورانٹ میں۔“ اس نے فخریہ کہا جیسے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

”تو فیصل بھائی مان گئے رنگ اور ڈنر کے لیے۔“ ساویہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”ہاں یار اور انکار کرتے بھی تو کیوں، آخر کو ان کی بیوی ہوں اتنا تو حق بنتا ہے میرا، اچھا اب میں چلتی ہوں فیصل آنے والے ہوں گے اور اگر ان کے آنے پر میں ان کو نظر نہ آؤں تو یہاں وہاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں مجھے جب تک مجھے دیکھ نہ لیں چین نہیں آتا نہیں۔“ اس نے اپنا پرس صوفے سے اٹھایا۔

غصہ ہو گئے لیکن یہ نظر نہیں آیا کہ کتنی تکلیف ہو رہی ہے مجھے۔“ اس نے ٹوٹھ پیسٹ لگے ہاتھ پر نظر ڈالی۔

”ایک بار پوچھ ہی لیتے میرا دل رکھنے کے لیے کہ کیسے جل گیا ہاتھ لیکن آپ کو کیا پرواہ آپ کو تو اپنے کام نائم پر کیے ملنے چاہیں۔ میں مروں یا جیوں آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے دکھ سے سوچا۔

☆.....☆

”یہ دیکھو! فیصل نے مجھے شادی کی سالگرہ کا گفٹ دیا کل۔“ عنائے نے اپنی کلاری اس کے آگے لہرائی تو اس میں لشکارے مارتے دو کنگن اس کو چونکانے کے لیے کافی تھے۔

”بہت خوب صورت ہیں عنائے! فیصل بھائی تم سے بہت پیار کرتے ہیں ناں۔ اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

”ہاں یار! بہت چاہتے ہیں فیصل مجھے آخر کو لو میرج جو کی تھی مجھ سے پیار تو بہت کرتے ہیں۔“ کہتے ہوئے اس کی گردن تن ہی گئی۔

”لو میرج تو زد ہییب نے بھی مجھ سے کی تھی۔“ اس کے بڑبڑانے پر عنائے چونک گئی۔

”کیا ہوا ساویہ! کوئی مسئلہ ہے کیا۔ زد ہییب بھائی سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟“ اس نے چائے کی پیالی ٹیبل پر واپس رکھ دی۔

”نہیں بابا لڑائی کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ بات کرنا تو دور، نائم ہی نہیں ہوتا ان کے پاس میرے لیے۔“ آفس سے آتے ہیں تو دوستوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ میں اکیلی سارا دن گھر میں ان کے انتظار میں سوکتی رہتی ہوں۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”تم بولا کرو کہ تمہیں بھی نائم دیا کریں بتاؤ کہ تم ان کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہو سارا سارا دن، کچھ وقت تمہارے لیے بھی نکالیں اور تھوڑا تم تیار بھی ہوا کرو، جب زد ہییب بھائی کے آنے کا وقت ہو تو خوب اچھے سے تیار ہوا کرو، خود بھی ان کو گفٹ دیا کرو اور

ٹائم نکل آیا تو چلے جائیں گے ڈنر کے لیے۔“ اس نے بڑے بڑے نوالے منہ میں ڈالنے شروع کیے۔

”زوہیب! میں بول دیتی ہوں کہ اس دفعہ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی آپ کو مجھے لے کر چلنا ہی ہو گا۔ ساگرہ کے گفٹ پر بھی مجھے نالا تھا لیکن اس بار نہیں بہت ہو گیا، ذرا فیصل بھائی کو تو دیکھیں کتنا خیال رکھتے ہیں اتنے گفٹ دیتے ہیں عنایتیہ کو، ہر دوسرے دن باہر گھمانے لے کر جاتے ہیں اور ایک آپ ہیں۔ میری کوئی پرواہ ہی نہیں ذرا ٹائم نہیں میرے لیے سارا سارا دن آپ کا انتظار کرتی رہتی ہوں لیکن آپ کو کیا پرواہ میری۔“ آج اس کے منہ سے سارے گلے نکل آئے۔

”یار! میں تمہارے لیے ہی تو اتنی محنت کر رہا ہوں تاکہ تمہیں ہر چیز دے سکوں۔“ اس نے اپنی صفائی دینی چاہی تو وہ غصے سے کچن میں چلی آئی۔ زوہیب اسے منانے کچن کی طرف گیا۔ دروازے پر پہنچ کر نظر کلائی میں بندھی گھڑی پر ڈالی جو پونے آٹھ بج رہی تھی تو ساویہ کو منانے کا ارادہ موٹوف کر کے تیار ہونے چل دیا۔

”بس یہی پیار ہے جو میں ناراض ہوں تو منایا تک نہیں، میری کیا پرواہ بھاڑ میں گئی میں۔“ تیاری کرتے زوہیب نے اس کی بڑ بڑہنی تو مسکرا دیا۔

☆.....☆

زوہیب کے ماں باپ زندہ نہ تھے بس ایک بہن تھی جو شادی شدہ تھی اور سعودی عرب میں مقیم تھی۔ زوہیب اپنی یونیورسٹی میں جونیئر کلاس کی ساویہ کو پسند کرنے لگا تو پڑھائی مکمل کر کے بہن سمیرا کو ساری بات بتائی اور نوکری لگتے ہی سماعیہ کے گھر رشتے کے لیے بھیجا یوں آنا فانا دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے مہینے بعد ہی مندر سمیرا واپس اپنے گھر چلی گئی۔ یوں وہ اکیلی سسرال کے جھنجھٹ سے آزاد خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ جب اچانک زوہیب کو اپنا

”بہت لگی ہو تم کہ تمہیں فیصل بھائی جیسے کیرنگ ہسپینڈ ملے۔“ اس نے حسرت سے کہا۔

”تم بھی لگی ہو جاؤ گی میں نے جیسا کہا ہے دیا ہی کرنا۔“ دروازے سے نکلتے اس نے یاد کر دیا تو ساویہ نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ ضرور عنایتیہ کی کہی باتوں پر عمل کرے گی تاکہ زوہیب بھی فیصل کی طرح اس کا خیال رکھیں۔

☆.....☆

”زوہیب! میں کیسی لگ رہی ہوں۔“ وہ جو آفس سے آ کے ابھی لیٹا ہی تھا کہ ساویہ کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پنک لان کے نئے سوٹ میں ہلکے سے میک اپ، کانوں میں نازک سی ایئر رنگ، ہاتھوں میں ڈیڑھ ساری، پنک اور وائٹ چوڑیاں پہنے وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”ٹھیک لگ رہی ہو لیکن اتنا تیار ہوئی ہو کہیں جا رہی ہو کیا؟“ اس نے دوبارہ اسے آنکھیں موندھ لیں۔

”اُف تو بہ زوہیب! بہت برے ہیں آپ، کبھی جو میری تعریف کی ہو آپ نے، حسرت نبی رہی میری۔“ وہ اب غصے میں چوڑیاں اتار کر بیٹھ رہی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے آج تمہیں اتنا غصے کیوں آرہا ہے۔ اچھا وہ جو اس دن تمہارا ہاتھ جلا تھا اب ٹھیک ہوا کہ نہیں، لاؤ دکھاؤ مجھے کسے جل گیا تھا۔“ وہ اچانک یاد آنے پر اسے بلانے لگا لیکن وہ غصے سے کمرے سے نکل گئی تو زوہیب اس کے عجیب برتاؤ پر حیران ہوا۔

”اس ویلنٹائن ڈے پر مجھے اچھا سا گفٹ چاہیے اور ساتھ ڈنر بھی باہر کرنا ہے مجھے ابھی سے سن لیں اس دن کوئی بہانہ نہیں چلے گا آپ کا۔“ اس نے آملیٹ اس کے سامنے رکھا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔

”یار! کوشش کروں گا تمہیں پتا بھی ہے کہ منایا کاروبار سیٹ کر رہا ہوں، آج کل تو ٹائم نہیں ہوتا اگر

دوڑائی جو 7 بجنے کا پتادے رہی تھی۔

”کیوں جناب اس میں یقین نہ آنے کی کیا بات ہے۔ آپ نے خود ہی تو کل بولا تھا پھر انتظار بھی تو کرنا چاہیے تھا نا۔“ اس نے اس کے رف خلیے کی طرف اشارہ کر کے اپنے سے قریب کر لیا تو وہ کچھ دیر پہلے کی ناراضی بھول بھال کے اس کی سنگت میں ہر گز بھول گئی۔

”اچھا بیٹیں میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“ اس کو ابھی بھی خواب کا عالم لگ رہا تھا۔

”ہاں تیار ہو جانا لیکن پہلے اپنے گفٹ تولے لو۔“ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو خوب صورت سی ڈبیا نکالیں۔

”یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ، پٹی برتھ ڈے اور یہ تمہارا ویلنٹائن ڈے کا گفٹ اور بوکے، پٹی ویلنٹائن ڈے میری جان اور پلینز ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھ سے ناراض مت ہوا کرو۔ میں یہ سب محنت صرف تمہارے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔ اس لیے ناراض مت ہونا دوبارہ کبھی بھی۔“ اس نے پیار سے اس کے ماتھے پر بوسا دیا۔

”اچھا میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“ دونوں ہاتھوں میں اس کے گفٹ پکڑے خوشی سے سرشار لہجے میں کہتی ہوئی ابھی، آخر اس کو اندر پیک پڑے بیگ سے کپڑے نکال کر بیگ کو زوہیب کے اندر جانے سے پہلے ہٹانا بھی تو تھا۔

”یہ تو چیٹنگ ہے اپنا گفٹ تولے لیا تم نے، میرا گفٹ ویلنٹائن ڈے کا تو دے جاؤ۔“ زوہیب کی بات کا مطلب سمجھ کے وہ اندر بھاگ گئی تو وہ مسکرا دیا۔ غلط فہمی کے باوجود چھٹنے پر دونوں ہی خوش تھے اور اس محبت کے دن کو اور بھی محبت بھرا اور یادگار بنانے کے لیے دونوں ہی پر عزم تھے لیکن محبت کے لیے صرف ایک دن ہی کیوں بلکہ محبت تو روز منانی چاہیے کیونکہ محبت کے تو دن ہزار ہونے چاہیے۔

☆.....

کاروبار کرنے کا شوق ہوا تو ماں باپ کے چھوڑے پیسے کو کاروبار میں لگا کر خوب محنت کرنے لگا تاکہ سماویہ کو دنیا کی ہر خوشی دے سکے، نئے کاروبار کو پر دان چڑھانے میں اسے وقت کا ہوش ہی نہ رہتا، صبح کا گیا رات کو لوٹا تو ٹھکن سے چور ہو کر سوتا تو صبح ہی اٹھتا۔ اس ساری صورت حال میں اسے احساس تک نہ ہوا کہ سماویہ اس کی مصروفیت سے کتنی ڈسٹرب رہنے لگی ہے۔ شادی کے پانچ مہینے بعد جب اس کی سالگرہ گزری تو کام کی مصروفیت کی وجہ سے اس کے ذہن سے نکل گیا۔ بعد میں اس کے یاد دلانے پر وقت کی کمی کی وجہ سے ابھی تک اس کا گفٹ نہ دے سکا۔ تو اس بات پر سماویہ کا دل بہت دکھا اور اسے اس کی سہیلی عنایتیہ جب اپنے شوہر کی وارفتگیاں بتاتی تو وہ اور یاسیت کا شکار ہو جاتی۔

☆.....☆

”کل اگر ویلنٹائن ڈے کا گفٹ نہ دیا اور باہر نہ لے کر گئے تو میں بھی ایسی کی طرف چلی جاؤں گی اور وہیں رہوں گی جب تک انہیں احساس نہیں ہوتا۔“ اس نے رخ موڑ کر لیٹے زوہیب پر نظر ڈالی اور خود سے یاد دہانی کی۔

”بس آج رات سو جاؤ اے دل، کل سماویہ کو سر پر اندر دینے کے لیے ابھی چپ ہونا بہت ضروری ہے۔“ اس نے ناراض بیوی کو منانے کے لیے تڑپتے دل کو ڈپٹا۔

☆.....☆

”مجھے یقین ہے کہ آج بھی لیٹ آئیں گے میں جا کے بیگ پیک کر لیتی ہوں کل صبح ہی ایسی کی طرف چلی جاؤں گی۔ پھر شاید احساس ہو کہ محبت کا اظہار کتنا ضروری ہے۔“ اس نے کپڑے بیگ میں ڈال کے زپ بند کی ہی تھی کہ دروازے کی بیل پر چونک ابھی۔

”آپ اس وقت، مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ زوہیب کے ساتھ اندر آتے اس نے گھڑی پر نظر

میر وں کی کہانی

وہ فوراً نور امر کو گھورتے ہوئے بولی، جس نے اسے مار کھلانے کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ اس کی بات پر وہ دونوں کو گھور میں ہوئیں باہر چلی گئیں تو انہوں نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

☆.....☆

اس نے ایک نظر اپنے پاس سوئی ہوئی نور امر پر ڈالی اور اٹھ کر رائٹنگ ٹیبل کے پاس چلی آئی۔ اپنی لاک کی ہوئی ورائز سے اس نے اپنی اوصوری کہانی اٹھائی اور اسے لے کر ٹیبل پر چلی آئی۔

کتنا شوق تھا نا اسے اپنی پہلی کہانی کے شائع ہونے کا۔ کتنا ارمان تھا کہ جب اس کی پہلی تحریر شائع ہوگی تو وہ خوب ہنگامہ کرے گی۔ پارٹی کرے گی سب دوستوں رشتے داروں کو دکھائے گی کہ یہ دیکھو نوشین سید منور کی کہانی یعنی کہ میری کہانی سب کتنا خوش ہوتے نا۔ لیکن اس کا یہ خواب شاید کبھی بھی پورا نہ ہوگا وجہ وہی عام سی ہی تو تھی ابورسا لے کہانیاں پڑھنے کے خلاف تھے اور ساری زندگی ان کی خواہش کے مطابق گزار دینے والی شافقہ بیگم بھی سید منور کے ساتھ تھیں اور بھائی تو اس کے تین تھے ارسلان جو کہ ایک بچے کا باپ تھا۔ اس کی بیوی علیہ جو صرف ارسلان اور بیٹے حمزہ کے علاوہ کسی کے وجود سے واقف نہ تھی جب کہ چیران اور عدنان کالج بوائے تھے۔ صرف نور امر ہی تھی اس کی ہم راز، وہ رات رات بھر بیٹھ کر کہانی لکھا کرتی اور نور امر صبح کالج

”السلام علیکم میں نوشین سید منور بات کر رہی ہوں جی مجھے اپنی تحریروں کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ شائع ہوں گی یا پھر نہیں۔“ اس نے کچھ ڈر کر کہا اور اپنی تحریروں کے نام بتانے لگی جب کہ دروازے میں کھڑی نور امر نے اسے جلدی سے بات کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ ایڈیٹر کے کہے جملوں پر اس کی خوشی سے بھرپور چیخ اتنی زور سے تھی کہ یقیناً ایڈیٹر نے فوراً فون کو اپنے کان سے ہٹایا ہوگا اور نور امر بھاگ کر اس کی طرف آئی تو اس نے تھینک یو کہہ کر فون جلدی سے رکھا اور اسے تقریباً چیخ کر گلے سے لگاتے ہوئے بلند آواز میں بولی۔

”میری کہانی شائع ہوگئی ہے یا ہو.....“

”کیا..... اوہو میرے اللہ.....“

اس کے بعد کیا تھا دونوں کی چیخوں سے ”سید منور“ والا گونج اٹھا تھا۔ شافقہ بیگم ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور انہیں اچھل کود کرتے دیکھ کر سخت لہجے میں بولیں۔

”کیا ہو رہا ہے یہ اور بندروں والی حرکتیں کیوں کر رہی ہوتی دونوں۔“

”جی امی وہ.....“ نوشین انہیں دیکھ کر صرف اتنا ہی کہہ سکی تو نور امر اپنی عقل کے مطابق بولی۔

”وہ ای ٹی وی گر گیا تھا۔“

”ٹی وی ہمارے گھر کہاں سے آگیا، وماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔“

”نہیں ای! اس کی بات کا مطلب ہے ابھی چھپکلی گری تھی تو ہماری ڈر کی وجہ سے چیخ نکل گئی۔“

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section



”لے کاش ابوای اس بات کے خلاف نہ ہوتے تو آج میری زندگی کا یادگار دن ہوتا۔“ وہ دکھ سے سوچتے ہوئے بے دلی سے اٹھی اور اپنی چیزیں واپس رکھ کر بیڈ کی طرف بڑھ گئی ایک بے دلی کی سی حالت میں۔

☆.....☆

ایک کے بعد ایک اس کی کہانیاں شائع ہوتی چلی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے سب ہی پسند کرنے لگے۔ ان دنوں وہ ایک سلسلے دار ناول لکھنے میں مصروف تھی اور اس وقت بھی وہ ناول لکھنے میں مصروف تھی۔ جب کوئی ناک کر کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے جلدی سے ناول کو اٹھا کر کے رکھ دیا۔ مڑی تو دروازے میں شافہ بیگم کھڑی ہوئی تھیں کچھ پریشان سی اور شاید اپنی اسی پریشانی کی وجہ سے وہ ٹوشین کا گھبراہٹا بھی محسوس نہیں کر سکی تھیں۔

”ارے امی آپ..... آئیں ناکھڑی کیوں ہیں بیٹھیں۔“ وہ اٹھ کر کچھ حیرانی سے بولی تو شافہ بیگم بیڈ کے کونے پر کھتے ہوئے نم آواز میں بولیں۔

”مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میری چھوٹی سی ٹوشین آج اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ مجھے اب اسے رخصت بھی کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب ای! کیا بات ہے کھل کر بات کریں آپ؟“ اس کی بات پر وہ ایک گہرا سانس بھر کر بولیں۔

”آج تمہاری مای فرحین آئیں گیں تمہارے ماموں اجمل اور جمال کے ساتھ تمہارا ہاتھ مانگنے کے لیے۔“

”کیا ای.....؟“

”ہاں تمہارے ابو نے فوراً ہاں کر دی ہے، اگلے مہینے کی 12 تاریخ کو نکاح ہو گا اور 14 تاریخ کو رخصتی۔ سچ میں بے حد خوش ہوں ایک ماں کے لیے اس بات سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی کہ اس کی بیٹی اس کے اپنے ہاتھوں سے رخصت ہو۔“

”ای! آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔“ وہ بات کر رہی تھیں

جاتے وقت انہیں پوسٹ کر دیتی۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں کوئی آزادی ہی حاصل نہیں تھی، انہیں ہر چیز کی آزادی تھی۔ جو دل کرتا کھاتیں جو دل کرتا کرتیں من چاہا پہنتی لیکن صرف گھر تک۔ ساری زندگی وہ اپنی دوستوں کے گھر نہیں گئی تھیں۔ بقول بابا ”نورا مر ہے تو اس سے دوستی کر لو بری صحبت انسان کو برا کر دیتی ہے ٹوشین بیٹا تم تو سمجھ دار ہو۔“ اور وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کہہ پاتی۔ کالج جاتی تھی تو وہاں پر بریک میں یا پھر کسی فری پریڈ میں دوستوں سے ڈائجسٹ پڑھ لیتی تھی گھر والوں سے چوری اور بی اے کے بعد وہ جب گھر بیٹھی تو تعلیم سے زیادہ اسے ڈائجسٹ کے نہ پڑھنے کا دکھ تھا اور یہ دکھ اس وقت کم ہوا جب اس نے ارسلان بھیا سے کہہ کر کچھ وقت کے لیے ان کا انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت لی اور بھائی نے اسے صرف ایک گھنٹے کے لیے روزانہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ یہ ایک گھنٹہ انٹرنیٹ پر ڈائجسٹ پڑھنے میں گزار دیتی تھی۔ اس نے بس ایک بار امی سے کہا تھا۔

”ای ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنا کوئی بری بات تو نہیں ہے تا بلکہ اسے پڑھنے سے تو انسان کو شعور آتا ہے زندگی کا مقصد سمجھ میں آتا ہے تو آپ اس کے خلاف کیوں ہیں۔“ اس کی بات پر امی نے اسے جن نظروں سے گھور کر دیکھا تھا وہ نظریں اسے آج بھی یاد ہیں ان کے الفاظ بھی۔

”میں نے کبھی رسالے نہیں پڑھے کہ مجھے پتا ہو ان میں کیا لکھا ہوتا ہے میں صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ تمہارے ابو کو یہ بات پسند نہیں ہے تو میں ان سے اختلاف کیسے کر سکتی ہوں۔ بس تم نے آج ڈائجسٹ کا نام لیا ہے دوبارہ مت لینا ورنہ تمہارے ابو بہت ناراض ہوں گے۔“ ان کی بات پر وہ انہیں صرف دیکھ کر ہی رہ گئی تھی۔ پھر پتا نہیں کب اور کیسے اس نے کہانی لکھنے کا سوچا تھا جس پر نورا مر نے ہمیشہ کی طرح اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور آج وہ کتنی خوش تھی مگر ایک ادھوری سی خوشی تھی۔

کہ نور امر آ کر بولی تو وہ اٹھ کر باہر کی طرف بڑھ گئیں۔

”کیا ہوا بت بن کر کیوں بیٹھی ہو تم؟“

”نور امر! میری شادی جمال سے، میں نہیں کر سکتی بالکل بھی نہیں۔“

”کیوں کیا کمی ہے ان میں، اچھے خاصے ہینڈسم ہیں ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہیں۔“

”ان کے خیالات بھی تو ای اور ابو کی طرح ہوں گے تم جانتی ہو اب کہانیاں لکھنا میرا شوق نہیں عادت بن چکا ہے، میں اسے نہیں چھوڑ سکوں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”کیا پتا جمال بھائی کو اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو یا رکچہ اچھا سوچو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھی اسے سمجھاتی رہی اور وہ کم قسم سی ہوں ہاں کرتی رہی۔

☆.....☆

دنوں کو تو جیسے پر ہی لگ گئے تھے۔ ایک دو تین کے بعد کب 12 فروری آئی کب اس کا نکاح ہوا

اسے کچھ علم نہیں تھا اور پھر بلا آخر 14 فروری کو وہ جمال کی سچ پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پورے کمرے

کو سرخ گلابوں سے سجایا گیا تھا۔ بالکل دروازے کے سامنے سرخ گلابوں کے ساتھ شادی مبارک لکھا

ہوا تھا۔ پورا کمرہ گلابوں کا گل دستہ بنا ہوا تھا۔ وہ کمرے کا جائزہ لینے میں کم تھی جب جمال کمرے

میں داخل ہوا۔ بے شک وہ دونوں کزن تھے لیکن سید فیملی سے ہونے کی وجہ سے نوشین نے اسے کبھی نہیں

دیکھا تھا اور آج وہ اس کا شوہر بن چکا تھا۔

”منہ دکھائی نہیں لو گی نوشین؟“

اس کے نام کی طرح اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی۔ یہ نوشین کو آج پتا چلا تھا۔ وہ اس کی

ٹھوڑی پکڑ کر بولا اور ایک بکس اس کی طرف بڑھا دیا پھر خود ہی اس نے اسے کھولا تو نوشین نے حیرت سے

اپنی منہ دکھائی کو دیکھا بہت ہی مہنگا پین۔ اس نے حیرت سے جمال کو دیکھا تو وہ محبت سے بولا۔

”منہ دکھائی کچھ انوکھی نہیں ہے نوشین لیکن ایک

رائٹر کی منہ دکھائی تو ایسی ہی ہوتی ہے تا تم سوچ رہی ہو گی کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ تم رائٹر ہو۔ تو نوشین بات کچھ

یوں ہے کہ میرے ایک دوست کو ڈائجسٹ پڑھنے کا بے حد شوق ہے تو میں نے اس کے گھر پر موجود

ڈائجسٹ ایک دن پس یوں ہی اٹھالیا تھا تب اس میں موجود تمہاری کہانی ادھوری خوشی پڑھی پھر پتا نہیں کیسے

تمہاری لکھی ہر تحریر پڑھتا چلا گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میری کزن بھی رائٹر ہو سکتی ہے۔ میں نے ای سے کہا

کہ مجھے تم سے ہی شادی کرنی ہے وہ بھی ویلنٹائن ڈے کے موقع پر میں تو بہت بولتا ہوں کچھ تم کہو۔“ وہ اصرار

کرتے ہوئے بولا تو وہ کچھ جھجک کر بولی۔

”آپ کو میرے دائرہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“

”ظاہر سی بات ہے یار! اسی لیے تو یہ پین تمہیں منہ دکھائی میں دے رہا ہوں اور ہاں میری طرف

سے تمہیں پوری اجازت ہے کہ تم رسالے پڑھ سکتی ہو، کہانیاں بھی لکھ سکتی ہو اب خوش۔“ وہ اس کی بات

پر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”رائٹر ہونا بری بات نہیں ہے اور نا ہی رسالے پڑھنا یہ تو انسان کو زندگی جینا سکھاتے ہیں آپ کو

بات کرنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ خیر اب میں رومینک ہورہا ہوں اجازت ہے مادام۔“

وہ آخر میں شرارت سے بولا تو نوشین نے شرما کر سر جھکا لیا۔ یہ ویلنٹائن ڈے اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر خوشیاں لے کر آیا تھا۔

”پپی ویلنٹائن ڈے میرے دل کی ملکہ نوشین سید جمال۔“ وہ مسکرا کر بولا تو وہ شرما کر رہ گئی۔

ہر انسان ایک سنا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر کسی کی سوچ ایک جیسی ہوتی ہے اسے آج اس بات پر یقین ہو گیا تھا۔ یہ ویلنٹائن ڈے اس کی زندگی میں لاکھوں کر ڈول خوشیاں لے کر آیا تھا۔

☆.....☆

ویسٹائٹس ٹی

اس نے کندھوں سے سرکتی ہوئی شال درست کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل
آئی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی نمی اور خنکی کا احساس اسے
شدت سے چھو کر گزرا تھا۔ وہ ہاتھ میں موبائل



READING
Section



READING
Section



اور والٹ تھاے ایک گفٹ سینٹر میں داخل ہوئی۔ پوری دکان سرخ گلابوں اور ویلنٹائن ڈے کے کارڈز سے جگمگا رہی تھی۔ آبدار نے آگے بڑھ کر ایک خوبصورت ویلنٹائن ڈے کا کارڈ پکڑا اور اس کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ کارڈ کے ساتھ اس نے ایک نفیس سی گھڑی خریدی اور رقم ادا کر کے قریبی ایک کافی بار میں چلی آئی۔ بھاپ اڑانا کافی کاگ سا منے میز پر بڑا تھا لیکن وہ اپنی ہی سوچوں میں گم مسکرا رہی تھی۔ سالار کے ساتھ یہ اس کا پہلا ویلنٹائن ڈے تھا جو وہ بہت جوش و خروش سے منانا چاہتی تھی اس کو آج شام کا بے صبری سے انتظار تھا کیونکہ اس نے سالار کے لیے بہت اچھا میرپرائز رکھا تھا جس کے لیے وہ بے چین ہو رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اب تک گم تھی۔ جب دفعتاً اس کے موبائل پر میسج ٹون کی آواز نے آبدار کو خیالوں سے واپس حقیقت کی دنیا میں لاکھڑا کیا۔ اس نے میسج پڑھنے کے بعد کافی ختم کی اور بل ادا کرنے کے بعد سیدھا گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆.....☆

آبدار نے پورے کمرے کو سرخ گلابوں میں نہلا دیا تھا۔ بیڈ شیٹ، پردے، کٹن کمرے کی ہر ایک چیز سرخی مائل تھی، کمرے کی لائٹز آف تھیں مگر کینڈل ریکڑ میں جلتی موم بتیاں کمرے کو بے حد دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ آبدار ریڈ کٹر کی فرائک میں ملبوس بلا کی حسین لگ رہی تھی، اس نے ایک نظر سامنے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور وہ پچھلے دو گھنٹوں سے سالار کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ آبدار نے کئی بار اس کا نمبر ڈائل کیا مگر دوسری جانب سے کوئی بھی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ شادی کے بعد یہ اس کا سالار کے ساتھ

پہلا ویلنٹائن ڈے تھا۔ وہ جو آج کے دن کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی اب غصے میں بیٹھی خود کو کوسنے لگی۔

”ساری غلطی ہی میری تھی۔ میں ہی پاگل تھی جو اس کے لیے اتنا ج سنور کے بیٹھ گئی۔“ اس نے کانوں میں پہنے ریڈ جھمکے اتار کے ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ غصے میں خود کلائی کرتے ہوئے اس نے اپنی ساری جیولری اتار کر پھینک دی اور چیخ کرنے کے لیے داش روم میں گھس گئی۔ چند ثانیے بعد وہ چیخ کر کے نکلی تو ایک بار پھر آس بھری نگاہ گھڑی پر ڈالے بنا نہ رہ سکی۔ اب اس کو اپنی اس دن کے انتظار کی بے صبری پر غصہ اور سالار کے اب تک نہ آنے پر بے بسی سے رونا آرہا تھا۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑی۔ جس پر سالار کے لیے خریدی گئی گھڑی، ویلنٹائن ڈے کا کارڈ کے ساتھ گلاب کے پھولوں کا خوب صورت ٹیکے بھی موجود تھا۔ آبدار کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی اور وہ خاموشی سے لیٹ گئی تھی۔

”اب تک وہ کیوں نہیں آیا؟ میں نے اس کو بار بار کہا تھا کہ آج جلدی آتا۔ کہیں وہ بھول تو نہیں گیا کہ آج 14 فروری ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے بہت خاص دن ہے، کہیں سالار مجھ سے ایک ہی سال میں تو نہیں اکتا گیا؟ اور کوئی اس کی زندگی میں.....“ خیالات کی یورش اسے کہاں سے کہاں لے گئی تھی وہ جو سارا دن خوشی سے ہواؤں میں اڑتی رہی تھی۔ اب عجیب سی گھٹن کا شکار ہو رہی تھی۔ غصہ اور مایوسی اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ بنا آواز کے آنسو بہاتے سوچتے سوچتے نیند نے اس کو کب اپنی آغوش میں لیا اس کو خبر ہی نہ ہو سکی اور اس کو ویلنٹائن ڈے یوں رو کر تنہا ہی گزارنا پڑا تھا۔

کہا۔
”میں بھی آج کے بعد کبھی اس کی فکر نہیں
کروں گی۔ نہ کبھی یوں پاگلوں کی طرح اس کی
محبت میں کمرے کو سجاتی پھروں گی۔ اس کو صرف
اپنے کام سے محبت ہے مجھ سے نہیں۔“ خود کلائی
کرتے کرتے وہ پھر آنسو بہانے لگی تھی۔

☆.....☆

وہ سالار کو بغیر اطلاع دیئے اپنی ای کی طرف
چلی آئی تھی۔ آبدار بچپن ہی سے ایسی تھی سب
کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن کوئی اس کو انور
کرے یہ وہ ہرگز برداشت نہیں کر پاتی تھی۔

”ویلنٹائن ڈے تو محبت کرنے والوں کا دن
ہوتا ہے۔ پھر اس دن سالار نے کیوں مجھ سے
اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ آگے پیچھے تو بہت
دعوے کرتا تھا اور جس دن موقع تھا محبت کا یقین
دلانے کا اس دن اس نے خود میری محبت کو بھی
انور کر دیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھے کتنا دکھ ہو
گا۔“ اپنے کمرے میں بیٹھی وہ گم صم سے انداز
میں اسی کو سوچ رہی تھی جب کمرے میں ای اس
کے اور اپنے لیے چائے لے کر چلی آئیں۔
انہوں نے چائے والی ڈش ٹیبل پر رکھ دی اور خود
اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

”آبی بیٹا! سالار شام کو آئے گا یا تم اکیلی چلی
جاؤ گی؟“ انہوں نے محبت بھرے انداز میں
پوچھا تھا۔

”جناب کو اپنے کاموں سے فرصت ملے گی تو
آئیں گے نا، اس کو تو آج کل اتنی بھی خبر نہیں
ہوتی کہ اس کی ایک عدد بیوی بھی ہے۔“ آبدار
کے انداز میں شکایت تھی۔

اس کی ماں نے بغور آبدار کے چہرے کو دیکھا
اور پھر فکر بھرے لہجے میں مخاطب ہوئیں۔

”سالار سے جھگڑا ہوا ہے؟“

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔
آبدار نے ایک نظر اپنے پیچھے سوئے سالار پر
ڈالی، رات کو وہ کب لوٹا تھا اس کو خبر نہیں تھی،
اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹتی ہوئی وہ بیڈ سے اتری
اور فریش ہو کر کچن میں چلی آئی۔ رات کی وجہ
سے اس کا موڈ اب تک آف تھا۔ وہ گگ میں
اپنے لیے کافی ڈال رہی تھی جب عقب میں
سالار کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

”میرے لیے بھی ایک کپ کافی بنا دو۔“
آبدار کی نظریں اب تک اسی کے چہرے پر جمی
ہوئی تھیں۔ سالار کے چہرے پر شرمندگی کے
کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ بالکل نارمل
لہجے میں کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور آبدار اس
کے اس انداز پر مزید جل کر رہ گئی۔ وہ تو سمجھ رہی
تھی کہ صبح آنکھ مچھلتے ہی وہ رات دیر سے آنے پر
معافی مانگے گا۔ اسے دیر سے ہی سہی مگر ویلنٹائن
ڈے وشن کرے گا لیکن اس کی سوچ ایک بار پھر
غلط ثابت ہوئی تھی۔ سالار نے نہ تو سوری کہا تھا
اور نہ ہی اس کو وشن کیا تھا اور وہ غصے میں سالار
کے لیے کافی بنائے بنا ہی کچن سے نکل گئی تھی۔

☆.....☆

معمول کے مطابق وہ تیار ہو کر ناشتے سے
فراغت کے بعد وہ آفس چلا گیا تھا، جانے سے
پہلے بھی اس نے آبدار سے کوئی خاص گفتگو نہیں
کی تھی۔ وہ اس کے آگے پیچھے گھومتی رہی تھی کہ
شاید اب وہ سوری بول دے گا۔

”مجھے کوئی سرپرائز گفٹ دے کر وشن کرے گا
اور مجھے منالے گا۔“ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔
”کتنا لارواہ شخص ہے۔ بیوی کی ناراضی کی
کوئی فکر ہی نہیں۔“ رات کو کمرے میں سجائے
چلا پوں کو اس نے ہنس نہیں کرتے ہوئے چلا کر

”جھگڑا ہی تو نہیں ہوا ای!“ آبدار نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا تھا۔

”تو پھر اس طرح کیوں بول رہی ہو؟“

”بس ایسے ہی، کچھ بھی نہیں ہوا آپ فکر مند نہ ہوں اور میں شام کو خود ہی چلی جاؤں گی۔ گاڑی میرے پاس ہی ہے۔“ آبدار نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی امی سے بے حد محبت کرتی تھی اور اپنی وجہ سے انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ان سے بنا کچھ ڈسکس کیے اس نے بخوبی بات کا رخ بدل ڈالا تھا اور ان کے ساتھ چائے پینے میں مصروف ہو گئی تھی۔

☆.....☆

شام کو واپسی پر وہ مارکیٹ چلی آئی تھی۔ گھر جانے کا اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنے لیے چند ضرورت کی اشیاء خریدنے کے بعد وہ واپس گاڑی میں آن بیٹھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے اس نے ایک نگاہ اپنے موبائل پر ڈالی۔ ”پورے دن میں ایک میسج بھی نہیں ہو سکا۔ کیا اس قدر وہ مصروف ہو چکا ہے۔“ سوچتے ہوئے بے ولی سے اس نے گاڑی اشارت کی اور نہ چاہتے ہوئے بھی گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔

☆.....☆

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو چار سو اندھیرا بکھرا ہوا تھا، شاید بجلی نہیں تھی۔ موبائل کی روشنی سے وہ کچن تک آئی اور ماچس لے کر موم جتی جلانے لگی۔ رات کے نو بج چکے تھے اور وہ آج بھی اب تک نہیں آیا تھا۔ کینڈل تھا سے وہ لاؤنج میں چلی آئی۔ ٹیبل پر کینڈل ریک رکھتے ہوئے آبدار کی نظر ایک گلابی رنگ کے لفافے پر پڑی جس کے ساتھ ایک خوب صورت سی گلاب کی کلی بھی موجود تھی۔ آبدار نے جلدی سے کاغذ کو

کھول کر دیکھا۔

”سوری۔“ کاغذ پر صرف سوری لکھا تھا۔ آبدار نے کارڈ واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور کلی پکڑنے ہی لگی تو لائٹ آ گئی۔

وہ آچکا تھا۔ آبدار نے دھڑکتے دل سے سوچا اور اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گئی۔

کمرے میں لیمپ کی مدھم زور روشنی اس کو کمرے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ گلابوں سے آراستہ کمرہ بے حد دلنریب لگ رہا تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں سرخ اور سفید رنگ کے پھولوں کے گلدستے پڑے تھے۔ وہ قدم قدم چلتی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل تک آئی جہاں چھوٹی سی ڈبی ایک اور کلی کے ساتھ موجود تھی۔ آبدار نے ڈبی کھول کر دیکھی تو اندر ایک خوب صورت سی رنگ جگمگا رہی تھی۔

”آبدار!“ اسے اپنے عقب میں سالار کی آواز سنائی دی۔

آبدار نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ باندھے کھڑا اسی کو خشکراتا دیکھ رہا تھا۔

”اب یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم جاؤ کرو اپنا کام مجھ پر کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔“ آبدار نے حقیقتی سے کہا۔

”کل میں نے کتنا انتظار کیا تمہارا، تمہیں کئی بار کالز بھی کیں لیکن تم نے کوئی جواب نہیں دیا، تم اچھی طرح جانتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ویلنٹائن ڈے منانا چاہتی تھی لیکن تم نہ جانے کس دنیا میں لگن تھے۔“ وہ جانتا تھا کہ آبدار اس سے ناراض ہے اس لیے خاموشی سے اس کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

”تمہیں میرا اور میری محبت کا کوئی احساس نہیں۔ تم سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہو۔ بس

ان روایات کا امین اور ان کی پاسداری کرنے کا ذمہ دار ہے جب کہ ویلنٹائن ڈے کے بارے میں ملنے والی انفارمیشن سے اس کا اسلامی تعلیمات اور روح کے منافی ہونا ہے۔ "آبدار خاموش ہو چکی تھی۔ وہ مدھم لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

یہ تہوار محبت کو زوجیت کے دائرے سے باہر نکال کر عشق و عاشقی کے غیر فطری دائرے میں داخل کرتا ہے جس سے بے حیائی اور فحاشی بڑھتی جا رہی ہے۔ ویلنٹائن ڈے اظہار محبت کا دن مانا جاتا ہے لوگ سوچتے ہیں اگر ایک دن اپنی محبتوں کا اظہار کر لیں گے تو اس میں کیا قباحت ہے لیکن ذرا تم خود سوچو آبدار کہ کیا صرف ایک دن کے اظہار سے حقیقی مقاصد حاصل ہوتے ہیں؟ کیا اس دن اظہار محبت کرنے والے سچی محبت حاصل کر پاتے ہیں؟ یا پھر آئندہ آنے والے ویلنٹائن ڈے پر وہ ایک نئے سانھی سے یہی اظہار کر رہے ہوں گے۔ یہ سب صرف نفس کو وقتی تسکین دینے اور ذہنی سکون حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح ایک دن منانے سے برائی اور بے حیائی کو تو فروغ مل سکتا ہے مگر سچی محبت کو نہیں۔

محبت کا حقیقی اظہار تو عمل سے ہوتا ہے۔ اللہ کے ساتھ محبت ایمان کا مطالبہ کرتی ہے۔ آپ کے ساتھ ہماری محبت اطاعت سے پتا چلتی ہے۔ والدین سے کی جانے والی محبت ان کی خدمت میں جانی جاتی ہے۔ اولاد سے محبت ان کی اعلیٰ تربیت سے نظر آتی ہے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ دو لوگوں کے درمیان محبت صرف ایک دن کے اظہار سے قائم ہو جائے۔" وہ چند ٹائیپے سانس لینے کو ٹھہرا تھا اور پھر سے آبدار سے مخاطب ہوا۔

اپنے جذبوں کی قدر کرنے والے، دوسرا کیا سوچتا ہے کیا چاہتا ہے اس سے تم لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بولتی بولتی رد ہانسی ہو گئی تھی۔ "سوری آبدار! پلیز اب اتنا غصہ مت کرو۔" سالار نے آبی کو شانوں سے تھامتے ہوئے محبت سے کہا تو اس نے ایک جھٹکے میں سالار کو خود سے الگ کیا۔

"دور رہو مجھ سے۔ اب سوری کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے دل توڑتے ہو اور پھر چھوٹا سا لفظ سوری بول کر معافی طلب کرتے ہو۔" اس نے نم آنکھوں سے سالار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آبدار! میں نے کبھی تمہارا دل نہیں توڑنا چاہا نہ ہی کبھی تمہیں کوئی تکلیف دینے کا سوچا ہے۔ مجھے تمہارا اور تمہاری محبت کا احساس ہے اور میں تمہاری محبت کی دل سے قدر بھی کرتا ہوں۔"

"وہ تو میں جان ہی چکی ہوں جتنی قدر کرتے ہو۔" آبدار نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

"آبی یار! تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تو تمہیں صرف یہ احساس کروانا چاہتا تھا ہماری محبت ویلنٹائن ڈے کی محتاج نہیں ہے اور نہ ہی ہم مسلمانوں کا اس دن سے کوئی واسطہ ہے۔ کسی بھی قوم کے تہوار ان کی پہچان ہوتے ہیں اور ان کے دین سے مطابقت رکھتے ہیں اور ہمارا اسلام ایک مکمل طرز زندگی کا نام ہے۔ ہم مسلمانوں کی اپنی مذہبی روایات ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔" (آلی عمران: 85)۔ یوں امت مسلمہ کا ہر شخص

”تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم مسلمان ہو کر کتنی جلدی غیر مذہبی تہوار اپنا لیتے ہیں مگر کبھی تم نے کسی غیر مسلمان کو ہمارا کوئی تہوار منانے یا اس میں شریک ہوتے دیکھا ہے؟“ اس کے سوال پر آبدار کی نظریں جھک گئیں۔

”یہ سب ہمارے ایمان کی کمزوری ہے آبدار کہ ہم وہ سب جلدی سے اپنا لیتے ہیں جس سے ہمیں ہمارا اللہ اور ہمارے نبی منع فرماتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کا تو اب یہ حال ہے کہ اگر ہم اپنے نبی کی شان میں کوئی میلاد منعقد کر لیں تو دوسرے فرقے کے لوگ آ کر حوالے مانگنے لگتے ہیں کہ بتائیں میلاد کا حکم کہاں دیا گیا ہے۔ اگر ہمیں نبی کی شان میں سجانی جانے والی محفل کا حوالہ دینا ہے تو پھر ویلنٹائن ڈے، پیسی کرسمس ڈے جیسے دنوں پر ان مسلمانوں کی زبانوں کو تالے کیوں لگ جاتے ہیں؟ کیوں ان کو پھر حوالے احادیث کا خیال نہیں رہتا۔ تم خود بتاؤ آبدار کیا سچے مسلمان ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نبی کی تعریف بیان کرنے پر حوالے مانگیں اور غیر مذہبی تہواروں کو منانے میں خاموش تماشاکی بنے بے حیائی پھیلتی دیکھتے رہیں۔“ آبدار کے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ اب تک نظریں جھکائے کھڑی خاموشی سے سالار کو سن رہی تھی۔

”کل رات نہ تو میں آفس کے کسی کام میں مصروف تھا اور نہ ہی دوستوں کے ساتھ تھا۔ میں صرف اسی لیے دیر سے آیا تھا کہ جلدی آ کر کل تمہیں یوں سمجھانہ پاتا اور تمہارے محبت سے کیے گئے اہتمام پر تمہیں سمجھانے کے بجائے خود بھی مجبوراً سیلبریشن میں شریک ہو جاتا لیکن میں تمہیں احساس کروانا چاہتا تھا۔ تمہیں یہ سمجھانا

چاہتا تھا کہ ہماری پاکیزہ محبت کسی بھی غیر مذہبی تہوار کی محتاج نہیں ہے۔

”میں کل محض تمہیں خوش کرنے کے لیے اللہ پاک کو ہرگز ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب اللہ ناراض ہوتا ہے تو کسی کے بھی راضی ہو جانے سے سکون نہیں ملتا لیکن اب بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے تو مجھے معاف کر دو اور جو سزا دینا چاہو دے لو۔ میں تمہارے سامنے حاضر ہوں۔“ سالار نے ذرا سا جھک کر اپنا سر خم کرتے ہوئے کہا تو آبدار کی آنکھ سے آنسو کا موٹی ٹوٹ کر زمین بوس ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی اس کے رو برو آ کر کھڑی ہوئی۔

”سالار! مجھے معاف کر دو، میں نے تمہیں غلط سمجھا اور غصے میں نہ جانے کیا کچھ بول گئی۔ میں سبھی تھی تم مجھ سے پورے ہو گئے ہو اور اب مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ اسی لیے مجھے ویلنٹائن ڈے بھی وش کرنا ضروری نہیں سمجھا مگر میں اپنی سوچ پر شرمندہ ہوں، پلیز مجھے معاف کر دو، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں آج کے بعد کبھی کوئی غیر مذہبی تہوار نہیں مناؤں گی اور میں بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ ہماری محبت واقعی ہی کسی ایک دن کی محتاج نہیں۔ ہماری محبت کا تو ہر دن بہت خاص ہے۔ جیسے رات کے بعد ہر نئی صبح بہت اہم ہوتی ہے۔“ آبدار نے سالار کے سینے پر سر ٹکاتے ہوئے غم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا تو سالار نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کی ہائی کلاس سوسائٹی کی ماڈرن وائف کو وہ با آسانی سب کچھ سمجھا سکا تھا۔

کمرے میں مہکتی گلاب کی پتیوں کی مہک اب دونوں کی زندگیوں کو بھی مہکانے لگی تھیں۔

☆.....

”آپا جانی! میں بازار جا رہی ہوں اگر کوئی کام ہے تو بتا دیجیے۔“ تمہینہ بیگم نے اپنی بڑی بہن اور رشتے میں لگنے والی جھٹھانی روبینہ بیگم سے کہا۔

”کام..... ہاں یاد آیا، تمہارے بھائی صاحب کے سوٹ ڈرائی کلین ہونے گئے تھے وہ لیتی آتا۔“ روبینہ بیگم نے کہا اور اٹھ کر دراز سے رسید نکال تمہینہ کو تھما دی۔

محمود حسن، ریاض حسن اور احمد حسن تینوں بھائی تھے اور ان تینوں سے بڑی ان کی بہن تھیں، جنہیں سب منیبہ آپا کہتے تھے۔ بھائیوں میں سب سے بڑے محمود حسن، پچھلے ریاض حسن اور سب سے چھوٹے احمد حسن تھے۔ محمود حسن اور ریاض کی شادیاں خالہ زاد اور چچا زاد بہنوں روبینہ اور تمہینہ سے ہوئی تھیں جب کہ احمد حسن نے اپنی مرضی سے شادی خاندان سے باہر کی تھی۔ ان کی بیگم نورین بھی کافی سنبھلی ہوئی خاتون تھیں۔ تینوں بھائی ایک ساتھ ہزار گز رقبے پر محیط بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ محمود حسن کے دو بچے تھے۔ شاہ زیب اور بیٹی شہلا، پچھلے بھائی ریاض حسن کے تین بچے تھے۔ اقرار، احمر اور ارسلہ جب کہ احمد حسن کی صرف ایک ہی اولاد تھی ان کی لاڈلی عنادل۔ شہلا کی شادی اس کے چچا ریاض حسن کے بیٹے اقرار سے ہو چکی تھی۔ جب کہ شاہ زیب سی ایس ایس کر کے سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ جو ان کرتے ہی اس کی پوسٹنگ اسلام آباد ہو گئی تھی۔ عنادل، احمر اور ارسلہ

عنادل تمہاری بوٹی دل ہے

مکمل ناول

ایس حبیب خان

اے لیونز کے اسٹوڈنٹس تھے۔ جب کہ منیبہ آمارا دلپندی میں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی کوئی اولاد نہ تھی مگر پھر بھی انہوں نے بھائی کے گھر آنے کے بجائے شوہر کے گھر رہنے کو ترجیح دی، کیونکہ اس گھر میں ان کے شوہر کی یادیں بسیں ہوئی تھیں۔

تمہینہ بازار سے آ کر صوفے پر نیم دراز ہو گئیں۔

”کیا ہوا بھائی؟“ نورین بیگم نے انہیں اس طرح دیکھ کر سوال کیا۔

”بھئی! خدا کی پناہ اتنی گری تھی کہ میرے سر میں درد ہونے لگا۔“

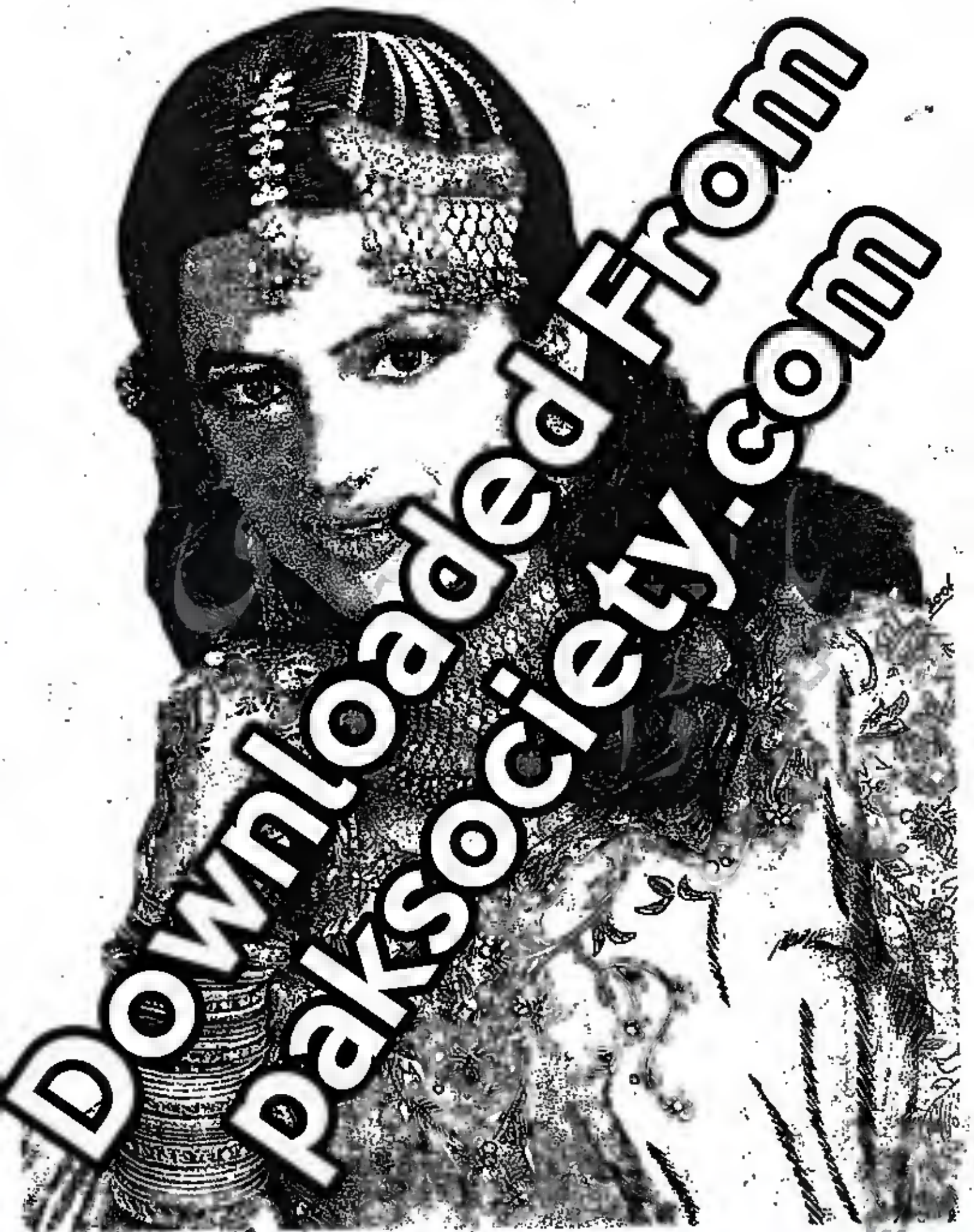
”اچھا آپ اپنے کمرے میں جائیں میں آپ کے لیے جوس بھجواتی ہوں۔“ نورین نے کہا۔

”اچھا آپ جاتے ہوئے ذرا یہ آپا کو دے دیں گی؟“ انہوں نے ہنگ ہوئے سوٹ نورین کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں بھابی!“ نورین بیگم نے سوٹ لیتے ہوئے کہا۔ پھر نورین بیگم نے روبینہ آپا کے کپڑے ان کے حوالے کر دیئے۔

”نورین! یہ عنادل کہاں ہے؟ نظر نہیں آتی کافی دیر سے؟“ روبینہ بیگم نے سوال کیا۔

”بھابی! ہوگی کہاں، نہیں بند رہی دھاچہ کڑی مچا رکھی ہوگی۔“ نورین بیگم بولیں۔ تو روبینہ بیگم مسکراویں۔



READING
Section



”ارے بھئی بچی ہے، یہ ہی تو دن ہے اس کے کھینے کو دنے کے۔“ روینہ بیگم نے بیڈ پر پیر پھیلاتے ہوئے کہا۔
 ”وہ تو ٹھیک ہے بھائی! مگر کھیل کھیلے بھی تو لڑکیوں والے۔“ نورین بیگم نے بیٹھتے ہوئے کہا اور ان کی بات غلط بھی نہیں تھی۔ عنادل بھی بالکل اپنے نام کی طرح چپکتی، اچھلتی کوونی دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف، اس کے سارے شوق لڑکوں والے تھے ٹینس کھیلنا، گٹار بولے کرنا، کزنز سے فائننگ کرنا، کپڑے بھی وہ لڑکوں والے ہی پہنتی، آج تک اس نے لڑکیوں والا کوئی بھی فیشن نہیں کیا تھا۔ ہاں بھی اس کے چھوٹے ہی ہوتے۔ دھڑ سے دروازہ کھلا تو روینہ اور نورین دونوں چونک گئیں۔ عنادل ایک دم اندر داخل ہوئی اور بیڈ پر اوندھی گر گئی۔
 ”یہ کیا بد تمیزی ہے عنادل! دروازہ ناک کر کے اندر آتے ہیں کوئی میز نہیں تمہارے اندر؟“ نورین بیگم برہمی سے بولیں۔

”ای! پلیز اس وقت کچھ نہ بولیں۔ میرا موڈ آف ہے۔“ عنادل نے کہا اور جھٹ روینہ کی گود میں سر رکھ کر ان کے جسم کے گرد بائیں لپیٹ لیں۔

”کیا ہوا میری عنادل کو، کیوں موڈ آف ہے؟“ روینہ بیگم نے اس کو گود میں سموتے ہوئے کہا۔

”بڑی ای! احمر کا بچہ اتنا بے ایمان ہے کہ.....“

”ارے بھئی احمر کا بچہ کہاں ہے ہمیں بھی تو ملو ادا۔“ روینہ بیگم نے اسے چھیڑا۔

”ناٹ فیئر! بڑی ای۔“ عنادل نے منہ مزید چھپا لیا تو وہ مسکرا دیں۔

”اچھا اٹھو! یہ دیکھو میں تمہارے لیے ڈریس لائی ہوں پرسوں انم کی منگنی پر پہن لینا۔“ نورین بیگم نے

شاہجک بیگم اٹھاتے ہوئے کہا۔

”سیمیل ڈریس؟“ عنادل نے منہ اندر کیے وہیں سے پوچھا۔

”ہاں تو اور کیا ہوگا۔ تم لڑکی ہی ہونا تو ڈریس بھی لڑکیوں والا ہوگا۔“ نورین بیگم بولیں۔

”پیسے ضائع کیے ہیں آپ نے، ہاں اگر ڈینیم یا رائڈ ڈشرٹ لائیں تو ٹھیک تھا۔“ عنادل نے کہا۔

”اللہ کو مانو لڑکی! منگنی میں ایسے کپڑے پہن کر جاؤ گی اپنا نہیں تو ہماری عزت کا خیال کر لو، سارا خاندان

باتیں بنائے گا۔ حد ہوتی ہے ہر چیز کی۔“ نورین بیگم بولیں۔

”تو پھر ٹھیک ہے میں نہیں جاؤں گی آپ انم سے معذرت کر لیجئے گا اور حالہ ای سے بھی۔“

”ارے بس بھی کرو نورین۔“ روینہ بیگم نے پیار سے عنادل کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں انگلیاں

پھیرتے ہوئے کہا۔ نورین بیگم سر ہلا کر رہ گئیں۔ عنادل جو ایک دفعہ کہہ دیتی پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے اس بات

سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ ہاں بڑے ابو یعنی محمود حسن کی کوئی بات عنادل رد نہیں کرتی تھی۔ اپنے ماں باپ سے زیادہ

وہ محمود حسن اور روینہ بیگم کے قریب تھی کسی کو کوئی بات منوانی ہوتی تو وہ عنادل کی سوس لگاتے اور محمود حسن جھٹ

مان جاتے اور اس مرتبہ بھی عنادل نے منگنی میں نہ جا کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنی ضد کی کتنی پکی ہے۔

☆.....☆

”بھئی آپ سب لوگوں کے لیے گڈ نیوز ہے کہ شاہ زیب کچھ روز کے لیے کراچی آرہا ہے۔“ محمود حسن نے

ناشتے کی میز پر سب کو بتایا تو سب خوش ہو گئے۔ شاہ زیب پانچ سال بعد واپس آ رہا تھا وہ تو شہلا کی شادی پر بھی

نہ آسکا تھا کیونکہ وہ ٹریننگ کے لیے انگلینڈ چلا گیا تھا۔ جب شاہ زیب گیا تھا تو عنادل آنٹھویں جماعت میں تھی۔

وہ شاہ زیب سے بالکل بھی بات نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ بہت ڈسپن اور پڑھا کو بندہ تھا اور عنادل کے خیال میں وہ

ایک پور پرستاشی کا مالک تھا ہاں احمر اور اسلہ سے اس کی پکی یاری تھی۔ شاہ زیب کی بہن شہلا بھی لیے دیے رہتی تھی۔ عنادل کی اس سے بھی دوستی نہیں تھی۔

”السلام علیکم بابا! خیریت کیسے فون کیا؟“ شاہ زیب، محمود حسن کی کال پر پریشان ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا اچانک اس طرح فون کرنے کی کوئی توجہ ہوگی ورنہ شام کو تو ہی اس نے بات کی تھی۔

”ہاں بیٹا! سب خیریت ہے، دراصل مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی اور میں چاہ رہا تھا کہ تمہارے کراچی آنے سے قبل یہ بات کروں تاکہ تم ذہن بنا کر آؤ۔“ محمود حسن نے کہا۔

”جی بابا کہیے!“ شاہ زیب نے کہا۔

”بیٹا ہم بڑوں نے عنادل کو تم سے منسوب کر دیا تھا مگر ہم نے تم لوگوں کو بتایا اس لیے نہیں کہ بچوں کے ذہن پر جانے کیا اثر ہو اب جب کہ تم دونوں بڑے ہو گئے ہو تو ہم نے اور عنادل کے ماں باپ نے اپنے اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم یہاں آ جاؤ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو ہمیں بتا دینا۔“ محمود حسن نے اپنی منشا بیان کی۔

”جی بہتر بابا!“ شاہ زیب نے فرمانبرداری سے کہا اور فون رکھ دیا۔ اس نے محمود حسن پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں، بابا نے تو اس کے دل کے اندر دبی بات جانے کیسے جان لی تھی۔ وہ اس کی محبت کو اس کے حوالے کرنے کی بات کر رہے تھے۔ اس کا دل خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔

”آئی لو پو بابا!“ اس نے نعرہ لگایا۔ شاہ زیب کے دل کو عنادل نے اس وقت گرفت میں لے لیا تھا۔ جب وہ دونوں بچپن کی حدوں سے آگے نکلنے لگے تھے۔ عنادل بے حد گوری رنگت کے ساتھ جب دھوپ میں کھیل کر آتی تو اس کے گال سب کی مانند سرخ ہو جاتے۔ جانے شاہ زیب کو وہ کیوں بہت یاری لگتی اور جب وہ کوئی سوال کر کے ہرنی جیسی آنکھوں کو جھپکائی جنہیں گھنیری پلکوں نے ڈھانپ رکھا ہوتا تو شاہ زیب کا دل دھڑکنا بھول جاتا۔ اس وقت اسے اس کیفیت کا نام نہیں معلوم تھا اور نہ ہی اس نے کسی پر بھی ظاہر ہونے دیا مگر آج بابا نے تو اس کی مشکل ہی آسان کر دی۔ اس کی محبت کو اظہار کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ محمود حسن نے عنادل کو پہلے ہی اس کے لیے مانگ لیا تھا۔ شاہ زیب بستر پر کروٹیں لے رہا تھا کہ وہ جلد کراچی جائے اور اپنی محبت کا دیدار کرے۔ ان پانچ سالوں میں تو وہ مزید خوب صورت ہو گئی ہوگی۔ یہ سوچتے سوچتے اس کو نیند نے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

☆.....☆

شاہ زیب فلائٹ پر سوار ہو کر سوچتے لگا۔ سر پر اتڑ ملتے ہی سب کتنا خوش ہو جائیں گے کیونکہ اس نے اپنی فلائٹ کا وقت نہیں بتایا تھا۔ وہ جب گھر آیا تو اسے کوئی نظر نہ آیا وہ سیدھا امی کے روم میں گیا۔ روبینہ بیگم لیٹی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ اسلہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ شاہ زیب کو شرارت سوجھی تو وہ دبے قدموں اسلہ کی طرف گیا۔ اس نے روبینہ بیگم کو اشارے سے منع کر دیا۔ پھر شاہ زیب نے اسلہ کے ہاتھ سے ریسیور چھینا اور اس میں بولا۔

”لی بی! اسلہ آپ سے بعد میں بات کریں گی۔“ اور فون رکھ دیا۔

”یہ کیا حرکت ہے شاہ زیب بھائی؟“ اسلہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا حکمت ہے۔“ شاہ زیب نے ہلکی سی چپت اسلہ کے سر پر لگائی پھر مزید بولا۔

ردا زانچسٹ 87 فروری 2016ء

READING
Section

”اے بھائی کوفون کرنے میں تو تمہارے ہاتھوں میں ہندی لگ جاتی ہے، دوستوں سے کہیں مارتے نہیں تھکتیں۔ جیسی کہوں گھر کا اتنا لمبا بل کیوں آتا ہے؟ تو وہ تم ہو۔“ شاہ زیب نے اس کے بال بھی کھینچے۔
 ”تائی ای! دیکھیں ماں بھائی کو۔“ ارسلا کا بس نہ چلا تو اس نے روہینہ بیگم کی حمایت سمیٹی۔
 ”شاہ زیب بیٹا! بری بات ہے کیوں ستار ہے ہو بہن کو۔“ انہوں نے مصنوعی غصے سے مسکراتے ہوئے کہا تو شاہ زیب نے سچ کر ارسلا کو گلے سے لگالیا۔

”میری پیاری گڑیا!“ اور ارسلا نے بھی اس کے گرد بائیں لپیٹ لیں سب کو شاہ زیب کے اچانک آجانے کی خبر ملی تو سب آگے مگر عنادل اپنے کمرے میں ہی رہی۔ کھانا لگ گیا ان کی ملازمدارانی بلانے آئیں تو عنادل نے آنے سے صاف منع کر دیا اور بولی۔
 ”اس وقت اگر زلزلہ بھی آجائے تو میں یہاں سے نہیں اٹھوں گی۔ آپ ایسا کریں میرا کھانا یہیں لے آئے۔“ سب کھانے کی میز پر بیٹھے تھے مگر شاہ زیب کی نگاہیں اس حسین پیکر کی متلاشی تھیں مگر انابی نے آکر اس کے ارنائوں پر اوس ڈال دی۔

”عنادل بیٹا نے کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوا یا ہے۔“

”اوہ شٹ!“ احمر نے زور سے کہا۔

”احمر!“ محمود حسن نے اسے سمجھنے کی۔

”سوزی! بڑے ابو آج فٹ بال ورلڈ کپ فائنل ہے۔“ احمر نے کہا۔

”تو بیٹھے کیوں ہو یہاں جاؤ۔“ ارسلا نے جل کر کہا۔

”اف یو گائز ڈونٹ مائنڈ میں عنادل کے ساتھ کھانا کھا لوں؟“ احمر نے بڑوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا جاؤ۔“ احمد حسن نے بولا۔ تو احمر جلدی سے اٹھ گیا۔

”انابی میرا کھانا بھی وہیں لے آئیے گا پلیز۔“ اور عنادل کے روم کی طرف چلا گیا۔

”عنادل“ بیسی“ کا سچ چھوڑ دے امپا سبل۔“ ارسلا نے کہا اور نوال منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ شاہ زیب کا موڈ آف ہو گیا۔

”اتنے سالوں بعد آیا ہوں اور محترمہ کو ملنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔“ وہ سوچتے ہوئے چمچے سے چاولوں کو پلیٹ میں ادھر ادھر کر رہا تھا۔

”بیٹا کھانا پسند نہیں آیا؟“ ریاض حسن نے پوچھا۔

”نہیں چچا جان۔ وہ بس بھوک نہیں ہے تھکن ہو رہی ہے۔“ شاہ زیب نے کہا اور دو چار لقمے لے کر اپنے کمرے میں لائٹ آف کر کے سو گیا۔

☆.....☆

ناشتے کی میز پر سب آگئے تھے۔ سب سے آخر میں وہ آئی۔ ٹائٹ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں وہ بھی بغیر دوپٹے کے چھوٹے چھوٹے بال وہ میز پر آ کر دھب سر رکھ کر ادگھنے لگی۔ شاہ زیب دھک سے رہ گیا۔ اس نے جو تصور میں اپنی محبت کے سراپے کو تراشا تھا وہ کاسچ پر لگنے والی کاری ضرب کی مانند چھتا کے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔

”یہ عنادل ہے؟ وہ ہی جس سے میں نے پیار کیا تھا؟“

”کب سوئے تم دونوں؟“ تمہینہ تائی نے پوچھا۔

”ساڑھے چار بج گئے تھے۔ میچ کے بعد ایوارڈ سیر منی بھی تھی نا۔“ عنادل نے بوجھل انداز سے کہا۔ شاہ زیب کی نگاہیں اسی کا طواف کر رہی تھیں۔

”گلتا ہے اس میچ میں ایسی کوئی گول نہ کر سکا۔ کیوں عنادل؟“ محمود حسن نے عنادل کی نیند بھگانے کے لیے کہا۔

”بڑے ابو! اس امپاسیمل۔“ عنادل کو ایک دم کرنٹ لگا ہوا نو۔

”اب ہوئی ہے میرے بیٹے کی مارنگ۔“ محمود حسن نے عنادل کو چھیڑا تو وہ مسکرانے لگی اور اس کے سبب جیسے گالوں میں بھنور پڑ گئے۔ شاہ زیب لہجہ بھر کو اس کی مسکراہٹ میں کھو گیا۔

”بیٹا شاہ زیب! تم ناشتہ شروع کرو، رات بھی تم نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔“ روینہ بیگم نے اس کی پلیٹ میں پراٹھا رکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز پر بھی عنادل شاہ زیب کو ٹوٹلی انگور کر کے اپنی پلیٹ میں سے آلیٹ کانٹے سے اٹھا کر منہ میں رکھنے لگی۔

شاہ زیب سب کے لیے لکھنٹس لایا تھا مگر اس نے عنادل کو کچھ نہ دیا۔

”بھائی آپ عنادل کے لیے کچھ نہیں لائے؟“ ارسلہ نے پوچھا۔

”سوری ڈیر! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان میں لڑکیوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ اس لیے ان کو میرا گفٹ بریکار لگے گا سو میں نے نہیں دیا۔“ شاہ زیب نے سٹر حیاں اترتی عنادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نو ٹھیکس! میں ہر کسی سے چیز لینا پسند نہیں کرتی، صرف اپنے قریب کے لوگوں سے تعلق رکھتی ہوں۔“

عنادل نے منہ توڑ کر شاہ زیب کو جواب دیا اتنے میں عنادل کا موبائل بجا۔

”ہاں! حارث شام کو چل رہے ہوں۔“ عنادل بات کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اس نے شاہ زیب کے تاثرات دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی۔

”ارسلہ! یہ حارث کون ہے؟“ شاہ زیب نے پوچھا۔

”بھائی! عنادل کا کلاس فیلو ہے۔“ ارسلہ نے کہا اور چلی گئی شاہ زیب غصے سے انگلیاں پٹخانے لگا۔

”عنادل! الوامی نے بھیجے ہیں۔“ ارسلہ نے فریج فرائز اور سوٹ ڈرنک میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ عنادل اپنی کرسی پر بیٹھی ہو کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھیں ہوئی تھیں۔ ٹائٹ جینز میں اس کے پیر نمایاں ہو رہے تھے۔ سامنے سے آتی شہلا کو عنادل کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔ وہ ارسلہ اور عنادل کے پاس آگئی۔ عنادل نے وہیں سے جھک کر پلیٹ اٹھائی اور گود میں رکھ کر فریج فرائز کھانے لگی۔

”کبھی کچن کی شکل بھی دیکھ لیا کرو عنادل۔“ شہلانے کہا۔

”مجھ سے نہیں ہوتے یہ لڑکیوں والے کام۔“ عنادل نے گلاس میں سے سب لیتے ہوئے کہا۔

”شادی کے بعد اگر میاں کے ساتھ اکیلے گھر میں رہنا پڑ گیا تو کیا کھلاؤ گی اسنے آپ کو اور اپنے میاں کو؟“

شہلانے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ عنادل کو ابھمن ہونے لگی اس نے گردن جھنجھکی اور ہینڈ فری لگا کر موبائل میں گم ہو گئی۔

☆.....☆

”عنادل بیٹھو!“ نورین بیگم نے اس کے کمرے میں آ کر کہا جہاں عنادل کھڑی اسکرین پر چینل چینج کر رہی

”جی کہیں ای! میں سن رہی ہوں۔“ عنادل کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں اب میوزک چینل پر راک شو آ گیا تھا۔ نورین بیگم نے اٹھ کر اسے آف کر دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے آئیں۔

”عنادل! اپنے جینے کے ڈھنگ بدلوا اور لڑکیوں والا انداز طور طریقے اپناؤ۔“ نورین بیگم بولیں۔

”بس ای! کیا پھر کوئی شادی کی تقریب آرہی ہے؟“ عنادل نے لا پرواہی سے کہا۔

”ہاں! اور اس بار تقریب ہوگی تمہاری شادی کی۔“

نورین بیگم نے کہا تو عنادل اچھل پڑی۔

”آریوان یور سنس؟“ وہ بے اختیار بولی۔

”عنادل! اپنی حد میں رہو۔“ نورین بیگم بھڑک گئیں۔

”نہیں! مجھے آپ یہ بتائیں کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ مجھے شادی نہیں کرنی تو پھر آپ یہ بات کیوں کر رہی ہیں؟“ عنادل نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

”یہ فیصلہ آج نہیں برسوں پہلے ہو چکا ہے۔ ہم بڑوں نے بچپن میں ہی تمہارا اور شاہ زیب کا رشتہ طے کر دیا تھا۔“ نورین بیگم نے بتایا۔

”اوہ کم آن ای! کبھی بات کہ میں شادی نہیں کروں گی اور دوسری اس سٹرل شاہ زیب سے تو کسی صورت نہیں۔“ عنادل نے صاف کہا۔

”بس بہت ہوگئی تمہاری من مانی ابد لو اپنے انداز کو۔“ نورین بیگم نے کہا اور روم سے چلی گئیں۔ عنادل نے زور سے ریمنٹ کو صوفے پر پھینک دیا اس کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

”شاہ زیب! تم ہوتے کون ہو میری زندگی کے مالک بننے والے؟ یہ میری زندگی ہے صرف میری۔“ عنادل غصے سے بڑبڑائی۔

”مجھے عنادل سے بات کرنی چاہیے۔ آخر کو وہ میری محبت ہے۔“ شاہ زیب نے سوچا اور پھر فیصلہ کن انداز میں سیڑھیاں اتر کر اس سے بات کرنے آنے لگا مگر سیڑھیاں اترتے اس کے قدم اچانک رک گئے۔ سیڑھیوں سے نیچے زمین پر احرار گرا ہوا تھا اور عنادل اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھی اس پر کئے برسار ہی تھی۔ اس نے جینز اور

وائٹ ہاف سیلوو شرٹ پہنی ہوئی تھی اور کار کے ٹین کھلے ہوئے تھے اور احرار اپنے بچاؤ میں اس کے ہاتھ پکڑ رہا تھا۔ شاہ زیب یہ منظر دیکھ کر کھول اٹھا وہ زور سے دھاڑا۔

”احرار! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”بھائی وہ.....“ احرار نے بولنا چاہا۔

”یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ کو مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

عنادل نے ہانپتے ہوئے کہا اس کے گال دھک رہے تھے۔ شاہ زیب ہیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ غصے سے اس کی کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

”جب اسے مجھ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو پھر میں کیوں پاگل ہو جا جا رہا ہوں اس کے پیچھے۔ ضرور اسے کوئی اور پسند ہے جی تو وہ اس کے لیے مجھے نظر انداز کر رہی ہے۔“ شاہ زیب نے خود سے کہا۔ شاہ زیب نے سردرد کا بہانہ کر کے کھانے سے منع کر دیا وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہلا دووہ کا گلاس لے کر آگئی۔ اس نے

شاہ زیب کو آواز لگائی۔

”بھائی!“ شاہ زیب کی آنکھ کھلی تو شہلا چونک گئی۔ اس کی آنکھیں انکارے کی طرح دپک رہی تھیں۔

”بھائی آپ نے کھانا نہیں کھایا یہ دودھ پی لیں۔“ اس نے کہا۔

”رکھ دو! بچھی میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔“ شاہ زیب بولا۔

”ابنی ٹینشن؟“ شہلا نے پوچھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ شہلا! عنادل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

عنادل نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے شاہ زیب کے منہ سے اپنا نام سنا تو اس کے قدم رک گئے۔

”کیا مطلب بھائی! اچھی ہے۔“ شہلا نے کہا۔

”میرا مطلب اس کی حرکتوں سے ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، سینے اوڑھنے کی تیز، گھر میں اتنے بڑے اور لڑکے

موجود ہیں میڈم کو اتنی شرم نہیں کہ دوپٹہ ہی لے لیں، لڑکوں سے دوستی اور ہاتھ پائی، شاید اسے کسی نے

احساس نہیں دلایا کہ وہ لڑکی ہے اور ان کی کچھ لمٹ ہوتی ہیں۔“ شاہ زیب کے الفاظ اسے تیر کی طرح چھلنی

کر رہے تھے۔

”بھائی عنادل، بچپن سے ہی ایسی ہی زندگی گزار رہی ہے۔“ شہلا نے کہا۔

”تو گھر کے بڑوں نے کیا آنکھیں بند کر لیں ہیں؟ حج غلط کی تفریق کو بھول گئے ہیں؟“ اس کے سوالوں کا

شہلا کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ واقعی ان لوگوں کی لاپرواہی بلکہ غلطی کہا جائے تو بجا نہ ہوگا، بھئی۔

”گھر کے بڑوں نے تو آرام سے اسے میرے پلے باندھنے کا فیصلہ کر لیا مگر میرے بارے میں سوچا۔ ای

بابا کو میری زندگی کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میں لوگوں میں اپنی بیوی کو کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ جب میری بیوی روڈ

پر لڑکوں کی طرح دوستوں سے جھگڑے گی۔ ہاتھ پائی کرے گی، بغیر دوپٹے کے پھرے گی۔“ شاہ زیب لاوے

کی طرح ابل پڑا۔

”بھائی! میری بات تو سنیں۔“ شہلا بولی۔

”تم میری بات سنو معاف کرنا شہلا مگر عنادل میں لڑکیوں والی ایسی کوئی بات نہیں جس کی بنا پر میں اس سے

شادی کروں۔ نہ شرم و حیا، نہ سلیقہ اور نہ رکھ رکھاؤ۔ کچھ بھی تو نہیں ہے اس میں۔ امی بابا سے ابھی بات کر کے

میں ان کا دل نہیں توڑنا چاہتا مگر تم تو میری بہن ہونا اس لیے تمہیں اپنے دل کی آواز سناؤ۔“

”شہلا! مجھے عنادل سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”انٹیکٹ! مجھے تو کیا کسی بھی ذی ہوش مرد کو اس سے شادی کرنے میں کوئی چارم نہیں ہوگا۔ تم ابھی امی بابا

سے کچھ مت کہنا۔ مجھے اور ان کو وقت چاہیے۔

”میں اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ ایسے نہیں کر سکتا۔“ شاہ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ عنادل فوراً تیز قدم

اٹھاتی اپنے کمرے میں آگئی اور دھم سے بستر پر چت گر گئی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کا بس نہیں

چل رہا تھا کہ شاہ زیب کا منہ نوج لے۔

”اتنی انسٹ..... مسٹر شاہ زیب تم کیا منع کرو گے۔ میں تمہیں رجیکٹ کرتی ہوں تم سے شادی کرتی ہے

میری جوتی۔“ عنادل نے غصے سے کہا اور ہیڈ فونز لگا کر میوزک کا ویوم فل کر لیا۔ شہلا کے جانے کے بعد شاہ

زیب سیدھا لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”عنادل! تمہیں اپنی زندگی میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ میرے لیے کیسا ہے یہ صرف اور صرف میرا دل جانتا

ہے۔ تم نے میرے لیے کوئی آپشن ہی کب چھوڑا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں کیا کچھ نہیں سوچا تھا اور تم کیا نکلیں۔“ آنسوؤں کے قطرے شاہ زیب کی آنکھوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہو گئے اور اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

☆.....☆

”یار پکنگ کا پروگرام بنا تو لیا ہے مگر اجازت کون لے گا۔ پتا ہے ناں تھوڑے دن میں ایگزائمز شروع ہو رہے ہیں۔“ احمر نے پاستہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا جو اس نے تھوڑی ہی دیر پہلے آرڈر کیا تھا۔

”اپنا کینٹین لے گا اور کون لے گا؟“ ارسلہ نے عنادل کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا جو کہ پاستہ کھانے میں مصروف تھی۔

”ارے یہ بھی کوئی ٹینشن کی بات ہے جو مزہ کر کر کر رہے ہو، مہم مہم مہم یی۔“ عنادل نے ڈرنک کا سہ لیا اور دوبارہ پاستہ سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک ہے چیچ ہے تمہارے لیے دس منٹ میں اجازت لے کر دکھاؤ۔“ احمر نے کہا۔

”منظور ہے تم گھڑی میں ٹائم دیکھو میں دس منٹ میں اجازت لے کر آتی ہوں۔“ عنادل نے احمر سے کہا تو اس نے گھڑی کی طرف نگاہ کی چھ بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ عنادل محمود حسن کے کمرے میں گئی اور بولی۔

”بڑے ابو۔“

”جی میرا بچہ۔“ بڑے ابو نے کتاب سے نظر بن اٹھاتے ہوئے کہا وہ ایزی جیسر پر بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے۔

”بڑے ابو مجھے بہت بوریت ہو رہی ہے تو میں نے سوچا کیوں ناں ہم سب پکنگ پر چلیں۔“ اس نے نیچے جھک کر لاڈ سے ہاتھیں محمود حسن کے گلے میں ڈال کر پوچھا۔

”مگر بیٹا کچھ دن میں تو ایگزائمز شروع ہو رہے ہیں ناں تم لوگوں کے؟“ انہوں نے کہا۔

”ہم پڑھ پڑھ کر تھک گئے ہیں۔ بڑے ابو تھوڑا فریش ہو جائیں گے۔“ عنادل نے کہا۔

”ٹھیک بابا، جیسے میری گڑیا کی خوشی۔“ انہوں نے پیار سے عنادل کے ماتھے پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

”چھینکس بڑے ابو! پو آردی بیسٹ۔“ عنادل نے اچھلتے ہوئے کہا اور کمرے سے دوڑ نکادی۔

”ارے بیٹا! ایسی بھی کیا جلدی ہے آرام سے۔“ محمود حسن نے جاتی ہوئی عنادل سے کہا۔

”اُس اے چیچ بڑے ابو۔“ اس نے جاتے ہوئے زور سے کہا اور دوڑ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ محمود حسن اس کے جانے کے بعد مسکرانے لگے۔ وہ عنادل کو بے حد چاہتے تھے۔ شاید اپنی بیٹی شہلا سے بھی زیادہ سیڑھیاں اترتی عنادل زور سے کسی سے ٹکرانی اور اس سے پہلے لڑکھڑاتی تو اسے کسی نے تھام لیا عنادل نے جو نظریں اٹھا میں تو وہ شاہ زیب تھا۔ چند لمحے تو وہ ساکت رہی پھر سنبھل کر غصے سے بولی۔

”کیا نظر کمزور ہے جو دکھائی نہیں دے رہا۔“

”آنکھوں کے علاج کی ضرورت تو تمہیں ہے جو سامنے سے میں نہیں تو اتنا بڑا باکس بھی نظر نہیں آیا۔“ شاہ زیب کے ہاتھوں میں بڑا سا باکس تھا جو وہ اسٹور روم سے لا رہا تھا۔

”میں تو جلدی میں ہوں آپ ہی دیکھنے کی زحمت کر لیتے۔“ عنادل نے غراتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا آپ کی فلائٹ کس ہو رہی ہے جو جلدی میں نہیں آپ؟“ شاہ زیب نے فٹ سے کہا۔ عنادل چاہتی تو گھنٹوں کیا دنوں کے حساب سے بحث کر سکتی تھی مگر فی الحال اسے جلدی تھی اس نے شاہ زیب کو ایک

طرف دھکیلا اور نیچے دوڑ لگا دی۔ جب وہ احمر کے پاس پہنچی تو گھڑی میں ڈیڑھ منٹ باقی تھا۔
 ”مان گئے باس۔“ احمر نے کہا تو عنادل کھل کھلا کر ہنس دی اور اس کے گالوں میں حسین پھنور پڑ گئے۔

☆.....☆

پکنک پر جانے کے لیے سب گاڑی میں بیٹھے عنادل کا انتظار کر رہے تھے۔ عنادل باہر آئی تو شاہ زیب چونک گیا ریڈی ٹی شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس اس نے سنہری بالوں کو بالکل سمیٹ لیا تھا اور سن گلاسز لگائے وہ دھوپ میں الگ ہی چمک رہی تھی۔ عنادل گاڑی میں آنے کے بجائے روڈ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اتنے میں سامنے سے ایک سفید کار آگئی اور اس میں سے دو لڑکے اور ایک لڑکی اتری۔ ان لوگوں کو دیکھ کر عنادل مسکرائی۔
 ”اتنی دیر لگا دی یار!“ وہ لہراتے ہوئے بولی۔

”آ جاؤ بچو! دیر ہو رہی ہے۔“ ریاض حسن نے آواز لگائی تو وہ سب گاڑی میں چڑھ گئے۔ شاہ زیب کے برابر والی سیٹ خالی تھی۔ عنادل کے دوست سکیل اور سارہ بیٹھ گئے اور حارث احمر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ عنادل نے شاہ زیب کے پاس جا کر زور سے کہا۔

”احمر اٹھو! حارث کے ساتھ میں بیٹھوں گی۔“ احمر، شاہ زیب کے برابر آ کر بیٹھ گیا اور عنادل حارث کے برابر میں جا کر بیٹھ گئی۔ شاہ زیب کا موڈ آف ہو گیا۔ اس نے محمود حسن سے کہا جو کہ اس کے آگے بیٹھے ہوئے تھے۔

”بابا! یہ قبیلی پکنک ہے یا کالج پکنک۔“ تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ارے یہ تو اپنے ہی سچے ہیں۔“ گاڑی میں بیوزک چل رہا تھا اور پیچھے سے چاروں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ عنادل جان بوجھ کر شاہ زیب کو تیار ہی تھی اور وہ کامیاب بھی ہو گئی تھی کیوں کہ شاہ زیب کو عنادل کا اس طرح کا طرز عمل ہرٹ کر رہا تھا۔ گاڑی رکی اور سب اتر گئے محمود حسن کا ذاتی ہت تھا جہاں انہوں نے سارا سامان رکھوا دیا تھا۔ خواتین نے جاتے ہی نوڈ کارز سنبھال لیا تھا۔ محمود حسن کے گروپ نے گپ شپ شروع کر دی جب کہ نوجوان پانی میں چلے گئے۔ شاہ زیب حسن ایک چتر پر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں سمندر میں اٹھتی لہروں میں گم تھیں جو چمکتی ہوئی آ کر ساحل کو چھو لیتیں پھر مانو انہیں بے قراری میں قرار آ جاتا مگر خود اس کے اندر جو طوفان برپا تھا وہ کیسے قابو آتا ایسا کون سا بند تھا جو ان طوفانی لہروں کو باندھ دیتا اس کا جواب تو خود شاہ زیب کے پاس بھی نہ تھا۔ دوپہر ہو گئی تھینہ بیگم نے آواز لگائی مگر سب پانی میں مستیوں میں لگے ہوئے تھے۔ پھر انہیں شاہ زیب نظر آیا۔

”شاہ زیب!“

”جی چھوٹی امی۔“ شاہ زیب انہیں بچپن سے ہی چچی کے بجائے چھوٹی امی کہتا تھا۔

”بیٹا! میں نے کہا نا لگا دیا ہے سب کو لے آؤ۔“ انہوں نے کہا تو شاہ زیب وہاں سے اٹھ کر سب کی طرف چل دیا جہاں وہ سب مستیاں کر رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک دم شاہ زیب کے قدم رگ گئے سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے جسم میں خون کی رفتار کئی گنا بڑھ گئی۔ وہ ایک دم غصے میں آ گیا۔

عنادل جھکی ہوئی تھی اور جب کہ حارث نے اسے پیچھے سے جکڑا ہوا تھا۔ عنادل قہقہے لگا رہی تھی۔ شاہ زیب نے ایک دم پیٹھ موڑ لی۔

”شاہ زیب بھائی آئیے نا آپ بھی۔“ اسے اپنے دائیں طرف سے احمر کی آواز آئی۔

”نہیں مجھے بھیگنا پسند نہیں ہے۔ اپنی ویز، چھوٹی ای نے کھانا لگا دیا ہے تم سب کو لے کر آ جاؤ۔“ شاہ زیب اتنا کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور دسترخوان پر آ گیا پیچھے ہی سب شور مچاتے آ گئے۔

”ای میں بس دو منٹ میں آئی۔“ عنادل نے کہا اور چلی گئی۔ سب بیٹھ گئے اور کھانا نکالنے لگے۔ عنادل اندر سے آئی تو اس نے کپڑے پیچ کر لیے تھے۔ بے بی پنک کلر کی شرٹ پہنے دھوپ میں تپے اس کے رخسار وہک رہے تھے جب کہ ہونٹ سرخ گلاب کی ہنکریوں کی مانند ہو گئے تھے۔ شاہ زیب کی نگاہیں عنادل پر آ کر واپسی کا راستہ بھول گئی تھیں۔

”ای! میرا پیزا؟“ عنادل نے بے تابی سے پوچھا۔

”ارے بھئی یہ لو، یہ رہا تمہارا پیزا۔“ نورین بیگم نے اسے پیزا دیتے ہوئے کہا۔ شہلا کی نگاہوں نے شاہ زیب کے جذبات کو بھانپ لیا۔ کھانے کے بعد نو جوان گیمنز کھیلنے لگے۔ شاہ زیب چائے کا کپ لیے چیسر پر بیٹھ گیا۔ شہلا اس کے پاس آئی۔

”بھائی!“

”ہوں۔“ شاہ زیب چونک کر خیالات کی دلدل سے باہر آ گیا۔

”آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ شہلا نے سوال کیا۔

”ارے بھئی چائے پی رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں؟“ شاہ زیب نے کہا۔

”میں عنادل کی بات کر رہی ہوں۔ کیوں اس کو خود اپنے آپ سے دور کر رہے ہیں۔ جب کہ میں جانتی ہوں کہ آپ اسے کتنا چاہتے ہیں۔“ شہلا بولی۔

شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کوئی جانے یا نہ جانے مگر مجھے معلوم ہے کہ عنادل آپ کی بچپن کی محبت ہے۔“ شہلا نے کہا تو شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی پھر بولا۔

”محبت..... یکطرفہ محبت کچھ نہیں ہوتی۔ عنادل کے دل میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں اس کے معیار کا نہیں ہوں اور ناپی وہ میرے معیار پر اترتی ہے، میری بچپن کی محبت کا سراپا جو میرے ذہن میں نقش تھا اسے عنادل نے چکنا چور کر دیا ہے۔“

”وہ دیکھو سائینے۔“ شاہ زیب نے ہاتھ سمندر کی طرف کرتے ہوئے کہا جہاں عنادل اکیلی حارث کے ساتھ پانی میں محل رہی تھی۔ شہلا جھینپ کر شرمندہ ہو گئی۔

”شہلا! مجھے تو حیرت ہے کہ سب گھر والوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ میری بات تو ہٹا دو، لاڈ پیارا اپنی جگہ مگر عنادل نے ساری کمش کر اس کر لی ہیں۔“

”آئی ایم سوری ٹو سے ایسی بے ہودگی کی میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ شاہ زیب نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ شہلا چپ کی چپ رہ گئی۔ پھر سب لوگ گھر لوٹ گئے رات گئے شاہ زیب نے اپنے والدین سے کہا۔

”ای، بابا! مجھے صبح ہی لگانا ہوگا۔“ شاہ زیب نے محمود حسن اور روبینہ بیگم سے کہا۔

”ہوں بیٹا ابھی تو آئے ہو۔“ محمود حسن بولے۔

”بابا! اس رات کی ارجنٹ۔“ شاہ زیب نے کہا اور اگلی صبح کی فلائٹ سے چلا گیا۔ شہلا حقیقت سے واقف تھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مگر شاہ زیب نے اسے منع کیا تھا اس لیے وہ وقتی طور پر تو خاموش ہو گئی مگر اس کے اندر لاوا پک رہا تھا۔

☆.....☆

شہلا چائے کی ٹرے لے کر امی بابا کے کمرے میں لے کر گئی تو دونوں بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شہلا نے سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھی اور بولی۔

”چائے فوراً بناؤں یا تھوڑی دیر میں پیئیں گے؟“

”بیٹا بنا دو۔“ روینہ بیگم نے کہا تو شہلا لی پاٹ سے چائے کپ میں نکالنے لگی۔

”بیگم! اگر شاہ زیب کو جانا نہیں ہوتا تو میں نے ایک تقریب میں ان دونوں کے رشتے کے بارے میں سب خاندان والوں کو بتانے کا پروگرام بنایا تھا۔“ شہلا نے چائے کے کپ دونوں کی طرف بڑھائے۔

”میں تو جلد عنوان کو بہو بنانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“ روینہ بیگم نے کہا۔ شہلا نے موقع بہتر جان کر شاہ زیب کے دل کی آوازاں باب تک پہنچانے کا ارادہ کر لیا۔

”ای، بابا! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ شہلا نے کہا۔

”ہاں بولو بیٹا!“ محمود حسن، شہلا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”مجھے عنوان اور شاہ زیب بھائی کے رشتے کے بارے میں بات کرنی ہے۔ بابا آپ لوگوں نے عنوان کو بھائی کی زندگی کا حصہ بنانے کا فیصلہ تو کر لیا ہے مگر آپ نے بھائی کے بارے میں سوچا ہے کہ ان کی کیا مرضی ہے؟“ شہلا نے بات شروع کی۔

”کیا مطلب ہے تمہارے کہنے کا ہم شاہ زیب سے بات کر چکے ہیں۔ انٹیکٹ اگر اسے جلدی نہ جانا پڑتا تو ہم رسم کر لیتے۔“ روینہ بیگم بولیں۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ لوگوں سے کیا کہوں؟“ شہلا جھنجھلا کر بولی۔

”بیٹا! کھل کر کہو ہم سن رہے ہیں۔“ محمود حسن نے کپ سائیڈ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بابا! شاہ زیب بھائی نے رضا بندی جب ظاہر کی ہوگی جب وہ اسلام آباد میں ہوں گے کراچی آنے کے بعد تو وہ سکتے میں آگئے تھے۔“ روینہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا تو محمود حسن نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

”بابا! آپ لوگوں نے تو اپنی آنکھیں بند کر لیں ہیں۔ حرکتیں دیکھی ہیں آپ لوگوں نے عنوان کی؟ اور پلیز اب مجھے اس کے بچپن کی وہائی میت دیجئے گا۔ کیونکہ جس لڑکی کی شادی کی عمر ہو وہ بچپن کی حدوں سے بہت آگے جا چکی ہوتی ہے۔ صرف سچی کی محبت میں آپ اپنے بیٹے کی زندگی برباد کرنے جا رہے ہیں۔“ شہلا

بولی۔

”بیٹا! شاہ زیب نے کچھ کہا؟“ روینہ بیگم نے سوال کیا۔

”جی مگر انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ آپ لوگوں کو کچھ بتانے سے۔ انہیں عنوان کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کیا سب گھر والوں نے جان بوجھ کر نظریں چرائی ہیں۔ عنوان پر بھی غور کرنے کی بھی زحمت نہیں کی کسی نے اسے تو وہاں اڑھنے کا ہوش تک نہیں ہے اب تک، پرسوں پکنک پر وہ اپنے دوستوں کے

ساتھ انتہائی چپ حرکتیں کر رہی تھی شاہ زیب بھائی نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ شریف گھر کی جوان بیٹیوں کو یہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں اگر بھائی بڑوں کا ادب کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بڑوں کی وجہ

سے ان کی زندگی برباد ہو جائے۔“ شہلا پھٹ پڑی۔

”شادی کے بعد بدل جائے گی عنادل۔“ روینہ بیگم بولیں۔

”اوہ کم آن ای! اپنا بیٹا ہی ملا ہے آپ کو عنادل کے بدلنے کے لیے اور کبھی عنادل سے سوال کیا ہے کہ وہ خود کو بدلنا بھی چاہتی ہے یا نہیں مجھے تو نہیں لگتا کہ اسے بھائی سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی بھی ہے، دن رات لڑکوں میں گھسے رہنا، چلیں شاہ زیب بھائی سے شادی ایک طرف کر دیں۔ کیا بڑوں کو عنادل کی حرکتیں بالکل نظر نہیں آتیں۔ اس کے ماں باپ، چچا چچی کسی نے اسے سمجھایا منع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بابا! لڑکی کتنی لاڈلی ہوگی اس کی کچھ حدیں ہوتی ہیں۔ یہ معاشرتی ضرورت بھی ہوتی ہے اور دین کا حکم بھی اور اس سے منہ موڑنا انسان کو نقصان کی طرف لے جاتا ہے۔ مجھے جو غلط لگا وہ میں نے کہہ دیا باقی آپ بڑے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔“ شہلا وہاں سے چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں موجود نمی کو محمود حسن اور روینہ بیگم دیکھ چکے تھے۔

”شہلا بالکل صحیح کہہ رہی ہے ہم سے واقعی کوئی ہوتی ہے۔“ روینہ بیگم بولیں۔

”اور رہی شاہ زیب سے شادی کی بات تو کل میں عنادل سے خود بات کروں گا۔“ محمود حسن نے فکر مندی سے کہا۔

☆.....☆

کمرے میں تینوں بھائی اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے۔

”بھابی! ہم نے آپس میں رشتوں کو مضبوط کرنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا مگر کیا ہمارے بچے اس فیصلے کو دل سے مانتے بھی ہیں؟“ محمود حسن نے نورین بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔

”بھائی صاحب! میں نے عنادل سے ذکر کیا تھا اس بارے میں۔“ وہ بولیں۔

”ہمارے بچے اب جوان ہو گئے ہیں اور ان کی بھی مرضی ہمیں جانی چاہیے۔“

”کیوں احمد حسن؟“ محمود حسن نے کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی صاحب! مگر مجھے یقین ہے کہ عنادل ہمارے فیصلے کو رد نہیں کرے گی۔“ احمد حسن نے کہا۔

”تو پھر بلائیے عنادل کو۔“ روینہ بیگم بولیں۔ تھوڑی دیر میں عنادل اپنی سابقہ روایت کے مطابق جینز اور ٹی شرٹ میں چوگم چھاتی ہوئی آئی اور دم سے صوفے پر گر گئی۔

”واؤ لگتا ہے کوئی گول میز کانفرنس ہو رہی ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بالکل ٹھیک کہا اور اس کانفرنس کا ایجنڈا ہے ”مس عنادل حسن“۔ ریاض حسن بولے۔

”کیا مطلب؟“ عنادل نے چوگم کو چھینا روک دیا۔

”عنادل! تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے بیٹا۔“ احمد حسن نے بیٹی سے کہا۔

”اوکے کہیے۔“ اس نے کہا۔

”بیٹا تمہارے بڑے ابو اور میں نے تمہارا اور شاہ زیب کا رشتہ بچپن میں طے کر دیا تھا اور اب ہم اس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ رہے ہیں تم کیا کہتی ہو اس بارے میں؟“ احمد حسن نے عنادل سے کہا۔ عنادل رک کر بولی۔

”واہ..... زندگی میری اور فیصلہ دوسرے کریں۔ سوری مگر مجھے نہیں لگتا کہ میں نے آپ لوگوں کو یہ فیصلہ کرنے کا حق دیا ہے۔“ عنادل نے جلدی سے کہا۔

”عنادل! یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ نورین بیگم زور سے بولیں۔

رواڈ انجسٹ 96 فروری 2016ء

READING
Section

”اس میں بد تمیزی کی کیا بات ہے۔ صحیح تو کہہ رہی ہوں۔ میری لائف ہے اسے مجھے کس کے ساتھ گزارنی ہے وہ میرا ذاتی فیصلہ ہے تو آپ لوگ اپنی مرضی سے کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ وہ بھی وداؤٹ مائی پرمیشن۔“

عنادل، احمد حسن غصے کے مارے کھڑے ہو گئے۔

”احمد حسن بیٹھ جاؤ۔“ محمود حسن نے انہیں بیٹھنے کا کہا۔

”بڑے ابو! آپ بتائیں کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ عنادل نے ان سے کہا۔

”بیٹا آپ کو یہاں بلانے کا یہ ہی مقصد ہے کہ آپ کا فیصلہ جان لیا جائے مگر بڑوں سے یوں بات کرتے ہیں؟“ انہوں نے عنادل سے کہا۔

”میں نے کسی سے کوئی بد تمیزی نہیں کی اور جہاں تک بات ہے میرے فیصلے کی تو صاف سن لیں۔ مجھے شاہ زیب سے شادی نہیں کرنی اینڈ ویس فائنل آئیندہ مجھے اس طرح کی کوئی تقریر نہیں کرنی۔“ عنادل نے انتہائی روڈ طریقے سے اپنا فیصلہ سنایا اور وہاں سے چلی گئی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا احمد حسن کا چہرہ شرمندگی کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔

”بھائی صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں۔“ انہوں نے ہمت جمع کر کے کہا۔

”نہیں، احمد حسن! صرف تم نہیں ہم سب شرمندہ ہیں۔ عنادل کی اس طرح بزورش ہم سب نے کی ہے لاڈ پیار میں ہم اتنا آگے نکل گئے کہ اچھا برا، صحیح غلط سب کا فرق فراموش کر بیٹھے۔“ محمود حسن نے کہا تو سب کے سر جھک گئے۔ محمود حسن نے سب کو تو سمجھا دیا مگر وہ خود اندر سے بالکل ٹوٹ گئے تھے۔ بچپن سے لے کر آج تک انہوں نے کبھی عنادل کو روئے نہیں دیا مگر آج عنادل نے ان کے دل کو رلا دیا تھا۔

☆.....☆

عنادل اور اس کی فرینڈ سارہ بوتیک سے نکل کر چل رہے تھے کہ سامنے سے ایک لینڈ کروزر پرانکل ان کے قریب آ کر رکی جس سے عنادل کی ٹکر ہو گئی تھی۔ عنادل کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا اس نے شاپنگ بیکس سارہ کو پکڑائے اور گاڑی پر زور سے ہاتھ مارا۔

”سڑک کیا باپ نے خرید کر دی ہے۔“ اور پھر زور سے دوبارہ ہاتھ گاڑی پر مارا۔ سارہ نے عنادل کو منع بھی کیا مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اتنے میں گاڑی کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک لہبا چوڑا نوجوان نکلا سانولی رنگت، ہلکی شیو، کلف دار کرتے شلوار میں ملبوس وہ چلتا ہوا قریب آیا تو فضا لے حد قسمتی بریفوم کی مہک سے رنج گئی۔ اس نے سن گلا سزا تار کر عنادل کو دیکھا تو بے خوف و ڈر عنادل کو بھر کو ڈر گئی۔ اس کی گھنٹی آئی برو کے نیچے موجود براؤن آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ عنادل نے گھبرا کر گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”گاڑی کے ساتھ کیا سڑک بھی آپ کی ملکیت ہے؟“ عنادل غصے سے بولی مگر وہ خاموشی سے عنادل کو دیکھتا رہا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بلیک کٹر کے کرتے اور جینز میں عنادل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

”لگتا ہے کان بھی خراب ہیں۔“ عنادل نے اپنا خوب صورت ہاتھ اس کے آگے ہلایا مگر وہ عنادل کے سراپے میں کھویا ہوا تھا۔ عنادل نے گردن ہلانی اور وہاں سے چلی گئی۔

”سائیں کہیں تو.....“ ملازم نے کہنا چاہا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔ عنادل کی بد قسمتی نے اس کا سامنا اسل سے کروا دیا تھا اور اس میں سب سے بڑا قصور تھا عنادل کی خوب صورتی کا جس نے پہلی ہی

نظر میں ارسل کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ ارسل گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا مگر اس کی نگاہوں میں عنادل کا سراپا گردش کر رہا تھا۔

”بابا مٹھن!“ ارسل نے ملازم کو پکارا۔
 ”مٹھن سائیں۔“ مٹھن نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
 ”بابا! ایک ضروری کام ہے وہ کرنا ہے تمہیں۔“

☆.....☆

”عنادل ڈنر کا وینوکافی دور ہے۔ لیٹ ہو جائیں گے واپسی پر۔“ حارث نے کہا۔
 ”ہاں تو سچ کون بتائے گا؟ کبائسٹڈ اسٹڈیز کا کہہ دوں گی۔ سہیل۔“ عنادل نے لا پرواہی سے کہا۔ عنادل نے فرینڈ سارہ کے گھر ٹیسٹ کی تیاری کا کہہ کر اجازت لے لی۔ سارہ کے گھر حارث اور سہیل گاڑی لے آئے اور وہ لوگ ڈنر پر نکل گئے۔ حارث ڈرائیو کر رہا تھا۔ سہیل اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا جب کہ عنادل اور سارہ پیچھے بیٹھی تھیں۔

”یار! تم لوگ بورنگ ہو؟ میوزک تو لگاؤ۔“ عنادل بولی تو سہیل نے پلیسر آن کر دیا اس میں سیڈ سانگ لگا ہوا تھا۔

”کم آن یار! میرا موڈ آف مت کرو۔ نکالو یہ مجھوں نما سانگ حارث! بیک اسٹریٹ بوائز لگا دو۔“ عنادل نے کہا تو حارث نے سہیل کو سی ڈی نکال کر لگانے کو دے دی۔ ابھی سانگ لپے ہی ہوا تھا ایک لینڈ کروزر تیزی سے ان کی گاڑی کے برابر سے زور سے ٹکراتی گزری ان کی گاڑی بڑکھڑا گئی۔ پھر وہ لینڈ کروزر ان کے آگے راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اس لینڈ کروزر سے تین نقاب پوش نکلے اور ان کی گاڑی کے پاس آئے۔ ایک نے آگے ڈرائیو کرتے حارث کے سر پر گن رکھ دی اور باقی دو نے پیچھے کا گیٹ کھول کر عنادل کو باہر نکلنے کا کہا۔ مگر عنادل نے صاف انکار کر دیا۔

ڈاٹ کام

”بی بی باہر آئیں۔“
 ”نہیں۔“ عنادل بولی۔

”بی بی! آجائیں ورنہ ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی۔“ ایک نقاب پوش بولا۔
 ”آپ کیش لے لیجئے میرے پاس جیولری نہیں ہے۔“ عنادل نے اپنا والٹ دیتے ہوئے کہا۔
 ”بی بی باہر آئیں ورنہ اس لڑکے کو مار دیں گے۔“ حارث کے سر پر گن رکھے نقاب پوش نے کہا تو عنادل ڈرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی۔ اسے اپنے گھروالے یاد آ رہے تھے جنہیں خبر بھی نہ تھی کہ عنادل کہاں ہے۔
 ”چلیں۔“ نقاب پوش نے لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ عنادل لینڈ کروزر کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

”بیٹھے بی بی!“ عنادل نے نہ میں گردن ہلائی تو حارث کے پاس موجود نقاب پوش نے چلا کر کہا۔
 ”ایک لمحہ اور لگا تو اس کی کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔“ عنادل مجبوراً گاڑی میں بیٹھ گئی اس کے بیٹھے ہی سارے نقاب پوش دوڑ کر لینڈ کروزر میں سوار ہو گئے اور اس میں موجود ڈرائیور نے گیسر لگایا اور لینڈ کروزر فرار لے بھرتی وہاں سے ہوا ہو گئی۔ گاڑی میں سوار عنادل کی ناک پر ایک رومال رکھ دیا وہ زور سے کسمپائی پھر آہستہ آہستہ اس کی کوشش ختم ہو گئی اور وہ ہوش سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ حارث سہیل اور سارہ مٹی کے بت بنے رہ

گئے۔ ان کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہوا تھا۔ ان کی کچھ سمجھ نہ آیا کافی دیر بعد وہ ہوش میں آئے تو گھبرا گئے۔

”یار! ہم تو بری طرح پھنس گئے۔ عنادل کے گھر والوں کو تو علم ہی نہیں ہے ہمارے ڈنر پر جانے کا؟“

سمیل بولا۔

”ارے وہ بول کر تو میرے گھر کا مٹی تھی۔“ سارہ نے روتے ہوئے کہا۔

”گارتز! یہ سب باتیں تو معمولی ہیں اصل مسئلہ ہے عنادل کے کڈ نیپ ہونے کا، ہمیں پہلی فرصت میں عنادل کے گھر والوں کو انقارم کرنا ہوگا۔“ حارث نے کہا اور گاڑی موڑ کر عنادل کے گھر کی طرف چل دیئے۔ جب وہ لوگ عنادل کے گھر پہنچے اور ساری بات بتائی تو عنادل کے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ نورین بیگم نے دھاڑیں مارنی شروع کر دیں۔

”آئی پلیز! مت روئیں، یہ غلطی عنادل نے ضرور کی مگر ہم بھی بغیر بتائے جانے کے لیے اس کو نہ روک کر آپ کے مجرم ہیں۔“ سارہ بولی۔

”نہیں بیٹا! غلطی کسی کی نہیں ہے یہ تو کوئی اور ہی معاملہ ہے ورنہ عنادل کو صرف گاڑی سے نکال کر لے جانا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔“ محمود حسن بولے۔ اتنے میں سامنے سے ڈی ایس پی تیمور نیازی آگئے۔ وہ محمود حسن کے بچپن کے دوست تھے اور محمود حسن کے کال کرنے پر آئے تھے۔ ڈی ایس پی تیمور نیازی ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور بولے۔

”بچو! شروع سے ساری بات بتاؤ آخر ہوا کیا تھا؟“ تو عنادل کے فرینڈز انہیں پورا واقعہ بتانے لگے۔

”انگل! میں نے خاموشی سے اس لینڈ کروزر کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔“ سمیل نے اپنا موبائل محمود حسن کو دیتے ہوئے کہا۔ محمود حسن نے وہ نمبر اپنے پاس لکھ کر ڈی ایس پی تیمور نیازی کو ایس ایم ایس کر دیا۔

”ویسے اگر عنادل کو کسی نے پیسوں کے لیے کڈ نیپ کیا ہے تو اب تک پیسوں کی ڈیمانڈ آجانی چاہیے تھی۔ دوسرے پہلو کو رکھا جائے تو عنادل کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ تیسرا پہلو یہ کہتا ہے کہ کہیں کسی لڑکے وغیرہ.....“ تیمور نیازی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نیازی.....!“ محمود حسن نے پرہی سے کہا۔

”نوسر! عنادل کا لڑکوں سے کوئی تعلق نہیں ہے ہم جانتے ہیں اسے۔“ حارث بولا۔

”ارے بھی! میرا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو میں اپنی عنادل بٹیا کو جانتا ہوں مگر کالج، یونیورسٹی میں اکثر لڑکے لڑکیاں ایڈوچر کے لیے ایسے بے ہودہ مذاق کر لیتے ہیں۔“ نیازی نے کہا۔

”ایک منٹ۔“ سارہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں یاد آ یا تین یا چار روز پہلے میں اور عنادل بوتیک سے نکل رہے تھے تو عنادل کی ٹکر ایک لینڈ کروزر سے ہو گئی تھی۔ اس میں سے کوئی نوجوان نکلا تھا۔ عنادل نے اسے خوب سنائیں تمہیں۔ میں نے منع بھی کیا تھا مگر وہ باز نہ آئی۔“ سارہ نے یاد کر کے بتایا۔

”انٹرسٹنگ! عنادل کی کڈ نیپنگ میں بھی لینڈ کروزر استعمال ہوئی ہے۔“ تیمور نیازی نے مشترکہ پوائنٹ

نوٹ کیا۔

”کون ہو سکتا ہے نیازی؟“ احمد حسن بولے۔

”اس کا پتا ہم لگالیں گے۔ آپ فکر مت کریں عنادل بیٹی کو ہم بہت جلد بحفاظت لے آئیں گے۔“ تیمور نیازی نے تسلی دی۔

☆.....☆

عنادل کی آنکھ کھلی تو اس کا سر زور سے گھوم گیا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسے ابکائی بھی آرہی تھی یہ سب بے ہوشی کی ددا کا اثر تھا۔ وہ کافی دیر لیٹی رہی پھر اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اسے یاد آیا کہ اسے تو نقاب پوشوں نے گن پوائنٹ پر ایک لینڈ کرڈز میں بٹھایا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کیا ہوا یہ عنادل کو یاد نہیں آرہا تھا۔ عنادل نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ ایک بے حد اعلیٰ اور شاندار انداز میں سجے کمرے میں موجود تھی۔ کمرہ خواب ناک حد تک شاندار تھا۔ ایک ایک چیز سے اس کی مالیت جھلک رہی تھی۔ کمرے میں فل اے سی آن تھا مگر پھر بھی عنادل کی پیشانی پر پسینے کے قطرے موجود تھے۔ کمرے کا لاک حرکت میں آیا اور دروازہ کھل گیا۔ اس میں سے ایک نوجوان شان سے چلتا ہوا اندر آ گیا۔ عنادل کو اس کا چہرہ مانوس سا لگا اس نے ذہن پر زور دیا مگر اسے یاد نہیں آیا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔

”آپ کو اس طرح یہاں لانے کے لیے شرمندہ ہیں ہم مگر کیا کریں آپ ہماری دعوت پر آئیں ہی کہاں، جان لیا ہے ہم نے کہ آپ کا مزاج ہی کچھ الگ ہے۔“ اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کون ہو تم اور کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟ میں تو نہیں جانتی تمہیں۔“ عنادل نے سختی سے کہا۔

”قربان جانے کو دل چاہتا ہے تم پر اور تمہاری بے نیازی پر۔ ہم ہیں کہ بے قراری کا عالم ہے اور آپ کو ہم یاد تک نہیں خیر آپ کی آسانی کے لیے بتا دیتے ہیں کچھ روز پہلے آپ ہم سے ملیں اور اپنے ساتھ ہمارا دل لے کر چلی گئی تھیں۔ کافی باتیں بھی سنائی تھیں آپ نے ہمیں۔“ ارسل نے کہا۔ عنادل نے ذہن پر پھر زور دیا تو اسے اس روز کی جھڑپ یاد آگئی۔ عنادل کا پارہ پھر ہائی ہونے لگا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”ہائے..... اسی غصے پر تو ہم مر گئے ہیں آپ کو کیا معلوم کہ آپ غصے میں اور بھی حسین ہو جاتی ہیں۔“ وہ عنادل کے قریب آ کر بولا۔

”دیکھو! مجھے اس طرح کی بے ہودگی بالکل پسند نہیں ہے۔ مجھے میرے گھر واپس بھجواؤ۔“ عنادل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ اب یہ ہی آپ کا گھر ہے۔“ ارسل نے آرام سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ادہ شٹ اپ! بکو اس مت کر۔“ عنادل نے غصے سے کہا۔ ارسل صوفے سے اٹھ کر عنادل کے قریب آیا اور بولا۔

”بی بی! جتنی جلدی ہو اس حقیقت کو تسلیم کر لو، ورنہ پریشانی آپ کو ہی ہوگی۔“ ارسل نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا تو عنادل ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”ہمیں تم سے محبت ہوگئی ہے اور ہم آپ کو چاہتے ہیں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ڈاٹ نان سینس! مجھے اس طرح کی بکو اس سننے کی عادت نہیں ہے، مجھے ابھی میرے گھر چھوڑ کر آؤ۔“

عناول نے خود پر کنٹرول کیا اور زور سے بولی۔ ارسل مسکرا کر اسے گھورنے لگا۔
 ”تمہاری یہی اواز تو مجھے بھاگنی اور تم نے ارسل شاہ کے دل کو چھو لیا ورنہ کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرے سامنے اونچی آواز میں بات کر سکے۔ بی بی میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا ورنہ کون روکے گا مجھے چاہوں تو اس لمحے اپنا ہنسکتا ہوں تمہیں۔“ ارسل نے عناول کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ عناول لرز کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ارسل اس کا انداز دیکھ کر زور سے ہنسنے لگا۔

”آرام کرو پرسوں ہمارا نکاح ہے اگر ہمیں جانا نہ ہوتا تو ابھی نکاح ہو جاتا۔“ ارسل نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ عناول کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دروازہ پھر کھلا تو عناول نے چونک کر دیکھا تو ملازمہ ثرائی لے کر اندر آئی بھی۔ ”بی بی کھانا کھالیں۔“ اس نے عناول سے کہا۔ ثرائی دنیا بھر کے لوازمات سے آراستہ تھی مگر عناول نے کچھ نہیں کہا ملازمہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

”محمود حسن گاڑی ٹریس ہو گئی ہے۔“ ارسل شاہ کے نام پر رجسٹرڈ ہے بہت بڑے باپ کی اولاد ہے۔ گاڑی سے ساری معلومات مل گئی ہیں۔“ ڈی ایس پی نیازی نے کہا۔
 ”نیازی کچھ بھی کرو میری عناول کو خراش تک نہیں آئی چاہیے۔“ محمود حسن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”اللہ سے دعا کرو محمود حسن! کوشش ہماری ہوگی اور حکم اللہ کا انشاء اللہ ہم بہت جلد عناول تک پہنچ جائیں گے۔“ تیمور نیازی نے کہا۔

☆.....☆

ملازمہ دوبارہ آئی تو کھانا جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ اس نے ثرائی کو خاموشی سے دھکیلا اور کمرے سے نکل گئی اور ارسل کو جا کر بتا دیا۔ ارسل نے پھر کھانا لانے کا کہا اور خود کمرے میں گیا۔ ملازمہ نے وہ ساری ثرائی لا کر دی اور چلی گئی۔ عناول نے ارسل کو دیکھ کر نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔
 ”عناول بی بی! کھانا کھالیں۔“ ارسل نے اسے پیار سے مخاطب کیا۔
 ”نام مت لینا میرا اپنی گندی ناپاک زبان سے۔“ عناول نے کہا۔

”ہا ہا ہا! مگر اب تو میرا نام ہمیشہ کے لیے تمہارے نام سے جڑ جائے گا اور عناول زندگی بھر کے لیے میری قید میں آجائے گی۔“ ارسل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”میں مرجاؤں گی مگر تم سے شادی نہیں کروں گی۔“ عناول نے روتے ہوئے کہا۔ ارسل نے پلیٹ میں کھانا نکالا اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”میری اجازت کے بغیر تو تم مر بھی نہ سکو گی جو چیز ارسل شاہ کی جان بن جائے، اس کی جان ارسل شاہ کے حکم کے بغیر نہیں لی جاسکتی۔“ ارسل نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”چلو! غصہ چھوڑو اور کھانا کھا لو۔“ ارسل شاہ نے نوالہ اس کے منہ کے قریب کیا تو عناول نے ہونٹ سختی سے بند کر لیے۔

”دیکھو! مجھے زبردستی پر مجبور مت کرو، ورنہ پھر جو کچھ ہوگا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ ارسل نے دھمکی آمیز انداز سے کہا تو عناول لرز گئی ارسل نے ہاتھ بڑھایا تو عناول نے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔

”خوش قسمت ہو تم جو میرے دل میں اتر گئیں اور میں تمہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا رہا ہوں، ورنہ ان گنت لڑکیاں یہاں آئیں اور کہاں گئیں کسی کو آج تک خبر نہ ہو سکی۔“ ارسل کی چمکتی آنکھیں عناول کو اپنے وجود کے آر

بار ہوتیں محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے جھینپ کر نظریں نیچی کر لیں۔ اس کی اس حرکت پر ارسل بے اختیار ہنسنے لگا۔

☆.....☆

”سر! جن بندوں کو نگرانی پر معمور کیا ہے۔ انہوں نے خبر دی ہے کہ لینڈ کروزر کچھ دیر قبل شہر سے دور ایک فارم ہاؤس پر کھڑی ہے اور فارم ہاؤس ارسل شاہ کے باپ کا ہے۔“ آفیسر نے تیمور نیازی کو رپورٹ کی۔

”فوراً ریڈ کرو، ہاں مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔“ تیمور نیازی نے آرڈر دیا۔
 ”اوکے سر!“ آفیسر نے سیلوٹ کیا اور چلا گیا مگر ارسل بھی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ ارسل کو چند منٹ پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی اور وہ فوراً غائب ہو گیا اگر اسے تھوڑا ٹائم اور مل جاتا تو وہ عنادل کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ پولیس نے فارم ہاؤس پر ریڈ کر کے عنادل کو بازیاب کر دیا۔ پولیس نے کافی جگہ چھاپے مارے مگر ارسل شاہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ پھر ارسل شاہ کے باپ نے محمود حسن کو کال کی اور بولا۔

”معالے کو پھیلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ بدنامی صرف لڑکی کی ہوتی ہے تو اگر تم ارسل کو جانے دو تو میں زبان دیتا ہوں کہ آئندہ وہ تمہاری بیٹی کو پریشان نہیں کرے گا۔“ محمود حسن نے سمجھداری کا مظاہرہ کیا اور عزت کی وجہ سے ارسل شاہ کو معاف کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کسی نہ کسی طرح اس نے بچ ہی جانا تھا مگر اب اس کا باپ ضمانت دے رہا ہے کہ وہ عنادل کو اب پریشان نہیں کرے گا، کیونکہ کیا بھروسہ وہ پھر عنادل کو تنگ کرنے آجاتا۔ ارسل شاہ کو اس کے باپ نے بیرون ملک بھیج دیا۔ عنادل یہ سوچ سوچ کر لرز جاتی کہ اگر پولیس وقت پر نہ آتی اور ارسل اس سے نکاح کر لیتا تو زندگی بھر وہ اس سے بچا نہ چھڑا پانی۔ عنادل کو اس واقعے نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

☆.....☆

”السلام علیکم پھپھو۔“ منیبہ آپا نے جو شاہ زیب کی آواز سنی تو نہال ہو گئیں۔
 ”ارے میرے بچے! وہ علیکم السلام تین سال بعد پھپھو یا آگئیں؟“ انہوں نے پیار سے کہا۔ عنادل سے شاوی نہ ہونے کے بعد شاہ زیب دوبارہ انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اسے گئے تین سال ہو گئے تھے۔
 ”کیا کسی گوری سے شادی کر لی ہے جو آنے کا دل نہیں چاہتا۔“ انہوں نے شاہ زیب کو چھیڑا۔
 ”پھپھو! میں ابھی ابھی پاکستان آیا ہوں اور سب سے پہلے آپ کو فون کیا ہے۔“ شاہ زیب نے ہنستے ہوئے کہا۔ شاہ زیب چونکہ اسلام آباد میں رہتا تھا تو منیبہ پھپھو سے ملنے راولپنڈی آتا رہتا تھا۔ وہ بھی شاہ زیب کو اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

”کب آرہے ہو پھر؟“ انہوں نے پوچھا۔
 ”پھپھو! بس آفس رپورٹ کر دوں پھر آتا ہوں۔“ شاہ زیب نے کہا۔
 ”اوکے بیٹا! اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔“ انہوں نے کہا۔
 ”اللہ حافظ پھپھو۔“ شاہ زیب نے کہا۔

☆.....☆

گاڑی دروازے پر رکی اور گاڑی سے شاہ زیب اتر کر باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا بگے تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مہنگے سے مہنگے گفٹ سے زیادہ منیبہ پھپھو کو سرخ گلاب پسند آتے، انہیں سرخ گلابوں سے

عشق تھا۔ ان کا گھر لان کے علاوہ بھی گلاب کے پودوں سے مزین تھا۔ شاہ زیب نے دروازے کے برابر دیوار پر لگی ڈور بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد خان بابا نے دروازہ کھول دیا۔
 ”السلام علیکم خان بابا۔“ شاہ زیب نے گرم جوشی سے کہا۔

”وعلیکم السلام جیتے رہو۔“ خان بابا نے دعادی۔ لان میں قدم رکھتے ہی شاہ زیب چونک کر رک گیا۔ وہاں موجود ایک وجود نے اس پر سحر طاری کر دیا تھا مہندی کلر کے شیٹون کے سوٹ میں ملبوس وہ اپنی گوری کلائیوں میں بھی میروں کلر کی جوڑیاں پہنے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ سر پر موجود دو بٹے کو ہوا بار بار اڑا رہی تھی۔ دو بٹے کے آچل سے کبھی دھتھی کبھی چھتی اس کی جھلک شاہ زیب کو بے قرار کرنے لگی۔ حالانکہ شاہ زیب اس ٹائپ کا نہیں تھا جوڑ کیوں کو دیکھتے ہوں مگر جانے اس وجود میں کیسی مقناطیسی کشش تھی جو اس کو اپنی طرف کھینچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”آخر وہ کون ہے؟“ شاہ زیب کا تجسس مزید بڑھنے لگا۔ اس نے غور سے دیکھنا چاہا تو قدرت نے اس کا کام آسان کر دیا۔ تیز ہوا کے ایک شریر جھونکے نے اس کے سر سے آچل کو اڑا دیا اور اس کے کمر پر پھیلے ہوئے بال ہوا میں بکھر کر اسے پریشان کرنے لگے۔ اس حسین بیکر نے پانی روک کر ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹا اور دوبارہ دوپٹہ سر پر لے لیا پھر وہ مڑی مگر آچل اڑا کر اس کے چہرے کو چھپائے جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب اسے دیکھ پاتا وہ سر جھکا کر اندر چلی گئی۔ شاہ زیب اس کے جانے کے کچھ دیر بعد تک وہیں جما کھڑا رہا پھر اسے ہوش آیا تو وہ جھینپ گیا۔

”یہ میں کیا کر رہا تھا کسی کو اس طرح دیکھنا بالکل غیر اخلاقی حرکت ہے۔“ اس نے خود کو برا کہا۔
 ”ارے بیٹا شاہ زیب تم کب آئے؟“ منیب پھپھو نے اسے دیکھ کر خوشی سے کہا۔
 ”بس ابھی آیا ہوں۔ یہ میری سوئیٹ پھپھو کے لیے ہیں۔“ شاہ زیب نے سرخ گلابوں کا بکے منیب بیگم کو دیتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو سوچ بیٹا۔“ منیب بیگم نے شاہ زیب کے ماتھے پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔
 ”پھپھو! یہ کون محترمہ تھیں جو اندر گئی ہیں؟“ شاہ زیب نے سوال کیا۔
 ”وہ! ارے وہ تو اپنی عنادل ہے۔“ منیب بیگم نے ہنستے ہوئے کہا شاہ زیب ان کی بات پر چونک گیا۔
 ”کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں ہے، نہیں یہ عنادل نہیں ہو سکتی وہ تو.....“

”چلو بیٹا اندر کیا یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟“ تو شاہ زیب خاموشی سے اندر چلا گیا۔ عنادل سارا دن اپنے کمرے میں ہی تھی منیب بیگم نے شاہ زیب کو ساری بات بتائی کہ کس طرح عنادل کی زندگی میں اتنا بڑا چیلنج آیا انہوں نے ارسل شاہ سے لے کر عنادل کے پنڈی آنے تک کی ساری بات بتائی کہ کس طرح عنادل ٹوٹ گئی تھی اور اس کی ذہنی کیفیت بالکل بچوں کی طرح ہو گئی تھی۔ محمود حسن نے فوراً عنادل کو ان کے پاس بھیج دیا۔ پہلے تو عنادل نے اپنے آپ کو ایک کمرے تک محدود رکھے رکھا۔ میں نے کچھ دقت تو اسے من مانی کرنے دی۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے اس کی نئے سرے سے تربیت کرنی شروع کر دی۔ وہ نارمل زندگی کی طرف آنے لگی تو میں نے اسے دین کے بارے میں پڑھایا، نماز کی طرف راغب کیا۔ اسے اس کی اقدار سمجھائیں کہ کس طرح ایک لڑکی کو شرم و حیا کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیے اور اس طرح رہنے سے انسان بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میرے سامنے میں میرے بتائے انداز میں ڈھلتی چلی گئی۔ اب وہ پہلے والی عنادل نہیں

”انتساب ہو گیا پھپھو! اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”ارے بیٹا! یہ سب ہمارے لیے ایک خوفناک حادثہ تھا۔ جس سے ہم سب نکلنا چاہتے تھے خاص طور سے عنادل اور محمود حسن کا حکم تھا اس بارے میں کوئی بات نہ کی جائے اور اللہ بھلا کرے محمود حسن کے دوست ڈی ایس پی تیمور نیازی کا جس نے اس بات کی بھنک بھی نہ ہونے دی تھی کسی کو اور بحفاظت ہماری پچی ہم تک پہنچا دی اور ویسے بھی تم اتنی دور پردیس میں بیٹھے تھے تمہیں پریشان کر کے کیا فائدہ ہوتا۔“ منیبہ پھپھو نے اسے سمجھایا۔ شاہ زیب بے تاب ہو رہا تھا کہ کب عنادل باہر آئے اور وہ اس کا دیدار کر سکے۔ شام ہو گئی شاہ زیب اور منیبہ پھپھو بیٹھے تھے کہ عنادل وہاں آگئی۔

”پھپھو! کھانے میں کیا بنانا ہے؟“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ شاہ زیب کو اپنی سماعت پر شبہ ہوا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا اور عنادل کو دیکھا اور پھر نظریں ہٹانا بھول گیا۔ سی گرین میٹ کے سوٹ میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی کھلتی گوری رنگت دیکھتے گال، گلابی ہونٹ شاہ زیب کی نظر میں اپنے تخیل میں موجود عنادل گھوم گئی جو کہ اب حقیقتا اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”بیٹا! آج تو شاہ زیب کی پسند کا کھانا بنا لو، پلاؤ تو بنا لیا ہے میں نے تم شامی کباب اور کھیر بنا لو۔“ منیبہ پھپھو نے عنادل کو کہا۔

”پھپھو! مجھے لگتا ہے کھانے سے پہلے اپنی انٹورنس کروالینی چاہیے۔“ شاہ زیب نے کہتے ہوئے عنادل کی طرف دیکھا تو عنادل دھیرے سے سر جھکا کر مسکرا دی اور اس کے گلابی ہونٹوں پر موجود تل نے شاہ زیب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ شاہ زیب کی محبت کا حسین پیکر آج صحیح معنوں میں اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ شاہ زیب رات کے کھانے پر میز پر آیا تو میز سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ عنادل خاموشی سے پھپھو کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔

”بیٹا! کھانا دو شاہ زیب کو۔“ پھپھو نے عنادل سے کہا تو عنادل نے سلیقے سے کھانا پلیٹ میں نکال کر شاہ زیب کو سرو کیا۔

”بیٹا! اپنی انگلیاں بچا کر کھانا کھانا، میری گڑیا بہت لذیذ کھانا بناتی ہے۔“ منیبہ پھپھو ہنستے ہوئے بولیں۔

”دیکھتے ہیں بھئی۔“ شاہ زیب نے کہا اور نوالہ منہ میں ڈال کر میٹ کرنے لگا۔

”مان گئے پھپھو! کھانا واقعی بے حد لذیذ ہے۔“ شاہ زیب نے دل کھول کر عنادل کی تعریف کی۔

☆.....☆

دوپہر سے پھوار پڑ رہی تھی مگر رات ہوتے ہی بادل گھر کر آنے لگے۔

”لگتا ہے بارش زوروں سے برسے گی آج۔“ منیبہ پھپھو نے کہا۔

”جی پھپھو! آپ یہ دودھ پی لیجیے۔“ عنادل نے کہا اور دودھ کا گلاس رکھ کر چلی گئی۔ عنادل منیبہ پھپھو کے کمرے سے باہر آئی وہ چلتی ہوئی کوریڈور سے گزرتی اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ ایک دم زور سے بارش شروع ہو گئی عنادل چلتی ہوئی گیلری میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ شروع سے ہی اسے بارش پسند تھی بچپن میں تو یا قاعدہ گھنٹوں بارش میں تمام کزنز کے ساتھ فٹ بال کھیلتی تھی۔ عنادل نے ہاتھ باہر نکالا اور اپنے ہاتھوں کو بھگونے لگی اور آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاہ زیب کب آ کر پیچھے کھڑا ہوا اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا وہ مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا پھر ایک دم عنادل کو کسی کی نظروں کی پیش کا احساس ہوا تو اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں تو اس کے سامنے

شاہ زیب کھڑا تھا۔ عنادل اسے دیکھ کر جھینپ گئی اور شرما کر سر جھکا لیا اور پلٹ کر جانے کے لیے مڑی تو شاہ زیب نے ایک دم اس کی کلکائی تھام لی۔

”کہاں جا رہی ہو مجھے یوں تنہا چھوڑ کر؟“ شاہ زیب نے اس سے کہا۔
 ”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ چھوڑیں میرا ہاتھ۔“ عنادل نے گھبرا کر کہا۔

”یہ ہاتھ میں نے زندگی بھر تھامنے کا ارادہ تو جانے کب سے کر رکھا تھا مگر تم.....“ شاہ زیب کہتے کہتے رک گیا۔ عنادل نے ہاتھ چھڑا کر جانا چاہا مگر شاہ زیب کی گرفت اس کے جذبات کی طرح مضبوط اور شدید تھی۔
 ”کہاں نہیں تم عنادل اب تک؟ تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے مجھے کس قدر مایوس کیا ہے۔“ شاہ زیب نے جذباتی انداز سے کہا۔

”میں نے تو سب کو مایوس کیا ہے۔ سب کی امیدوں کو توڑا ہے۔ بڑوں کے دل دکھائے ہیں اور اس کی سزا قدرت نے مجھے دی تھی مگر وہاں بھی میرے اپنوں کی دعاؤں نے مجھے بچا لیا جن کو میں نے مایوس کیا تھا۔ بہت بری ہوں میں۔“ عنادل نے شرمندگی سے سر جھکائے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا وہ حادثہ ایک الگ چیز ہے جو کسی کے بھی ساتھ پیش آ سکتا تھا۔“ شاہ زیب نے اسے سمجھایا۔

”ہاں مگر جانتی ہو؟ تم نے جو مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا اس نے میرا دل چکنا چور کر دیا تھا۔“ شاہ زیب نے نکلکھو کیا۔

دل چکنا چور کر دیا تھا مگر آپ کو میرے انکار سے بھلا کیوں کفر فرق پڑا؟ آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔
 ”مجھے عنادل سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے انکیٹ مجھے تو کیا کسی بھی ذی ہوش مرد کو مجھ سے شادی کرنے میں کوئی حارم نہ ہوگا۔“ عنادل نے شاہ زیب کے شہلا سے کہے جملے دہرا دیئے۔
 ”وہ تو میرے اندر کی فرسٹریشن تھی جب میری محبت غیر لڑکوں کے ساتھ گھومے گی، ان کے ساتھ ہاتھ پائی کے مذاق کرے گی تو کیا میری غیرت یہ سب گوارا کرتی میرے تصور میں جو سالوں سے میری محبت کا عکس بسا ہوا تھا۔ جیسا کہ آج تمہارا وجود ہے پاکیزہ، معطر، شرم و حیا سے آراستہ میرے اس تراشے ہوئے خاکے کے تم بالکل برعکس نکلیں تو کیا میرا رد عمل غلط تھا؟ تم خود بتاؤ۔“ شاہ زیب نے الٹا سے ہی گواہ کر لیا۔
 ”بولو عنادل۔“

”آپ کا رد عمل بالکل نیچرل تھا۔“ عنادل نے دھیرے سے کہا۔
 ”عنادل مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں نے تمہیں دل سے نکال دیا یا اب مجھے تم سے محبت نہیں رہی بلکہ تمہارے شادی سے انکار پر میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ زندگی بھر شادی نہ کرنے کا۔“ شاہ زیب نے کہا تو عنادل چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”مگر کیوں؟“ عنادل نے حیرانی سے سوال کیا۔
 ”وہ اس لیے کہ میں آج بھی تمہیں اتنی ہی شدتوں سے چاہتا ہوں عنادل! میرے دل پر دستک دینے والی پہلی اور آخری لڑکی صرف تم ہی ہو۔“ شاہ زیب نے کہا۔
 ”مگر میں.....“ عنادل نے کچھ کہنا چاہا تو شاہ زیب نے اپنی انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش کر

دیا۔

”اب تو مجھے میری محبت پالینے دو، کیا تم زندگی کے اس سفر میں میری ہمسفر بنو گی؟“ شاہ زیب نے عنادل کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو عنادل نے شرم سے سر جھکا دیا۔

”پھیسو! آپ بابا سے بات کریں میرے اور عنادل کے رشتے کی۔“ شاہ زیب نے منیبہ بیگم سے کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

”شاہ زیب! تم نے میرے دل کی بات کہہ کر مجھے خوش کر دیا۔ اربے ہم بڑوں نے سالوں پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا مگر تم بچوں نے ہی منع کر دیا تھا خیر دیر آئے درست آئے۔“ پھر منیبہ بیگم نے محمود حسن کو کال کی اور بات کی محمود حسن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی تھا مگر وہ ایک دم خاموش ہو گئے۔

”آپ! پہلے دونوں کو کراچی لے آئیے پھر بات کرتے ہیں۔“ منیبہ آپادونوں کو لے کر کراچی پہنچ گئیں جہاں سب گھر والے ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

☆.....☆

”شاہ زیب! پہلے بھی یہ فیصلہ ہوا تھا کہ تمہارے اور عنادل کے نصیب کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے مگر شہلا کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ مجھے بچوں سے پہلے معلوم کرنا چاہیے تھا۔ اب جب دو بارہ منیبہ آپا نے یہ ذکر چھیڑا ہے تو تم بتاؤ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے عنادل سے شادی کرنے میں؟“ محمود حسن نے پوچھا۔

”نہیں بابا! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ شاہ زیب نے سر جھکا کر کہا۔

”ٹھیک ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر فیصلہ عنادل کے جواب پر منحصر ہے۔“ انہوں نے شاہ زیب سے کہا۔ پھر وہ عنادل کے پاس گئے اور بولے۔

”عنادل بیٹا! میں تمہاری مرضی پوچھنے آیا ہوں کسی بھی دباؤ میں آئے بغیر جواب دینا۔“ محمود حسن کے کہنے

عنادل دوڑ کر آئی اور ان سے لپٹ گئی۔

”آئی ایم ریلی سوری بڑے ابو۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”مگر کس لیے بیٹا؟“ محمود حسن نے کہا۔

”قارمائی بی ہیویئر۔ میں نے اس دن بہت روڈ انڈاز میں بات کی تھی جو کہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ عنادل نے کہا۔

”جو گزر گیا اسے بھول جاؤ اور یہ بتاؤ کہ اپنے بڑے ابو کی بہو بنو گی؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو عنادل نے سر جھکا کر ان کے سینے سے ٹکا دیا۔ محمود حسن نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولے۔

”جیتتی رہو۔“

شاہ زیب اور عنادل کی شادی بے حد دھوم دھام سے ہوئی محمود حسن کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ ان کی برسوں کی خواہش آج پوری ہوئی تھی۔ احمد حسن اور نورین بیگم بھی بھائی بھائی سے کیے وعدے کو پورا کر کے بہت خوش تھے۔ شہلا اب مطمئن تھی کہ اس کے بھائی کو اس کی محبت اس کی چاہ کے مطابق مل گئی تھی۔ ارسلا اور احمر نے خوب اوشم مچایا ہوا تھا۔ شادی کے روز عنادل اور شاہ زیب اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے، جب کہ عنادل کے فرینڈز حارث، سمیل اور سارہ ارسلا اور احمر کے ساتھ ڈانس کر رہے تھے۔ شاہ زیب نے عنادل کو چھیڑا۔

”عنادل! تم بھی جینز شرٹ پہن کر ان کا ساتھ نہیں دو گی؟“ تو عنادل نے شرما کر ناں میں گردن ہلا دی۔

☆.....☆



MOM & ME

for baby's delicate skin

MOM & ME کی عملی جدید سائنسی تحقیق کا نچر ہے جو اپنے محفوظ اور آسانی کی برسات بچوں کی نازک ہلد کی مکمل نگہداشت کیلئے، ماؤں کی اولین پسند ہے۔

پامیں ایک ہی خوبصورت ہے!! جو برسات کے پاس ہے۔



facebook.com/MnMcares

READER'S Section



سہیلی کا لہو

باہر بڑی رونق لگی تھی۔ فلاور شاہپس، گفٹ شاہپس پر
یہک جنریشن کا میلہ سا لگا تھا۔ ہر شخص مکمل جوش و جذبے
کے ساتھ ویلنٹائن ڈے منانے کی تیاریوں میں مصروف
تھا۔ وہ خالی ہوتے دل کے ساتھ سڑک کراس کر کے بس



Downloaded From
Paksociety.com

خالی خالی نظروں سے باہر لگی رونقیں دیکھ رہی تھی، جیسی اس کی سماعتوں میں ماضی میں کہا گیا یہ جملہ شور مچانے لگا تھا۔ وہ یک دم ہی اپنے خیال سے باہر آئی اور چونک کر اپنے آس پاس دیکھنے لگی تھی۔ اتنے میں اس کا اسٹاپ آگیا تو وہ بیگ سنبھالتی گاڑی سے اتر آئی تھی۔ سست قدموں سے چلتی وہ گھر کی وہلیز تک آئی تھی دروازہ فاخرہ بیگم نے کھولا وہ سلام کرتی چھوٹے سے صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد فاخرہ بیگم سے باتیں کر کے وہ سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں آگئی تھی،

اسٹینڈ تک آئی تھی اور اس کی خوش قسمتی کہ اس کے مطلوبہ روڈ کی بس جلد ہی آگئی تھی۔ وہ جلدی سے گاڑی میں چڑھ گئی تھی۔ چلتی گاڑی سے بھی اسے جگہ جگہ ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے لگے اسٹال اور شاپ نظر آتی رہی تھیں جہاں حد درجہ رش لگا تھا، لڑکے لڑکیاں بھرپور طریقے سے خریداری میں مصروف تھے، اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ ایک زخم جو اس کے دل میں ناسور بننے لگا تھا اس میں سے لہو نکلنے لگا تھا۔

”ویلنٹائن ڈے ہم مسلمانوں کا تہوار تو نہیں ہے تو پھر کیوں ہم اس فضول تہوار کو منائیں۔ وہ یوں ہی



LEADING
Section

”کچھ بھی گفٹ دے دو اور کوئی بھی ڈریس پہن لو تم پر سب سوٹ کرتا ہے۔“ ہانیہ نے بیزارگی سے کہا تھا۔
 ”اچھا ٹھیک ہے یہ بتاؤ تم اور ہریرہ بھائی نے کل کے لیے کیا سوچا ہے۔“ وہ بڑے جوش سے پوچھ رہی تھی۔
 ”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے دو لفظی جواب دیا تھا۔
 ”کیوں.....؟“ رانیہ نے از حد حیرت سے بیزار بیٹھی ہانیہ کو دیکھا۔

”یہ تمہیں آج ہی کیوں خیال آیا، اس سے پہلے وہ کب اس طرح کے کوئی بھی ایونٹ کو سیلیبرٹیٹ کرتا ہے۔“ اس نے بیزاریت سے کہا تھا۔

”تو اس دفعہ تم خود ہی انہیں سر پرانز دے دو۔ یقیناً وہ خوش ہوں گے۔“ اور رانیہ کے زور دینے پر ہانیہ نے پہلی بار خود سے ابو ہریرہ کو ویلنٹائن ڈے پر گفٹ دینے کی جسارت کی تھی۔ بہت خوب صورت ریڈ روز سے ہارٹ شپ میں سجا بکے خرید ایک اچھا سا پرفوم اور ساتھ میں ویلنٹائن ڈے کا کارڈ اور پھر اس نے ابو ہریرہ کو خود سے کال کر کے ریستورنٹ میں ملنے کے لیے بلایا تھا۔ ابو ہریرہ اس کے اس طرح کال کر کے بلانے پر پریشان سا افسانہ خیزاں بھاگا چلا آیا تھا۔

”خیریت اس طرح کی جنسی میں باہر ملنے کے لیے کیوں بلایا ہے۔“ ابو ہریرہ نے سرسری سی نظر اس کے خوب صورت چہرے پر ڈالتے فکر مندی سے پوچھا تھا۔
 ”سب خیریت ہے آپ پریشان مت ہوں۔“ وہ ایک دم ہی کچھ گھبرائی ہی ہوئی تھی۔

”میں نے یہ ویلنٹائن ڈے کا گفٹ دینے کے لیے آپ کو بلایا ہے۔“ اس نے جھکی پلکوں کے ساتھ جلدی سے کہا تھا۔ ابو ہریرہ کی پیشانی پر یک دم ہی کئی سلوٹیں پڑی تھیں۔

”کیا ہے یہ ویلنٹائن ڈے یہ فضول سا تہوار منانا ہم مسلمانوں پر فرض تو نہیں کیا گیا بلکہ سرے سے ہمیں اس فضول خرافات جیسے ویلنٹائن ڈے کو منانا ہی نہیں چاہیے اور مجھے اس طرح کے فضول ایونٹ کو سیلیبرٹیٹ کرنا بالکل

جیسی اس کی نظر رانیہ کی تصویر پر جا پڑی اور اس کی ذہنی رو پھر سے بھکنے لگی تھی۔ تین سال پہلے کی تو بات ہے جب رانیہ بھی یوں ہی زور و شور سے ایسے ایونٹ کی تیاریوں میں مصروف ہوا کرتی تھی۔ رانیہ اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ دونوں بہنوں میں دیکھنے والی محبت تھی ہانیہ کی نسبت بچپن سے اس کے پھوپھو زاد ابو ہریرہ سے طے تھی جب کہ رانیہ کی منگنی راحم سے دونوں کی پسندیدگی کی بنا پر ہوئی تھی۔ راحم، رانیہ کی فرینڈ کا کزن تھا ان کی پہلی ملاقات بھی رانیہ کی فرینڈ کے توسط سے ہی ہوئی تھی۔

ہانیہ جتنی شوخ مزاج تھی، ابو ہریرہ اتنا ہی سنجیدہ مزاج تھا جب کہ رانیہ راحم کا مزاج ایک جیسا تھا۔ شوخ و چلبلا پن ان کی فطرت کا حصہ تھا۔ یوں تو ہانیہ کو ابو ہریرہ بہت پسند تھا مگر کبھی اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہوتا کہ جیسے ابو ہریرہ اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتا۔ کوئی بھی ایونٹ ہوتا ابو ہریرہ کی طرف سے مکمل خاموشی ہوتی، ہانیہ اس کی طرف سے ہائل کی منتظر رہتی جب کہ رانیہ اور راحم ہر ایونٹ کو بڑے بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے، گفٹ کے تبادلے ہوتے، ڈنر پر ساتھ جاتے زیادہ سے زیادہ ٹائم ایک دوسرے کے ساتھ ٹائم سپینڈ کرتے ایسے میں رانیہ کے چہرے پر پھیلی شرمیلی سی مسکان ہانیہ کو ابو ہریرہ سے مزید بد دل کر دیتی مگر وہ خاموش ہی رہتی بس دل میں ہی جلتی کڑھتی رہتی۔

☆.....☆

ہانیہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی تب ہی رانیہ اس کے پاس چلی آئی۔

”ہانی بات سنو۔“ وہ اس کے سر پر کھڑی ہو کر زور سے بولی تو وہ اپنے خیالوں سے باہر نکل آئی۔

”ہاں بولو۔“ اس نے سامنے کھڑی رانیہ کی طرف دیکھا۔

”ہانی اکل ویلنٹائن ڈے ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا راحم کو کیا گفٹ کروں، ڈریس کیسا پہنوں۔“ وہ پریشان لہجے میں ہانیہ کو دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

پسند نہیں ہے۔ ہم الحمد للہ مسلمان ہیں اللہ اور اس کے رسول نے ہم مسلمانوں کے لیے کچھ حدود بنائی ہیں اگر ہم ان حدود میں رہتے ہوئے زندگی گزاریں تو یہ ہمارے اور ہمارے گھر والوں دونوں کے لیے بہتر ہوگا، یہ ضروری تو نہیں انگریزوں کے بنائے گئے اس فضول سے ایونٹ کو ہم بھی ان کی طرح جوش و خروش سے سلیمیریٹ کریں آج کے بعد اس طرح کا کوئی بھی فضول کام مت کرنا، میں جانتا ہوں یہ آئیڈیا بھی رانیہ کا ہی ہوگا مگر مجھے تم جیسی سمجھدار لڑکی سے یہ امید ہرگز نہ تھی۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے مگر حد درجہ سنجیدہ لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا اس کے بے تحاشا سرخ ہوئے چہرے کو نم ہوتی پلکوں کو دیکھنے لگا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ نرمی سے بولا تھا۔

”چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔“

ہانیہ جواب تک ایسے کھڑی تھی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، وہ یک دم ہی ہوش میں آئی تھی اور ایک جھٹکے سے اپنے جھکے سر کو اٹھایا تھا۔

”میں خود جاسکتی ہوں۔“ حد درجہ سرد لہجے میں کہتی وہ لمبے لمبے ڈنگ بھرتی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔ ابو ہریرہ نے ایک لمبی سانس نفا کے سپرد کی پھر ٹیبل پر موجود ان تمام چیزوں کو اٹھا تاواہ بھی نکل آیا۔

☆.....☆

گھر آ کر وہ ٹیکے میں منہ چھپا کر ابو ہریرہ کے ہاتھوں اپنی تذلیل پر دل بھر کر روئی تھی۔ جب کہ رانیہ کو اس نے اس سب کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ دو مہینے بعد ہی پھپھو کی طرف سے ابو ہریرہ اور ہانیہ کی شادی کا شور بلند ہونے لگا۔ پھپھو کا کہنا تھا کہ ابو ہریرہ کو دو سال کے کنٹریکٹ پر کمپنی باہر بھیج رہی ہے تو جانے سے پہلے وہ شادی کرنا چاہتی ہیں۔ اماں، ابا نے بہت سمجھایا زور دیا مگر وہ بس سے مس نہ ہوئی، اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا بس ایک یہی طریقہ اس

کی سمجھ میں آیا تھا۔ ابو ہریرہ نے ملنے کی کوشش کی مگر اس نے ملنے سے بھی صاف منع کر دیا آخر کار ابو ہریرہ چلا گیا وہ ایئر پورٹ بھی چھوڑنے نہیں گئی۔ نہ جانے ابا اماں نے کس طرح بات سنبھالی مگر اسے پرواہ ہی کہاں تھی۔ دن یوں ہی اپنی رفتار سے گزرنے لگے سال کیسے گزرا پتا ہی نہ چلا آج صبح سے رانیہ کی تیاریاں دیکھنے لائق تھیں۔ ویلنٹائن ڈے کے لیے اس نے اسپیشل تیاری کی تھی۔ وہ اپنی تیاری مکمل کر کے جوں ہی کمرے سے نکلی اماں سے باتوں میں مصروف راحم کی نگاہ رانیہ پر جم کر رہ گئی۔ اماں دل سے راضی نہ تھیں مگر راحم کی منتوں کے آگے مجبور ہو گئیں۔ رانیہ کو راحم کے ساتھ باہر نکلتے دیکھ کر وہ اسے جلدی گھر آنے کی تاکید کرنا نہیں بھولی تھیں۔ وہ جو تین گھنٹوں میں واپسی کا کہہ کر گئی تھی مگر یہاں تو پوری رات بیت گئی تھی اور رانیہ گھر واپس نہیں آئی تھی ہانیہ اس کے موبائل پر کال کر کے تھک چکی تھی مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا، راحم کا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔ اماں نے ساری رات جاغ نماز پڑھا اور ہانیہ نے گیٹ کے چکر لگا کر گزار دی تھی۔ فجر کی اذانوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ہانیہ نے بھاگ کر دروازہ کھولا تھا اور وہیں ساکت ہو گئی تھی۔ شام میں جو رانیہ اتنی تکسک سے تیار ہو کر راحم کے ساتھ گئی تھی اب ای رانیہ کی حالت قابل رحم تھی۔ جا بجا پھٹا ہوا لباس بکھرے بال چہرے پر جگہ جگہ پڑے نیل اور چوٹ کے نشان کچھ اور ہی کہانی سن رہے تھے۔ ہانیہ تو صدے کے عالم میں اسے دیکھے گی۔

”کون ہے ہانی!“ ابا اسی دم کمرے سے نماز ادا کر کے نکلے تھے اور بیٹی کی ایسی حالت دیکھتے ہی تیورا کر زمین پر گر پڑے تھے۔ ہانیہ ایک دم ہوش میں آئی تھی اور ابا کی طرف بھاگی تھی مگر صادق صاحب بیٹی کی بربادی برداشت نہ کر سکے اور ملک عدم سدھار گئے تھے۔ ان لوگوں کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی، ابا

کی تدفین بھی نہ ہوئی تھی کہ رانیہ نروس بریک ڈاؤن ہونے سے خود زندگی کے بوجھ سے آزاد ہو گئی تھی۔ ایک ہی دن میں ان کے گھر سے دو جنازے اٹھے تھے۔ ان ماں بیٹی کو تو ہوش ہی نہ رہا تھا۔ چند دن گزرنے کے بعد ایک دن یوں ہی ہانیہ نے اپنی ڈائری کھولی تو اس میں رانیہ کی تحریر رقم تھی۔

اپنے پیارے ابا کی قاتل ہوں۔ دنیا والوں کی نظروں میں اپنے لیے نفرت دیکھنے اور لوگوں کے طعنے سننے کی ذرا ہمت نہیں ہے۔ خدا مجھے موت دے دے۔ میرے لیے مغفرت کی دعا کرنا کیا پتا اللہ کے دربار میں مجھے معافی مل جائے کہ وہ بڑا بے نیاز ہے۔

تمہاری بند نصیب بہن

رانیہ صادق

ہانیہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ ایک فضول سے انگریزوں کے بنائے گئے تہوار کے دن کو سلیم بیٹ کرنے پر اس کی پیاری بہن کو کیسی بھیا تک سزا ملی تھی وہ واقعی میں خوش نصیب تھی کہ کسی بڑی قربانی دینے سے پہلے سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا۔

☆.....☆

ہانیہ نے بہت کوشش کی تھی کہ ابو ہریرہ سے اس کا کسی طرح رابطہ ہو جائے مگر ابو ہریرہ سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ابو ہریرہ جان کر اسے انور کر دیا ہے، وہ تو صرف معافی مانگنا چاہتی تھی۔ اپنی اس لمحے بھر کی بے اختیاری کی مگر وہ تو اسے ایک موقع دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ وہ تو ابا اور رانیہ کے انتقال پر بھی نہیں آیا تھا ہاں گراماں سے ہر ہفتے تفصیلی بات ہوا کرتی تھی مگر ہانیہ کو تو جیسے وہ بالکل ہی فراموش کر چکا تھا۔

☆.....☆

”ہانیہ جینا! گیٹ اچھی۔ طرح بند کر لو، میں سودا لینے جا رہی ہوں مارکیٹ تک۔“ قاخرہ بیگم نے صحن میں کھڑے ہو کر اسے آواز دی تھی۔

”آئی ای!“ وہ کچن سے برآمد ہوئی تھی دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتی قاخرہ بیگم کے جانے کے بعد اس نے گیٹ بند کیا اور دوپٹے کمر پر باندھتی صفائی کرنے لگی تھی۔ جیسی دروازے پر دستک ہوئی تھی وہ واپس رکھتی دوپٹے شانوں پر ٹھیک کرتی گیٹ تک آئی تھی، دستک مزید تیز ہونے لگی تھی۔

”کون ہے بھئی۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے

پیاری ہانیہ! جب تک یہ تحریر تمہاری نظروں سے گزرے گی۔ اس وقت میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ چند باتیں ہیں جو تم سے کہنا چاہتی ہوں تم بہت لگی ہو ہانیہ کہ تمہیں ابو ہریرہ جیسے شخص کا ساتھ نصیب ہوگا، کاش کہ میں بھی تمہاری طرح لگی ہوتی پتا ہے ہانیہ اس رات ویلنگٹن ڈے پر جب میں راحم کے ساتھ جا رہی تھی تو ذرا بھی پتا نہ تھا کہ میں اپنی بربادی کی طرف قدم بڑھا رہی ہوں، راحم مجھے ڈنر کے بہانے سے ہوٹل میں بک کروائے کمرے میں لے گیا۔ ڈنر کے بعد وہ نیک دم ہی ایک مہذب پڑھے لکھے شخص سے کسی شیطان نما درندے میں تبدیل ہو گیا۔ بہت منتیں کی تھیں میں نے اس کی خدارسواں کا واسطہ بھی دیا تھا مگر اس پر تو شیطان سوار تھا جو اپنی ہوس مٹانے کے در پر تھا میری ہزار ہا منتوں پر اس نے بڑے آرام سے کہا کہ شادی تو ہمیں کرنی ہے تو پھر کیا حرج ہے اور کب تک تڑپاؤ گی اور ویلنگٹن ڈے تو ہے ہی محبت کے اظہار کا دن، ایک دوسرے کے قریب آنے کا دن، دوریوں کو مٹانے کا دن محبت کرنی ہونا مجھ سے تو پھر یہ گریز کیسا اور پھر میری آپس چھینیں کچھ کام نہ آیا اس درندے نے اپنی ہوس مٹانے کے لیے میری عصمت کی بے داغ چادر کو داغ دار کر دیا اور میں اپنی سب سے قیمتی متاع گنوا بیٹھی اور لٹی پٹی زندہ لاش کی طرح گھر لوٹ آئی؟ یہ بھی اسی درندے کی مہربانی تھی کہ وہ مجھے گھر چھوڑ گیا، ابا میری رسوائی کے خوف سے میری صفائی سے بنا ہی مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں

گیٹ کھول دیا تھا اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ جیسے لمحہ بھر کائنات کی ہر شے ساکت ہو گئی ہو پورے تین سال کے بعد وہ کھرا کھرا سا اس کے سامنے موجود تھا۔

”اندر آنے کو نہیں کہو گی ہانی!“ اسے ایک تک اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ اپنے نرم مخصوص دھیسے لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ وہ بے اختیار ہی سائیڈ پر ہو گئی تھی۔ ابو ہریرہ اندر چلا آیا، پیچھے وہ بھی دروازہ بند کرتی اندر چلی آئی۔

”ای! گھر پر نہیں ہیں۔“ وہ نظریں جھکائے انگلیاں چٹختی کنفیوژسی ہوئی تھی۔

”کیسی ہو ہانی؟“ اس نے جیسے اس کی بات سنی تھی۔
”ٹھیک ہوں، آپ بیٹھے میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ وہ جواب دیتی تیزی سے جانے لگی تھی کہ جبھی اس کی نازک کلائی ابو ہریرہ کی گرفت میں مقید ہوئی تھی وہ جیسے اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔

”تم اب تک ناراض ہو مجھ سے۔“ ابو ہریرہ نے اس کا رخ اپنی جانب موڑتے اس کی نم ہوئی آنکھوں میں دیکھتے آہستہ سے کہا تھا اور اسے نجانے کیوں ایک دم ہی رونا آ گیا تھا وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔
”بس کرو ہانی! اور کتنا شرمندہ کرو گی۔“ وہ اس کا سر تھپتھپاتے دھیسے سے بولا تھا۔

”شرمندہ تو میں ہوں آپ سے بہت زیادہ اتنی کہ معافی مانگنے کی بھی ہمت نہیں کر سکی آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ہمیں ویلنٹائن ڈے جیسی کوئی بھی خرافات سیلیبریٹ نہیں کرنا چاہیے۔ مغربی خرافات جنہیں تہوار کا نام دیا گیا ہے ان کی تقلید کرتے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ہمیں سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں دے سکتے اللہ اور اس کے رسول نے یوں ہی اسلام کو ایک مکمل دین نہیں کہا ہے۔ ہمارا دین ہمیں بربادی و تباہی کے راستے پر جانے سے روکتا ہے۔ اللہ اور اس

کے رسول کی قائم کردہ حدود ہمیں رسوائی و بدنامی کے دلدل سے دور رکھتی ہیں ہمیں بے راہ روی کا شکار نہیں ہونے دیتیں اور جو مغربی رسومات کی تقلید کرتے ہیں ان کا انجام رانیہ جیسا یا شاید اس سے بھی بدتر ہوتا ہے میں تو آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی کہ میرے دل میں بھی ایک نرسودہ خیال نے جنم لیا تھا۔ شرمندگی اتنی تھی کہ معافی بھی نہ مانگ سکی۔“ وہ کہنے پر آئی تو دل کا تمام غبار نکال دیا۔ ابو ہریرہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

”شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اپنے دل پر کوئی بوجھ مت رکھنا، جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے اور وہ شخص خوش نصیب ہے جو گرنے سے پہلے سنبھل جائے، میری دعا ہے کہ اللہ مغرب کی تقلید کرنے والے تمام نوجوان نسل کو ہدایت عطا فرمائے اور بے راہ روی کا شکار ہونے والے نوجوانوں کو عقل دے تاکہ ہمارا معاشرہ ان فرسودہ رسومات سے محفوظ رہ سکے۔“ ابو ہریرہ کے گھمبیر لہجے میں کہی بات پر بے ساختہ ہانیہ کے لبوں سے آمین نکلا تھا۔

”ایک بات کہوں ہانی!“ ابو ہریرہ نے اس کے آنسوؤں سے نم چہرے کو نظروں کے حصار میں لیا تھا۔
”بولیں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے ابو ہریرہ کو دیکھنے لگی۔
”پلیز! اب کے ای ای شادی کی تاریخ مانگنے آئیں تو انکار مت کرنا۔“ اس کے گھمبیر لہجے میں کہے گئے جملے نے پل میں اسے شپٹا کر نگاہ جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔
”میں منتظر ہوں تمہارے جواب کا۔“ ابو ہریرہ نے شرارت سے کہا تھا۔

”او کے میں سوچوں گی اس پارے میں۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
ابو ہریرہ کے لبوں پر بھی گہری مسکراہٹ نے قبضہ کیا تھا۔ آگے کا سفر بھینا بہت حسین تھا۔ جس پر ان دونوں کو ایک دو بے کے سنگ ہمقدم ہو کر چلنا تھا۔

☆.....

”آیہ الکرسی پڑھ کر دکان کھولے تو برکت ہو
ناں، صبح تر کے دکان کھولو تو برکت کے فرشتے آتے
ہیں۔ یہ مردود و پھر کو شتر اٹھاتا ہے اور وہ بھی بچھن
پڑھتے ہوئے آمدنی کہاں سے ہو۔“

اباماں کے سر پر برستے جا رہے تھے۔ روپوں کو
گنتے جاتے تھے اور اسے کوستے جاتے تھے۔ یہ تقریباً
روز کا ہی معمول تھا۔ دن بھر وہ دکان پر مغز ماری
کرتا۔ رات کو ابا آتے بکس کھول کے روپے نکالتے
گھر جا کے گنتے اور شور مچاتے۔ بات میں وزن پیدا
کرنے کے لیے جھج اور گلاس اٹھا اٹھا کے پھینکنا نہ
بھولتے، مگر جوش میں بھی ہوش سے کام لیتے اور جو
چیز اٹھا کے پینچی ہو وہ اسٹیل کی ہی اٹھاتے کالج اور

”دکان والے بھائی آپ نے ایک ٹائی زیادہ
دی ہے۔“ روپوں کے دراز میں گھسے ذوق کو رسیلی
آواز نے متوجہ کیا وہ روز کی طرح چند لمحوں بعد پھر
آگئی تھی اور شکایت بھی حسب سابق تھی وہ زیر لب
مسکراتا نری سے مڑا تھا۔

لیسے قد کی دہلی سی لڑکی عجیب بے جوڑ سے لباس
پہنتی تھی۔ دو پیسہ ہمیشہ کالے رنگ کا اور شلوار سفید
رنگ کی ہوتی مگر قمیص کے رنگ بدلتے رہتے، صرف
دو چوڑیاں اس کی کلائی میں ہوتیں پاؤں میں ہوائی
چپل پہنے وہ ساوگی کی سورت تھی۔ دو ہفتے ہوئے تھے
اسے اس کی دکان پر آتے۔ محلے کی اکلوتی کنفکشنری
کی دکان تھی وہ چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے

معاذ خیریدار

افسانہ

پلاسٹک کی چیزیں توڑ کے اپنا ہی نقصان تھوڑی نہ
کرتا تھا۔

”رحمت کے فرشتے تو سنا تھا اب یہ برکت کے
فرشتے کہاں سے آگئے۔“ ذوق اگر ان کی باتیں دل
پر لیتا تو بھوکا ہی مر جاتا وہ آتش بازی کرتے رہتے
اور ذوق کان بن کیے کھانا کھاتا رہتا۔ کہیں کہیں
حسب ضرورت لقمہ بھی دے دیتا۔

”لاکھوں کی تعداد میں فرشتے ہیں آسمان وزمین
پر یقیناً ان میں برکت کے بھی ہوں گے۔“ ذوق
سے چھوٹی امینہ نے لقمہ دیا تھا۔ جس پر بڑی بہن
سفینہ نے ایک چپت رسید کر دی تھی۔ وہ ابا سے
خود ڈرتی ہونہ ہوان کو ڈرانے کا کام ضرور انجام
دیتی تھی۔

”کفر مت تو لو فرشتے اللہ کی نورانی مخلوق ہیں۔“

سپاری، ٹافیاں، چپس بسکٹ وغیرہ لینے آتی، وہ روز
ہی ایک عدو سپاری، ٹائی، زائد ڈال دیتا اور بلاناغہ وہ
چند ہی لمحوں بعد لوٹانے بھی آجاتی۔ یہ سوچے بنا کہ
ایسا اتفاق روز کیسے ہو سکتا تھا۔

”رکھ لو ہم وی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے۔“

وہ تقریباً ہر روز ایسا ہی جواب دیتا تھا۔ وہ
ایمانداری سے ایک ٹائی یا سپاری جتنے پیسے اس کے
کاؤنٹر پر رکھ کر خاموشی سے لوٹ جاتی اور ذوق اسے
دور تک جاتا دیکھتا وہ پیسہ دکان کے باہر لگے چندہ
والے باکس میں ڈال دیتا، اس روٹین کو دونوں
باقاعدگی سے قائم رکھے ہوئے تھے نہ وہ زائد دینے
سے باز آتا اور نہ وہ بنا پیسے کے لینے پر آمادہ ہوتی بھلا
ہو رہا تھا تو چندے والوں کا۔

☆.....☆



Downloaded From
PAKSOCIETY.COM



تمہارے بخول کی جگہ نہیں ہے استغفار پڑھو۔“ دادی ماں نے بھی گرجتی برستی انٹری ماری تھی وہ کچھ نہ بھی بولتے تب بھی دادی سارا دن ڈرائی دیھمکاتی تھیں۔ تو اب تو انہوں نے بولنے کی گستاخی کی تھی۔

”دادی! سوڈ پر وعظ کرنے سے پہلے اگر اصل پر تبلیغ کی ہوتی تو زیادہ فائدہ مند تھا۔ انہیں نہیں سمجھاتیں ذرا سا گنگنا کیا لوں جھٹ سے کہتے ہیں بھجن مت پڑھا دھرا استغفار نہیں بنتا۔“

ذوق کو ابا کی چھڑی اور دادی کی چھڑی دونوں سے بیک وقت واسطہ پڑتا تھا۔ بھی تو دم سادھے پڑا رہتا اور بھی حسب طاقت دفاع کر دیتا اور یہیں سے جنگ عظیم کا طبل بج جاتا۔

”اب یہ سوڈ کہاں سے آگیا بیچ میں اے ڈاکر دین پتہ کر کہیں ہمیں حرام تو نہیں کھلا رہا۔“ دادی نے تو ایک نیا مجاز کھول دیا تھا۔ ابا کی لعن طعن کو رابطہ مہیا کرنے کا کام وہ بخوبی انجام دیتی تھیں اس نے سوڈ کا لفظ محاورتا ادا کیا تھا ٹکرائے لینے کے دینے پڑ گئے ان کے ہاں نماز روزہ کی پابندی ہو نہ ہو الفاظ کی ادائیگی میں احتیاط ضروری ہوتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ احتیاط صرف بچوں کو کرنا ہوتا تھا بڑوں کے لیے ہر قسم کی آزادی تھی۔

”بک بک نہ کر جو کہتا ہوں وہ سمجھ اس ایک دکان سے میں نے رنج کے کمایا اور تم ساروں کا دوزخ بھرا ہے، آدمی آمدنی بھی نہیں رہی کہاں اڑانا پھر رہا ہے میرے خون پیئے کو۔“ ابا رٹی رٹائی تقریر روزانہ ارشاد فرماتے اور روز اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”اباجی! پورا محلہ ادھار پر چلا ہے۔ وقت پر نہیں دیتے برے ہی دیتے ہیں مہینہ کے آخر میں حساب کتاب کرو تو نفع نقصان کا اندازہ ہوگا روزانہ کی کمائی سے بات سمجھ نہیں آتی تو پھر بگڑتے ہو۔“

ان کے درمیان بہترین سامع اماں تھیں۔ وہ ہنسی زبردگی سوچتی رہیں کہ جس دکان کی آمدنی کے

ان کے اکلوتے سپوت کو دن بھر طعنے ملتے ہیں اس آمدنی نے کبھی انہیں ایک سال نہیں دو جوڑے نصیب نہیں کیے۔ ایک سال میں گری کا ایک جوڑا پتا تین تو دوسرے سال میں سردی کا ایک سوٹ سلواتیں، تین وقت کی روٹی پر دوزخ بھرنے کی اصطلاح سارا دن کان میں اٹھ لگی جاتی۔ آٹھ افراد کے لیے دو کمروں کا ذاتی مکان کل اثاثہ تھا اور ایک دکان جو پیٹ بھرنے کا آسرا تھی۔ چار بہنوں کا ایک بھائی ان کا واحد سہارا تھا۔ جو دن بھر طعنوں تشنوں کی زد میں رہتا مگر یہ وہ باتیں تھیں جو وہ صرف دل میں سوچتی رہتیں۔ زبان سے ادا کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ کچھ کہہ کر تو یوں کا رخ اپنی جانب موڑنے پر بھی آمادہ نہ ہوتی تھیں۔ کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو لڑائی کے وقت جواب بھول جایا کرتے ہیں۔



”اچھی طرح سے گن کے ڈالو بھائی کم زیادہ نہ ہو۔“ وہ معصومیت سے بولی تھی۔ ذوق کے لیوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ جتا گئی تھی کہ زائد چیز نہ ڈالے ہمیشہ کی طرح اسے روز پھر لوٹ کے جو آنا پڑتا تھا۔

”گنتی اچھی نہیں ہے میری کوئی کمی بیشی ہو تو دھیان نہ دیا کرو۔“

ذوق لا پرواہی سے کہتا ہر مرتبان سے مطلوبہ اشیاء نکال کر شاپر میں ڈال رہا تھا۔ وہ ہر چیز برابر مقدار میں پانچ الگ الگ شاپرز میں ڈلوانی تھی اور وہ تابعداری سے روز ایسا ہی کرتا تھا۔ ہاں بڑے شاپر میں چھوٹے شاپرز کو اکٹھا کرتے ہونے ایک آدھ زائد چیز ڈال دیتا جو الگ ہونے کی بناء پر نظر آجاتی اور وہ لوٹانے کے لیے واپس بھی آجاتی بس ایک ہی دن میں دوبارہ دیکھنے کی منشا تھی اس کی۔

”اتنا سارا سامان کون کھاتا ہے؟“

ذوق انتہائی ست رفتاری سے کام کرتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب دکان پر اس کے علاوہ اور کوئی گا ہک نہ ہو اور ایسا موقع محلے کی واحد دکان پر کم ہی میسر آتا تھا۔ آج بھی اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ سو موقع غنیمت جان کر اس نے بات بڑھانے کے لیے سوال داغا۔

”چھوٹے بہن بھائی ہیں جب تک یہ کھاتے رہتے ہیں منہ بند رہتا ہے تھوڑا سکون مل جاتا ہے۔“ بظاہر وہ نارمل انداز میں کہہ رہی تھی مگر اسے اس کی بیزارگی سوچ کر ہنسی آگئی۔ بڑے بہن بھائی کا سب سے بڑا قصور یہی ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہوتے ہیں انہیں چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ایسے سپرد کی جاتی ہے جیسے یہ ان کی ذاتی خواہش ہو۔

”تم خود بھی کچھ کھاتی ہو یا بس ان کا منہ بند دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہو۔“ اس کے ناک چڑھانے کے جواب دینے پر ذوق نے مزید تکلفات توڑنے کی سعی کی تھی مگر اب کی بار وہ بے نیازی سے خاموش کھڑی رہی اور اس کی سستی پر دل ہی دل میں کو سے گئی۔

”جلدی کرو ناں بھائی! آپ کو گنتی ویسے نہیں آتی اور کام بھی کاہلی سے کرتے ہو۔“ اس کے بلاوجہ فری ہونے پر مقابل کو بھی دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا تھا۔ ذرا کی ذرا میں اس نے ذوق کی بیٹہ بجا دی تھی وہ بوکھلا گیا تھا۔ وہ ایک ہی جملے میں اس کی دو چوریاں پکڑ گئی تھی۔ ایک تو زائد چیز ڈالنے کی دوسری بلاوجہ دیر لگانے کی۔

”گنتی نہیں آتی تو سکھا دو پر غصہ تو نہ کرو، زبان میں چاشنی اچھی بات ہے۔“

”آپ کو میرا نام کس نے بتایا؟“ ذوق نے تو بس اسے لائن پر لانے کی کوشش کی تھی مگر وہ حیرت سے دریافت کرنے لگی۔ وہ خود

حیران تھا کہ اس نے نام لیا ہی کب ہے؟ اسے اسے خوب سوچنے پر فضول سا خیال آیا کہ کہیں اس کا نام گنتی تو نہیں ہے کیونکہ اس نے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔ ”دیکھو بھائی! میں بڑی ہوں اس لیے مجھے یہاں آنا پڑتا ہے۔ پر تم میرا نام کسی اور کو مت بتانا۔“ وہ پھر سے تنبیہ کر رہی تھی یہ دیکھے بنا کہ وہ اپنے الفاظ میں سے اس کا نام تلاش کرنے میں پوری طرح فرق تھا۔

”چاشنی ہر ایک کے لیے تھوڑی نہ ہوتی ہے۔“ وہ ناصحانہ انداز میں بڑ بڑائی بوٹ گئی تھی۔ اسے ابجھن کا سرا تھا تو وہ طمانیت سے مسکرایا تھا اور..... تو معصوم خریدار کا نام چاشنی تھا۔ رکھنے والے نے مٹھائی کھا کر نام رکھا تھا۔

☆...☆
سفینہ کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ اس کے ذمہ اوپر کے بہترے کام تھے اور دکانداری تو مستقل روک تھا اب اس کو سوائے صلواتیں سنانے کے کچھ اور نہ آتا تھا۔ مصروف روٹین میں بھی اسے شام میں آتی معصوم خریدار نہ بھولتی اور زائد شے ڈالنے کی پختہ عادت کو وہ ویسے بھی ایمانداری سے بھارتی تھا۔ دونوں کی مستقل مزاجی عجیب ہی تھی ذوق ایکسٹرا ڈانے جاتا اور چاشنی لٹائے جاتی اس نے بھی بھی چیز قبول نہیں کی تھی۔

شادی میں سارا محلہ مدعو تھا مگر ایک گھر کو انواہیٹ کرنے میں باپ بیٹے کی پھر سے ٹھن گئی تھی۔ محلے میں نئے نئے وارو ہوئے شیخ احسان کو مدعو کرنے میں ذاکر دین کو تامل تھا وہ دو اور دو جمع بائیس کرنے کے عادی تھے۔ صرف انہی لوگوں کو بلانے کے حق میں تھے جن کے ہاں کچھ دیا دلا یا ہوا تھا۔ واپسی کا موقع جو تھا شیخ احسان سے ابھی دینے دلانے والا معاملہ جو نہیں تھا۔ جب کہ وہ انہیں بلانے پر بھند ضرور تھا مگر اپنی ضد کا کوئی معقول

ریزن دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اب ابا کو کیسے پتا تا کہ شیخ احسان کو نہیں چاشنی کو بلانا مقصود تھا۔ کیسے لگتی ہوگی وہ فینسی ڈریس میں جیولری پہنے سنگھار کیے۔ وہ اپنی سوچوں میں مگن تھا کہ اس کی سب سے بڑی مخالف پارٹی نے اس کا میدان مار لیا تھا۔ دادی ماں نے ابا کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔

”آنے دے شیخ کو چھ بجے ہیں اس کے کچھ دینا دلانا کر لے گا تو آگے اپنے چھی کام آئے گا۔“
 دادی کی معلومات کافی تیز تھیں انہیں شیخ احسان کے مکمل کوائف بچوں کی تفصیلات نام تک معلوم تھے یہیں اسے پتا چلا کہ چاشنی تین بہنوں تین بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ سب سے بڑا بھائی شاہ میر ہے جو دعویٰ میں جاگ کرتا ہے اسی کے دم سے گھر کی وال روٹی چلتی ہے شیخ صاحب تور یٹارمنٹ کے بعد محض اخبار پڑھنے، شیا سیات پر بحث کرنے اور بچوں کو ڈپٹنے کے سوا کچھ نہیں کرتے ابا کی طرح اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ ایسے اباؤں کی موجودگی میں گاڑی اسٹیشن پر لگے گی بھی کہ نہیں۔

شادی میں چاشنی اپنی تمام تر فینسی کے ساتھ آئی تھی مگر وہ ویسی قطعاً نہیں لگ رہی تھی جیسا اس نے سوچا تھا۔ سوٹ میں خاص بات صرف یہ تھی کہ وہ مکمل میچنگ تھا عام دنوں کی طرح رنگ برنگے اسٹائل میں نہیں تھا جیولری نام کی کوئی چیز نہیں تھی وہی اس کی مخصوص دو چوڑیاں اور وہی کس کے گوندھی ہوئی چوٹی اس کی ساڈگی کی وجہ بھی اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ چار چھوٹے بہن بھائیوں نے اسے کتنی کا ناچ نچایا ہوا تھا اس کی امی حد سے زیادہ دزنی شیخانی تھیں۔ جہاں بیٹھیں سو بیٹھی رہ گئیں وہ شیطانوں کے ٹولے کے پیچھے ہلکان ہوئی پھر رہی تھی۔ ذرا دیر کو سستانی تو شیخ صاحب کی چٹکھاڑتی آواز آتی۔

”دیکھ شنی! اس چوہے کو بل میں گھسا جا رہا ہے۔“

پانچ سالہ چھوٹا بھائی میز کے نیچے گھسنے لگتا تو وہ ہانگوں سے گھسیٹ کر باہر نکالتی اس کے سر کے بال بکھر گئے تھے اور کپڑوں کی گریس تو بس نام کی رہ گئی تھی۔ وہ جو اپنے گھر کی شادی کی ڈھیروں مصروفیات کے ساتھ ساتھ برابر سے نظر میں رکھے ہوئے تھا اس کی حالت دیکھ کر کڑھ کے رہ گیا۔

اچانک اس کے ذہن میں چاشنی کی بات درآئی۔ ذوق گھر سے ملحق دکان سے پانچ پیکیٹس بنا کر لے آیا اور چاشنی کو تھما دیئے وہ مشکور نظروں سے اسے نکلنے لگی۔ چاروں شیطانوں کو ٹھونسے پر لگا کر وہ ذرا دیر کو سکون سے بیٹھ گئی مگر وہ اس افراتفری میں بھی ذوق کی زائد ڈالی چھوہارے کی کھلی کود دیکھ کر متعجب ضرور ہوئی، گنتی واقعی بہت کمزور تھی ایک ہلکی سی مسکان اس کے لبوں کو چھو گئی۔

☆.....☆

ہفتہ بھر ہو گیا تھا۔ چاشنی کا دیدار کیسے وہ آج کل دکان پر نہیں آرہی تھی۔ وجہ اسے ادھر ادھر سے پتا چل ہی گئی تھی اس کا بڑا بھائی وہی سے آیا ہوا تھا اور چھوٹے شیطانوں کا منہ بند رکھنے کے لیے بہت کچھ لایا تھا۔ اسی لیے وہ ان کے ٹھونسے کا سامان خریدنے نہیں آرہی تھی۔ ذوق کی دلچسپی دکھائی دے رہی تھی اور اسے واحد تفریح بھی فی الحال بندھی۔ اس لیے بوریت اٹھنا پر تھی بی اے مکمل کیے دو سال ہو گئے تھے۔ مزید پڑھنے کا شوق بھی نہیں تھا اور ابا کی طرف سے اجازت بھی نہیں ملی تھی وہ صاف لفظوں میں کہتے تھے۔ جب دکان چلانی ہے تو گریجویشن کیا اور مڈل پاس کیا ابتدا میں وہ اس مقولے سے سخت نالاں تھا مگر اپنے کالج فیلوز کو ڈگری کے ساتھ نوکری کے لیے جوتیاں گھساتے دیکھ کر اب وہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ چلتی چلانی دکان غنیمت تھی عزت کی روزی تھی اور سب سے بڑھ کر اپنی مرضی کی بھی۔ اب یہی مرضی کیا کم تھی کہ استحقاق

سے چاشنی کے لیے زائد شے ڈال دیا کرتا تھا کسی اور کی غلامی میں ایسا کرنا کہاں سے ممکن ہوتا ہے؟ چاشنی نہیں آرہی تھی مگر وہ اس کے حصے کی کوئی نہ کوئی زائد سپاری یا ثانی روز کی روز ضرور الگ کر لیا کرتا تھا اور یہ پختہ ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ اگر چاشنی نے ذرا سی کمزور راہ دکھائی تو وہ یہ خود سے فرض کیا اس کا حق ضرور اس کے سپرد کر دے گا۔

دو دن بعد اسے چاشنی سے ملنے کی نئی راہ مل گئی تھی ہوا یوں تھا کہ دکانداری کر کے رات کو گھر لوٹا تو کھانے میں پیٹنگن اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ یہ وہ سبزی تھی جس کے بارے میں اس کے خیالات بیان کرنے لائق نہیں حسب استطاعت وہ بک جھک کے بنا کھائے کمرے میں آ کے لیٹ گیا تھا اگر معلوم ہوتا گھر میں یہ پکا ہے تو باہر سے ہی کچھ کھا آتا وہ خالی پیٹ افسوس کر رہا تھا کہ بریانی کی مہنگ نے اسے متوجہ کیا وہ اسے خالی پیٹ کی خام خیالی سمجھ کے اگور کرنے لگا مگر بائیں طرف میز پر رکھی پلیٹ نے اسے کزنٹ لگا دیا وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا مزیدار مرغی بریانی دیگ کی ویسے بھی اس کی کمزوری تھی پاس کھڑی ایندنی کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

”کہاں سے آئی ہے یہ نعمت؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے انصاف کرتے ہوئے بمشکل بول پایا تھا۔

”شیخ صاحب کے گھر سے نیاز آئی ہے۔ سنا ہے دینی کی آمدنی ہے صدقہ اتارنے کے لیے دیگ چڑھائی ہے۔“ ایندنی نے تفصیلی جواب دیا وہ بہنیں خود پیٹنگن کھا کر بھائی کے لیے بریانی سنبھال لیتی تھیں۔ آخری نوالے میں جا کر اسے احساس ہوا مگر اب وہ آفر کرنے لائق نہیں رہا تھا۔

”سوری بہنا!“ وہ شرمندہ تھا مگر ایندنی کی کھلتی مسکراہٹ میں محرومی کا کوئی تاثر نہ تھا وہ اکلوتے بھائی کی خوشی میں خوش رہنے والی ہستی تھی۔ رات تو

وہ بریانی کے نشے میں مست رہا۔ صبح چڑھتے ہی اسے یاد آیا کہ یہ نعمت خداوندی چاشنی کے گھر سے آئی تھی جھٹ سے اس کے دماغ نے ترکیب سوچھا دی اماں سے شیخ صاحب کے بھیجے برتن لیے وہ اس کے گھر جانے کے لیے تیار تھا۔ دکانداری کے علاوہ کبھ کام نہ کرنے والے کی خود سے برتن لوٹانے کی پیشکش پر سب گھر والے حیران ضرور تھے مگر مشکوک قطعاً نہیں تھے کیونکہ ان کے نزدیک بھائی سے زیادہ نیک کوئی نہیں تھا اور شیخ صاحب کے گھر کے شیطانی ٹولوں سے ڈر کوئی نہیں تھا۔

”وہ اماں نے آپ کے برتن بھجوائے ہیں اور شکر یہ بھی کہلوایا ہے۔“

بدقسمتی سے دروازہ شیخانی نے کھولا تھا۔ اس نے منمناتے ہوئے شرافت سے عرض کی۔ گھر سے برتن خالی لایا تھا راستے میں اس نے پھل خرید کر برتنوں میں سجا دیا تھا۔ واپس لوٹتے ہوئے دروازہ کے پار سے دکھتی چاشنی کو چور نگاہوں سے تکتا وہ لوٹ گیا تھا،

”بڑے وضع دار لوگ ہیں۔ خالی برتنوں کو بھر کے واپس بھیجا ہے۔“ شیخ صاحب کو دینے دلانے کی روایت نے بڑا متاثر کیا تھا، شیخانی نے چھل گننے شروع کر دیئے تھے۔ چھ سبب ہیں اور چھ امرود ہیں۔ اس کیلے سات کیوں ہیں۔ ایک زیادہ ڈال دیا ہو گا ریڑھی والے نے۔“

شیخانی کے تبصرے پر چاشنی نے چونک کر سر اٹھایا اور ایک زائد کیلا دیکھ کر اس کی ہنسی بڑی خود ساختہ زوردار تھی۔ بے محل ہنسی پر اماں ابا نے گھورا ضرور تھا مگر وہ ذوق کی اس پختہ عادت پر مخلوط ہو کر ہنسی روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔

☆.....☆

”بھائی چار جماعتیں پڑھ لیتے تو کتنی آجاتی۔“
بیس دن بعد چاشنی سابقہ مقصد کے ساتھ پھر

سامنے تھی۔ آج اس نے تیر چلایا تھا۔ ذوق کی زیر لب مسکراہٹ زندگی سے بھر پور تھی۔ وہ چاشنی کے چنگلوں سے مزہ لیتا تھا مگر بھائی لفظ کی کڑوی گولی بھی مجبوراً نگلنی پڑتی تھی۔

”تم نے چار جماعتیں پڑھ لیں کیا؟ ٹیوشن دے دو مجھے حساب کا سبجیکٹ پڑھا دو۔“ وہ منٹوں میں بے تکلف ہوا تھا اور فرمائشیں کرنے لگا تھا چاشنی بے اختیاری میں پھیل جاتی تھی اور غلطی کا احساس ہوتے ہی فوراً خود میں سمٹ جاتی تھی۔

”بھائی! جلدی کرو بچے شور مچا رہے ہوں گے ابا غصے میں ہوں گے۔“

آج خاص طور پر ابا کا ذکر کر کے چاشنی نے اسے جانے کیا جملایا تھا۔ آج تو بھائی کا لفظ بھی خاصا جتا کے اوا ہوا تھا۔ ذوق کو اس کی مصومیت میں بھی سمجھداری صاف نظر آتی تھی۔ چاشنی کو سامنے پا کر اس کے ہاتھوں میں دم ہی نہیں رہتا تھا۔ مرم کے شاپرڈ تیار کرتے۔ آج وہ کئی بار اس کے چہرے کو نگاہوں میں اتار چکا تھا۔ ہتیس بڑھ رہی تھی۔ جسار تیس قدم بڑھا رہی تھیں۔ چاشنی کے ہاتھوں میں شاپرڈیجے اس کی نازک انگلیوں کو ارا داتا چھوا بھی تھا۔ چاشنی نے بھی شاید کوئی بھیید پالیا تھا کیونکہ آج زائد شے لوٹانے وہ خود نہیں آتی تھی اپنے سے چھوٹے بھائی کو پیسے دے کر بھجوا دیا تھا جسے ذوق نے بڑے آرام سے پیشے میں اتار لیا تھا۔ پہلی بار زائد شے کے پیسے چندہ کے بکس میں نہیں گئے تھے وہ رشوت کے بطور اس کے بھائی کی جیب میں رہ گئے تھے۔ ذوق نے تعلق کی پٹری پر ٹرین کو دھکیل دیا تھا دیکھنا یہ تھا کہ ٹرین چلتی تھی کہ نہیں۔

☆.....☆

دن پر لگائے اڑ رہے تھے۔ ذوق کی دکانداری میں پختگی آگئی تھی۔ ابا سے ہوئے معرکوں میں کئی

واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ ذوق نے ادھار بند ہے کا اشتہار جو لگا دیا تھا۔ سو منافع کی شرح ابا کو مطمئن کر دیتی تھی۔ چاشنی کی دکان پر آمد بہت کم ہو گئی تھی۔ امینہ کے ذریعے اسے پتا چلا تھا کہ اس نے میٹرک سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ سارا گھر سنبھالتی تھی اور بچوں میں لگی رہتی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی سیامان خریدنے آتا تھا ذوق کی عادت جوں کی توں تھی۔ زائد شے اب بھی چاشنی کے دربار میں جاتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ تب چاشنی اس کی قیمت دینے ضرور آتی تھی اور اب وہ شے بنا قیمت کے قبول کر لی جاتی تھی۔ ایک روپے کی ایک معمولی شے نے ایک بڑے کھیل کی ابتداء کر دی تھی۔ چاشنی محلے بھر کے کپڑے بھی سلائی کرنے لگی تھی امینہ کو اس کی سلائی پسندھی اور باقی درزیوں کے مقابلے میں کم پیسے لینے کا فائدہ بھی حاصل تھا۔ یہاں بھی ذوق کی عادت برقرار تھی۔ ہمیشہ سلائی کے تین سو روپوں کے ساتھ دس روپے ایکسٹرا ڈال کر چاشنی کے بھائی کو دیتا تھا۔ چاشنی اصل قیمت شیخانی کے ہاتھ پر رکھتی تو زائد روپے اپنے روپے جمع کرنے کے بکس میں ڈال دیتی اسے بھی اب ذوق کی اس عادت کی گویا عادت سی ہو چلی تھی۔

کچھ کہا نہیں گیا تھا کچھ سنا نہیں گیا تھا اور حکایت بیان ہوتی جا رہی تھی منزل دھندلی تھی۔ مسافر کمزور مگر ٹرین گھسک گھسک کے چلتی جا رہی تھی یہ جانے بنا کہ آخر اسٹیشن ہے کون سا؟

☆.....☆

آج کے دن غیر متوقع ملاقات نے اس کے دل کی کلی کھلا دی تھی۔ محلے میں واحد ان کا گھر تھا جہاں گاڑی دو واڑے پر کھڑی تھی۔ شیخ صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ محلے والوں کی ایما پر ذوق انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر مقامی اسپتال لے گیا تھا۔

کارڈ ایک افیک تھا۔ ایڈٹ کر لیا گیا تھا۔ شیخانی تو خود کو سنبھال لیتی تو بہت تھا واحد بڑی ہستی چاشنی اسپتال میں موجود تھی اور اسے دیکھنے کی چاہ لیے زمانے بھر کا ہمدرد ذوق بھی اس کے شانہ بشانہ تھا اگرچہ دکان بے دقت بند کرنے پر اپا سے اچھی خاصی لے دے ہوئی تھی مگر وہ یہ نادرموقع گنوانے کو تیار نہیں تھا۔

بڑھایا تھا مگر چاشنی ایسی بے تکلفی کی روادار نہ تھی۔ سر جھکائے آگے بڑھنے لگی تو ذوق نے اس کی جانب ایک اور سنی پلاسٹ بڑھا دیا تھا۔ وہ یہاں بھی ایکسٹرا دینے سے باز نہیں آیا تھا۔ چاشنی کے مسکراہٹ ضبط کرتے لب دیکھ کر وہ کھل اٹھا تھا اور وضاحت دینے لگا۔

”دہ میں نے سوچا اگر ایک نے کام نہ کیا تو دوسرا.....“

علاج کے سارے انتظامات چاشنی کی بھائی کی آمدن سے بخوبی حل ہو رہے تھے مگر اسے اسپتال میں کھانا اور چائے مہیا کرنے کی ذمہ داری از خود ذوق نے اٹھارھی تھی۔

دہ جملہ ادھورا چھوڑ چکا تھا۔ جانتا تھا کہ وضاحت بے کار تھی۔ چاشنی کے لیے اپنے جذبات کے اظہار کی ایک انوکھی راہ نکالی تھی اس نے دہ نگاہوں سے پیام نہیں دیتا تھا اور نہ ہی زبان سے حال دل بیان کرتا تھا مگر اس کی ایک وکھری عادت نے اس کی عرضی چاشنی کے دل کے پوسٹ بکس میں ارسال کر دی تھی اور چاشنی کی نرم مسکراہٹ نے دھولی کی رسید بھی کاٹ دی تھی۔

چاشنی چائے پیتی نہیں تھی مگر ذوق جب لا کرویتا تو ازراے شکر لے لیتی اور آدھا کپ پی بھی لیتی۔ شیخ صاحب کو ہنسی چائے دینے کے بعد وہ اس کے لیے شکر ڈال دہ ایک چمچ کہتی مگر وہ ایک چوتھائی چمچ ایکسٹرا ڈال دیتا چاشنی اپنی ہنسی پر بمشکل قابو پاتی تھی۔ عجیب عادت تھی اس کی دزیننگ آدر میں اس کے گھر کے افراد ملنے آئے تھے ننھے شیطانوں کو دیکھتے ہی وہ جان گیا کہ اب چاشنی کی پریڈ شروع ہو جائے گی۔ دہ فوراً منظر سے ہٹ گیا تھا۔ کچھ دیر میں لوٹا تو حسب توقع منظر سامنے تھا وہ سیڑھیوں پر دیوانہ وار نہیں پکڑنے کے لیے ددڑ رہی تھی۔ ذوق نے فوراً سے بیشتر ہاتھ میں تھاے ریپر زبچوں کو تھا کر مضروف کر دیا تھا۔ چاشنی آخری سیڑھی پر پاؤں تھاے بیٹھی تھی۔ ذوق پاس چلا آیا۔ اس کے پاؤں پر بھاگم بھاگم میں کسی بچے کا ناخن لگ گیا تھا۔ خون بہہ رہا تھا۔ ذوق کی پھرتی قابل دید تھی۔ میڈیکل اسٹور سے سنی پلاسٹ لا کر اس کے پاؤں پر چپکا دیا تھا۔ دہ اس کی ممنون تھی جو اخلاقیات کے یا انسانیت کے جانے کون کون سے اصول بھار ہا تھا۔ اسے دسہارا دینے کے لیے جھکتے ہوئے ذوق نے ہاتھ



جان نثار دکاندار اور معصوم خریدار کا بے غرض لین دین جاری تھا مگر پہاڑوں کی تہہ میدالی زمین اور محبت کے آسمان پر زلزلے بھی بتا کر نہیں آتے، فریقین خواب خرگوش میں گم ہوتے ہیں اور تباہی سر پر آن پٹھتی ہے۔ کتنی معمولی سی عادت تھی اس کے نزدیک کہ وہ اظہار شوق کے تحت کوئی نہ کوئی زائد شے اس کے دامن میں ڈال دیتا تھا۔ دہ سمجھتا تھا کہ یہ ایک عام حرکت تھی جس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ہمارے معاشرے اور ردایات میں فرق پڑنے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ سو فرق پڑ گیا تھا۔ وہ ایک عام سادہ تھا۔ کچھ دیر تک چاشنی ردد کی طرح خریداری کر کے گئی تھی۔ ایک ایسی زائد ثانی کے ساتھ جس کی قیمت اب دہ ادا نہیں کرتی تھی۔ کچھ ہی لمحے گزرے تھے۔ کب ایک طوفان برپا ہو گیا تھا۔ شیخ صاحب

چاشنی کو بازو سے گھسیٹ کر اس کی دکان تک لے آئے تھے۔ مخالفت اور لعن طعن کا شغل کرتے ہوئے چاشنی کے بکھرے بال اور لال سرخ چہرہ خطرے کا الارم دے رہے تھے۔ ذوق لقمہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

”سچ سچ بتانا ذکر کے پتر یہ ثانی اس نے تیری دکان سے چوری کی ہے یا تو نے خود اسے دی ہے جلدی بول۔“

شیخ صاحب کو اسپتال سے آئے مہینہ بھر ہو گیا تھا مگر ان کی دھواں چھوڑتی ناک کو دیکھ کر لگتا تھا کہ انہیں کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ بچوں میں شاپرز بانٹتے ہوئے وہ ایک بے ضرر زائد ثانی ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ جس نے انہیں پتا نہیں کیا سو جھا دیا تھا کہ وہ آئے میں نہ رہے تھے۔ ذوق کے لیے عجب مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ چاشنی کے والد کو شبہ تھا کہ اس نے چوری کی ہے۔ اگر وہ خاموش رہتا تو چاشنی کو چوری کرنے کی سزا سنائی پڑتی اور اگر کہہ دیتا کہ اس نے خود دی ہے تو دونوں پر جانے کیا کیا الزام لگ جاتے۔ دونوں صورتوں میں چاشنی کے لیے اذیت تھی۔ ہاں ذوق کے لیے ایک صورت میں رہائی تھی کہ وہ خاموش رہے تب اس کی طرف کوئی انگلی نہ اٹھتی، محلہ جمع ہو گیا تھا اور سب کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ سبھی کا تقریباً یہی خیال تھا کہ چاشنی نے چوری کی ہے اس کا باپ اسے اخلاقیات سکھانے کے چکر میں خود اخلاق سے عاری ہو گیا تھا۔ زمانے بھر کے سامنے بیٹی کو مجرم بنا کر جانے تربیت کا کون سا پل طے کیا جا رہا تھا۔ دنیا واہ واہ کر رہی تھی کہ شیخ نے اپنی بچی کی غلطی پر اچھی طرح تنبیہ کی مگر بچی کے لیے زندگی کتنی کٹھن ہونے والی تھی اس کا انہیں اندازہ نہ تھا۔

ذوق کٹھنوں میں کھڑا تھا اس کی گواہی پر چاشنی کا کیس منحصر تھا۔ چاشنی کے لیے تو سزا ہر دو صورت

میں مقرر تھی۔ تو کیا ذوق کو خود کا دامن بچالینا چاہیے تھا وہ شش و پنج میں پڑا تھا اور شیخ صاحب اور دیگر محلے داروں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ سچ بیان کیا جائے۔ نئی افتاد آ پڑی تھی ذاکر دین بھی شور سن کر آگئے تھے اور اب کڑے تیوروں سے ذوق کو تک رہے تھے اگر وہ کہہ دیتا کہ زائد شے ڈالنے کی اسے عادت ہے تو اس عادت کے پس منظر اور محرکات کو بیان کرنے کے بعد ان گھورتے اباؤں سے کیسے نجات ملے گی؟

ذوق کو عقل نے آواز دی کہ خاموش رہے اس صورت میں زیادہ سے زیادہ چاشنی کو اس کے ابا ایک دو تھپڑ لگائیں گے اور بات آئی جانی ہو جائے گی مگر دوسری صورت میں دونوں کی اچھی خاص درگت بنتی دنیا افسانے میں رنگ بھرتی اور لعن طعن کی ایک نئی کہانی جنم لے لیتی۔ مگر ذوق اپنے دل کا کیا کرتا جو چاشنی کو تنہا چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

”بولتا کیوں نہیں ہے تو گوند لگ گئی ہے تیرے منہ کو کیا یہ روز تیری دکان سے چوری کرتی ہے۔“ ذاکر دین نے اسے اچھا خاصا جھنجھوڑ دیا تھا اور زبردستی بات کو مزید سنسنی خیز بنا رہے تھے۔

”چاہے یہ میری اولاد ہے مگر اس نے چوری کی ہے تو میں اسے سزا ضرور دوں گا۔“ شیخ صاحب اپنی دانست میں ایک قابل فخر دارا دارا کر رہے تھے۔ سینہ ٹھونک کر مردانہ وار بولے۔

”بول دے اس نے چوری کی ہے۔“

”نہیں۔“ ذاکر دین کے اصرار پر اس کے منہ سے نکلا تھا مجمع پر خاموشی طاری ہو گئی تھی چوری نہیں تھی تو پھر کیا تھا؟

”اس نے چوری نہیں کی میں نے خود ایک ثانی زائد ڈال دی تھی محلے دار سمجھ کر۔“

اس کی آخری بات کو محلے والے کیا درسیت مانتے، کیونکہ یہ مہربانی اور کسی محلے دار پر کب کی تھی

اس نے اور پہلی بات سے توچہ میگوئیوں کو راہ مل گئی تھی۔ ایک مرد کا ندر کی ایک خاتون کا بک کو زائد شے دینا خواہ وہ ثانی کیوں نہ ہو کیا معنی رکھتا تھا۔ یہ وہ دونوں تو شاید اچھی طرح نہ جانتے ہوں مگر جہاں دیدہ افراد کے لیے سمجھنا دشوار نہ تھا۔

☆.....☆

ایک لمحہ جو تبدل حیات کے لیے مختص ہے جس کے بارے میں صدیوں سے سنتے آئے ہیں چاہے وہ الف لیلیٰ کی داستان ہو یا ایڈوچر ناول ایک لمحہ زندگی بدلنے کا موقع ضرور دیتا ہے اور نصیب متعین کرتا ہے کہ وہ لمحہ سنوار سے بگاڑ کی طرف لے جاتا ہے۔ یا بگڑی کو بنا دیتا ہے جلد یا بدیر وہ لمحہ ہر انسان کی زندگی میں آتا ہے اور اس کی زندگی میں بھی وہ لمحہ اچانک بنا آٹ بنا دستک کے آ گیا تھا۔

اس ایک لمحے نے سفر حیات متعین کر دیا۔ چاشنی غیر معمولی کوئی اسپر انہیں بھی عام شکل و صورت کی سادہ مزاج لڑکی تھی ذوق آوارہ صفت تھا نہ مادر پدر آزادہ دو خاندانوں کے رائج نظام میں گندھے وہ دونوں عام سی زندگی گزار رہے تھے ہوا کا رخ بدلا اور دیکھنے کا انداز بھی۔

ذوق کو چاشنی کی معصومیت بھائی جذبات ادا نیگی کے لیے محلے تو ذہن نے ایک نئی راہ نکال لی چاشنی شاید وہ زائد شے استعمال بھی نہ کرتی ہو شاید پھینک دیتی ہو مگر وہ اپنی حرکت مستقل مزاجی سے نبھانے لگا۔ مقصود یہی تھا کہ اسے جتلانے کہ وہ اس کے لیے باقی سب سے الگ ہے۔ وہ اسے ایسے نہیں دیکھتا جیسا باقی گا کہوں کو دیکھتا ہے۔ صرف اتنی سی کہانی تھی ابھی تو اس نے خود میں جھانک کے دیکھا بھی نہیں تھا کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے؟ ابھی تو محبت چاہت کے لفظ اس نے سیکھے بھی نہیں تھے۔ سکھانا تو دور کی بات تھی ابھی تو صرف چاشنی نے اس کی عادت سے سمجھوتہ کیا تھا۔ نادان کہہ کر یا بدھو کہہ

کر وہ اس کی وکھری عادت پر کھلکھلانے لگی تھی۔ کب انہوں نے ایک دوسرے سے نگاہوں ہی نگاہوں میں باتیں کی تھیں کب ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر حکایت دل بیان کی تھی۔ دعوے قسمیں نہ ہوئی تھیں مستقبل کے سہانے سننے دیکھنے شروع نہیں کیے تھے۔ موبائل پیکیجیز کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ سنگ جینے مرنے کے دعوے نہیں ہوئے تھے کہ یکا یک لمحہ فیصلہ بیچ چوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

ذوق اور چاشنی محبت کے سمندر میں اترے بھی نہ تھے کہ ساحل نے دامن چھڑا لیا تھا۔ کیا کرتا ذوق جب سڑک پر عدالت لگ گئی تھی کچھ نہ کہتا تو بات وہیں جا پختی جہاں سے چلی تھی۔ چاشنی اپنے گھر واپس لوٹ جاتی اس کا باپ چوری کی ہوئی چیز کی قیمت ادا کرتا۔ آئندہ سے وہ اس کی دکان پر نہ آئی محلے والے اپنے کام دھندوں میں لگ جاتے اور بس قصہ ختم۔

وہ پھر سے چاشنی کے پھولے بھائی کے ذریعے اپنی عادت کو جاری رکھتا کچھ عرصے بعد چاشنی کے ابا کا غصہ کم ہوتا یا گھر والے بھول جاتے کہ ہوا کیا تھا تو شاید بات آگے بڑھ جاتی اور روایتی انداز میں ان کی شادی بھی ہو جاتی مگر نہیں یہ سب مفروضات تھے وہ خیال تھے جن میں زبردستی کے رنگ بھرے جا رہے تھے۔ حقیقت تو یہی تھی کہ اس نے تبدل حیات کے لمحہ کا فائدہ اٹھایا تھا اس نے اپنی ہمت کو آزما لیا تھا۔ سڑک کی عدالت پر وہ کہا تھا جو سچ تھا لوگوں کی آنکھوں میں استہزاء تھا۔ نفرت تھی بدکاری کے طعنے تھے اباؤں کے ہاتھ میں لغزش تھی اور نگاہوں میں شعلے۔

شیخ صاحب جتنے تن فن کر کے آئے تھے جاتے ہوئے اتنے ہی بو بھل قدم تھے چاشنی کی آنکھوں میں شکوہ تھا نہ تشکر وہ بنجر دکھتی تھی۔ کچھ کہہ کچھ ناکر وہ کی پاداش میں معتب ٹھہری تھی۔ ذاکر دین

رواڈ انجسٹ [123] فروری 2016ء

READING
Section

نے دکان کا شکر گرا کر آج زبان سے نہیں ہاتھ سے گولے برسائے تھے۔ نسب ویسا ہی ہوا تھا جو ہونا چاہیے تھا نہ توقع کے خلاف نہ استطاعت سے زیادہ۔

اگر کچھ ہوا تھا تو قسمت کا فیصلہ ذوق کی ایک لمحہ کی ہمت نے کئی سالوں کی بزدلی کو ٹھکست دے دی تھی۔ محلے میں سرخوردہ بننے کے لیے ڈاکر دین نے وہ فیصلہ کر لیا تھا جو سچ صاحب کی بھی ضرورت تھی۔ دو ماہ کی ذہنی اور جسمانی اذیت کے بعد راہل گئی تھی بڑوں کو بات بتانے کی۔

چاشنی سرخ بھرہن میں لرزاں پھول بنی ذوق کے کار کی زینت بن گئی تھی۔ بے منزل ٹرین کو آدھے ہی سفر میں خود بخود منزل آن لگرائی تھی۔ صرف ایک ہمت کا ٹکٹ کٹانے پر۔

”دل چاہتا ہے تمہیں مفت میں دل دے دوں اتنے معصوم خریدار سے کیا لینا دینا“ ذوق کی شاعرانہ آمد ہوئی تھی۔ اینہ نے دروازے پر سوال کیا تھا کہ ایک اچھے دکاندار کی طرح اپنی معصوم خریدار سے حق مہر پہلے سے لے کر لے جس کا جواب اپنے انداز میں دیتا ہوا وہ چاشنی کے پہلو میں آن بیٹھا تھا۔ جس کی زیر لب مسکان گھونگھٹ کی آڑ سے دکھائی دے رہی تھی۔

”کیوں جی تم سے کچھ لینا دینا اچھا لگوں گا؟“ ذوق نے گھونگھٹ اٹھنے کے بجائے گرا ہی دیا تھا نوخیز کلی سامنے تھی تو تھلاطم شدہ جذبات بھی زوروں پر تھے۔

”لیکن مجھے تو چاہیے حق بھی اور زائد بھی۔“ چاشنی کی گل باشی اسے نہال کر گئی۔ بہت کم اس سے تکلم کا موقع ملا تھا مگر جب بھی اس نے کچھ کہا تھا اسے انوکھا ہی کہا تھا۔ جیسے کہ اب کی فرمائش اس سے سمجھ آئے بھی نہ آئی تھی۔

”مطلب حق مہر کے ساتھ منہ دکھائی دے تو رہا

ہوں اور زائد کیا دوں؟“ ذوق مجھے ہوئے دکاندار کی طرح گویا تھا۔ نگاہیں اس کے وجود پر پیوست کیے ہانہوں کا گھیرا اس کے گردنگ کیے وہ زائد پیار دے بھی رہا تھا اور وصول بھی کر رہا تھا۔

”عادت بگاڑ دی ہے آپ نے، اب کچھ بھی مکمل نہیں لوں گی ہر چیز میں زائد.....“ چاشنی پر اعتماد تھی وہ اس کے عشق میں فنا نہیں تھی مگر اس کی ہمت رندا ہو گئی تھی اس نے ساتھ بھانے کا وعدہ نہیں کیا تھا مگر ساتھ بھایا تھا۔

ذوق زائد پر زائد دے رہا تھا۔ وہ فرمائش کر کے بوکھلا گئی تھی۔ کہنا اور مانگنا جتنا آسان تھا بھگتنا اتنا ہی مشکل، ذوق اسے خود میں سموئے ایسے بکھیرتا تھا جیسے اس کے ساتھ ڈھیروں مسز تیں بھی اس کی ہانہوں میں چلی آئی ہوں اور پھولوں کی طرح بکھر گئی ہوں۔

”چاشنی! میں تو تمہیں دل بھی اکیلے نہ دوں ساتھ میں زائد شے دوں گا۔“

”کیا.....؟“ ذوق کی سرگوشی پر اس نے متعجب ہو کر کہا تھا بھلا دل کے ساتھ ایکسٹرا کیا ہو سکتا تھا ٹانی اور مٹھائی تو ہونے سے رہی۔

”اپنی جان۔“ ذوق اپنی جان پر اپنی جان وارنے کو تیار تھا۔ چاشنی کہنا چاہتی تھی کہ اس کی جان فاضل نہیں اس کے لیے بہت قیمتی ہے مگر کیسے ہوتی؟ جذبات ذوق پر حاوی تھے اور وہ خود چاشنی پر کہنے سننے کا وقت گزر گیا تھا۔ ان کی لواستوری شارٹ کٹ سے مکمل ہو گئی تھی۔ جس افسانے کو انجام کے لیے پاڑ بیلنا تھا، انہیں ایک لمحہ کی عطا نے خوشگوار اختتام دے دیا تھا۔ منزل خود مسافر کے پاس آ گئی تھی۔

☆.....

سیدہ فرزانہ حبیب فرزین

افسانہ

شکستہ لرزد

”نہیں بیٹے! آپ تو بہت اچھی ہو۔“ میں نے دعا کو
کوہ میں بٹھاتے پیار سے کہا۔

”آئی! کیا میں گندی ہوں؟“ دعا نے اپنی توکی
زبان میں پوچھا۔

Downloaded From
Paksociety.com

READ
SECRET

”تو ماما مجھے کیوں گندی کہتی ہیں؟ اور کہتی ہیں کہ میں بد صورت اور منحوس ہوں، جبکہ ایمان (دعا کی چھوٹی بہن) اور شاذل (دعا کا بھائی) خوبصورت اور ذہین ہیں۔“ دعا نے ایک بار پھر روتے ہوئے مجھے کہا اس کی بات سن کر میرا دل دہل گیا۔

”یہ فاترہ بھابھی اس معصوم، ننھی پری کے ذہن کو اس طرح کی زہریلی باتیں کر کے آلودہ کر رہی ہیں کیا ہو گیا ہے اللہ کی سوچ کو؟ میں تو انہیں کافی سمجھدار اور باشعور خاتون سمجھتی تھی، نہیں مجھے ان کی سوچ کو بدلنا ہوگا، ورنہ دعا احساس کمتری اور نفرت کی فضا میں پروان چڑھ

کر ایک اعتماد سے عاری اور باغی پچی کاروب دھارے گی۔“ میں نے دعا کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ 6 سالہ دعا اب میری گود میں چاکلیٹ کھاتے کھاتے سوئی تھی، مجھے اس معصوم فرشتہ پر ٹوٹ کر پیار آیا اس کی ذہانت سے چسکتی شریراں کھیں جب اپنی پوتلی زبان میں مجھے آنٹی کہتیں، اپنے اسکول کی ٹیچرز کی نقل کرتی تو مجھے بے ساختہ ہسی آ جاتی۔ مانا دعا اپنے باقی بہن بھائیوں میں کم صورت اور گندی ماٹل رنگت کی مالک تھی، مگر اس کی ذہانت اور معصومیت اسے ایک خاص روپ دیتی ہر کسی کو اس پر ٹوٹ کر پیارا آتا، وہ زیادہ

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

تردقت میرے ساتھ ہی گزارتی تھی مجھے بھی اس ننھی پری میں اپنا بچپن نظر آتا، ان تین مہینوں میں اس نے مجھے اپنا گردیدہ بنا لیا تھا۔ میں نے اسے ماتھے پر پیار کیا جس پر اس نے کسمسا کر کرکٹ بدل لی۔ آرام سے اسے لٹا کر میں فائزہ بھابھی کے یورشن میں چلی آئی۔ بھابھی شاید ابھی نہا کر نکلی تھیں ان کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔

”اسلام علیکم بھابھی!“ میں نے انہیں سلام کیا جس کا انہوں نے ہمیشہ کی طرح خوشدلی سے جواب دیا۔

”ارے آؤ، آؤ سحرش، بہت دن بعد چکر لگایا۔“

انہوں نے برآمدے میں ہی پیڈسٹل فین چلاتے ہوئے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ صبح سے لائیف کئی ہوئی تھی اور اب شام کے وقت تھوڑی گرمی کی شدت میں کمی تھی، برآمدہ کھلا اور روشن ہونے کی وجہ سے آئی ٹھنڈی ہوا دل و دماغ کو سکون پہنچا رہی تھی۔

”بس بھابھی؟“ آپ کو تو معلوم ہے میری چاب کا، اسکول سے آنے کے بعد اتنا تھک جاتی ہوں پھر گھر کے کام اور شام میں کوچنگ، پھر ہمت ہی نہیں ہوتی۔“ میں نے مسکرا کر وضاحت دی۔

”ہوں ادا تو تم ایک باہمت اور پراعتماد لڑکی ہو، مجھے تو تم پر رشک آتا ہے۔“ فائزہ بھابھی نے خوشدلی سے جواب دیا، جس پر میں نے دل میں اگلی اذیت کی لہر کو بشکل دبایا انہیں نہیں معلوم تھا کہ مجھ جیسی کامیاب لڑکی کے پیچھے ایک ناکام اور نافرمان بیٹی کا رخ شدہ چہرہ ہے، جو اس کے خونی رشتوں کی مرہون منت ہے۔

”دعا تمہاری طرف گئی ہوگی، ارے عاجز آگئی ہوں اس لڑکی سے، باقی دونوں بچے مجھے اتنا تنگ نہیں کرتے، جتنا اس دعا نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ پتہ نہیں شکل اور عادت میں یہ کس پر چلی گئی ہے، آج بھی ضد کر رہی تھی کہ مجھے ایمان کی طرح ریڈ فرائڈ دلائیں، جس میں سلور ستارے لگے ہیں، اب تم ہی ہٹاؤ، سحرش! دعا کی ادنیٰ رنگت پر ریڈ کلر سوٹ کرے گا؟ بس اسی پر میں نے ڈانٹ دیا تو منہ پھلا کر تمہاری طرف چلی گئی۔“ فائزہ بھابھی نے ہمیشہ کی طرح بیزارگی سے دعا کی شکایت لگائی، مگر آج ان کا اس طرح دعا کے بارے میں تھیک

آمیز لہجہ سن کر میرے سارے زخم ہرے ہونے لگے، ان پر جی کھڑند آہستہ آہستہ ہٹ کر نفرت و ذلت کے درد سے دوچار کر رہی تھی۔ فائزہ بھابھی شاید شربت بنانے چلی گئی تھیں اور میں اپنے رخ ماضی کا سفر بڑی تیزی سے طے کر رہی تھی۔

”لو سحرش! شربت پیو گرمی بھی تو بہت ہے۔“ میں نے بے دلی سے ان سے گلہ لیا اور پھر انہیں اپنے ماضی سے روشناس کرانے کے لئے ہمت جمع کرنے لگی۔

”بھابھی! آج میں آپ کو اپنی کہانی سنانے جا رہی ہوں، مجھے یقین ہے میری آپ جتنا سننے کے بعد آپ کا رویہ دعا کے ساتھ بدل جائے گا، مجھے معلوم ہے آپ اس کی ماں ہیں اور کوئی بھی ماں اپنی اولاد سے نفرت نہیں کر سکتی، مگر آپ کی خود ساختہ نفرت اور احساس کمتری بچوں کی شخصیت کو عدم اعتمادی اور بغاوت کے زہر سے آلودہ کر دیتی ہے۔“

فائزہ بھابھی نے چونک کر سحرش کی طرف دیکھا۔

”ہم پانچ بہن بھائی تھے، میں سب سے بڑی ہوں مجھ سے چھوٹی تین بہنیں اور بھائی ہیں، جو شکل و صورت، مزاج میں دوھیال پر گئے تھے، میری بہنیں بہت خوبصورت اور پیاری تھیں، جبکہ میں بالکل عام سی شکل و صورت کی مالک ایک بالکل عام سی لڑکی تھی۔ مگر میرا دل بہت خوبصورت تھا۔ بچپن ہی سے میں نے اپنی والدہ کو بد صورتی کا طعنہ دیتے سنا۔ وہ مجھے بد صورت، بھاری جیسے لقب سے پکارتی تھیں، جس پر میں بھی دعا کی طرح رونے لگ جاتی اور ایک آس اور امید سے ای کی طرف دیکھتی کہ شاید وہ آکر مجھے گلے لگائیں، مجھے پیار کریں مگر آہستہ آہستہ میری آس اور امید ٹوٹنے لگی، بس میری والدہ کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور کبھی کسی چیز کی کمی نہیں کی، مگر میری طلب مادی آرائش نہیں بلکہ ان کا پیار و شفقت تھا۔ کبھی وہ ممتا کے فطری جذبے سے مجبور ہو کر مجھے پیار کرتیں تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب لڑکی سمجھتی، میں تعلیم میں شروع سے ہی بہتر تھی، اسی طرح تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے میں نے بچپن سے شعور کی دنیا کی طرف قدم رکھا اب ان کے طعنوں اور نفرت آمیز رویوں

بر رونا نہیں آتا تھا، بلکہ میرے اندر ایک حساس اور کم گو لڑکی کی جگہ ایک بد زبان اور باغی نافرمان بیٹی نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اب اگر وہ مجھے کسی بات پر ڈالتیں، میری بے عزتی کرتیں، تو میں بھی پلٹ کر انہیں جواب دیتی، ان سے گستاخی کرتی۔ بعد میں مجھے احساس ہوتا تو گھنٹوں اللہ کے آگے روتی، گڑگڑائی اپنے گناہوں کی معافی مانگتی، خود سے عہد کرتی کہ اب امی میرے ساتھ جو بھی سلوک کریں، میں ان سے زبان نہیں چلاؤں گی، مگر اگلی بار پھر کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جانی جس پر میرا ضمیر کا دامن لبریز ہو جانا، اس طرح میری شخصیت تباہ ہونے لگی۔ میں اپنے اسکول میں اپنی دوستوں میں ایک خوش گفتار اور خوش اخلاق لڑکی مشہور تھی، اور گھر میں اس کے بالکل متضاد شخصیت کی مالک، جب گھر میں مجھے نفرت ملنے لگی تو باہر والوں سے محبت اور چھوٹی ہمدردی ہونے کے لئے میں ان کے ہر طرح سے کام آتی، ان سے میں اخلاق سے پیش آتی۔ میری بہنیں بھی کبھار میرے حق میں امی سے لڑتیں تو امی انہیں بھی ڈانٹ کر رکھ دیتیں، آہستہ آہستہ انہوں نے بھی مجھ سے ہمدردی کرنا چھوڑ دی، انہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں میرے حق میں بولنے سے امی ان کے ساتھ بھی نا انصافی نہ کریں۔ لہذا اب وہ امی کے غلط رویے پر ان کا ہی ساتھ دیتیں، جس پر میں اور تنہا اور ایون ہونے لگی امی کے ناروا سلوک کو دیکھتے میری سب سے چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ بد تمیزی کرنے لگی تھی۔ جو الفاظ امی میرے لئے استعمال کرتیں وہی تھیک آمیز اور ریک الفاظ میری چھوٹی بہن بھی مجھے کہتی۔ دن اسی طرح گزرتے گئے وقت کا بے رحم پہرہ زندگی کی سفاکی و خوشی کو روندتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ اب میں نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈ لی میں اپنے اندر بھرنے والے زہر کو اپنی شاعری اور ڈائری میں منتقل کرنے لگی، کوشش کرتی کہ امی سے کم سے کم سامنا ہوتا کہ کوئی رخ کلائی نہ ہو۔ یہ سب بھی مجھے کسی نہ کسی طرح برداشت تھا، مگر اس دن میری قوت برداشت سلب ہوئی، جب امی نے مجھ پر میرے ناموں زاد کے حوالے سے گھٹیا الزام لگایا۔

میرے کردار پر بہتان لگا کر میری ذات پر کچھڑا اچھالا۔ علی جو میرا ماموں زاد مجھ سے پانچ سال چھوٹا بالکل میرے بھائی کی طرح تھا، ماموں کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داری اس پر آ گئی تھی۔ وہ باپ کی شفقت سے محروم تھا اور میں ماں کے ہوتے ہوئے ان کی ممتا سے محروم ہم دونوں کا مشترکہ درد ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا، میں اپنے دل کی ہر بات، ہر غصہ ہر انتقام اب اس سے سیر کر نے لگی۔ وہ مجھے ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح سمجھاتا بھی مجھے اس نے درغلا یا نہیں۔ مگر امی کو ہماری یہ بے ضروری دوستی تو بھی برداشت نہیں ہوئی اور اس کے ساتھ بہتان باندھ کر مجھے میری نظروں میں گرا دیا، مگر میں اپنے بھائی اور پاپا کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرا ساتھ دیا مجھ پر اعتبار کیا، اسی طرح نے ہر ملی فضا میں پروان چڑھتے چڑھتے میں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور حجاب کر کے گھر کی ذمہ دار سنبھال لی۔ اب میں کوشش کرتی کہ فارغ اوقات میں بھی کوئی نہ کوئی پارٹ ٹائم جاب مجھے ملتی رہے۔ نے شک جسمانی مشقت سے مجھے دوچار ہونا پڑے گا، مگر کچھ تو ذہنی سکون نصیب ہوگا بھی۔ کبھی مجھے لگتا میرا زورس بریک ڈاؤن ہو جائے گا، مگر مجھ جیسے ڈھیٹ لوگوں کو موت بھی گٹھے نہیں لگاتی۔ یہ کہہ کر سحرش خاموش ہوئی، اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، بھابھی نے تاسف سے اس ٹوٹی بھری لڑکی کو دیکھا اس کے لبوں سے زبردستی شربت کا گلاس لگایا تھوڑی ڈھارس بندھی تو پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔

”اگر میں کوئی بھی بات کرنی بالکل عام ہی بات، جو عموماً گھروں میں ہوتی ہے، اس پر میری ماں اتنا فساد پھیلاتی کہ آخر تنگ آ کر میں بھی ان سے بد تمیزی پر اتر آتی اور میری بہنیں بھی ان کا ساتھ دیتیں، بھائی بھی میری طرف داری کرتا بھی امی کے حق میں ہو جاتا وہ تو لڑکا تھا باہر پناہ ڈھونڈ لیتا، مگر میں لڑکی ہونے کی بھاری قیمت ادا کر رہی تھی، کئی بار انہوں نے مجھے گھر چھوڑنے کا بھی حکم دیا مگر اپنی عزت و ناموس کے تحفظ کے لئے بے غیرت بن کر رہتی رہی اپنی کمائی کا ایک ایک پیسہ ان

نہیں تھی، جس لڑکی کو اپنے خونی رشتوں خاص طور پر ماں سے محبت و مان نہ ملا ہو، وہ غیروں سے کوئی اچھی امید نہیں باندھ سکتی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میرے ساتھ جتنا بھی براسلوک ہو اپنی ماں کو اس سے بے خبر رکھوں گی۔ ورنہ وہ مجھے ہی طعنہ دے گی کہ سسرال میں بھی اپنی بدزبانی کی وجہ سے جگہ نہیں بنا سکی۔ لیکن اللہ پاک واقعی بہت مہربان ہے، جس نے مجھے جیسی گستاخ اور نافرمان لڑکی کو اتنے محبت کرنے والے لوگ اور شوہر عطا کیا۔ آنٹی، آپ، اور ارسلان کی محبت میں، میں اپنی ماضی کو بھولنے لگی، آج بھی میں یہ تمام سچ یادیں آپ کے سامنے عیاں نہ کرتی، اگر آپ بھی دعا کے ساتھ وہی سلوک نہیں کرتیں جو میرے ساتھ میری ماں نے کیا۔ پلیز بھابھی وعدہ کریں! دعا کی معصوم شخصیت کو اپنی نفرت و حقارت سے آلودہ نہیں کریں گی، اسے ایک اور سحرش نہیں بننے دیں گی۔ بھابھی اولاد تو سب برابر ہوتی ہے، خوبصورتی تو اللہ کی دی ہوئی نعمت سے اگر کوئی عام صورت کا ہے تو اس میں اس بچے کا کیا قصور مگر ہم اپنے اچھے رویے سے اس کے کردار کو تو خوبصورت بنا سکتے ہیں، جس کی دنیا مثال دے۔ آپ کو میری کامیاب زندگی پر شک آتا ہے، مگر میں اندر سے کتنی ناکام اور شکستہ ہوں آج آپ کو اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ یہ کہہ کر سحرش بھابھی کے گلے لگ کر رونے لگی، بھابھی کی آنکھیں بھی نم نہیں بھابھی نے اسی وقت عہد کیا کہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک رکھیں گی۔

”دعا کے ساتھ نا انصافی نہیں کروں گی اس کی شخصیت کو مکمل اعتماد اور کامیاب بناؤں گی۔“ جہاں آراء پیغم جو سحرش کو اس کے پورشن میں نہ پا کر اسی طرف آ رہی تھیں، اندر سے آنی سحرش کی ورنہ آواز سن کر باہر ہی رگ کھیں، جیسے جیسے وہ اس کی باتیں سنتی جا رہی تھیں ان پر آگے کا درواہ ہوتا تھا، انہوں نے نفرت و حقارت کی وجہ سے سحرش کی ذات میں ایک خلاء پیدا کر دیا تھا۔ جو شاید اب ان کی محبت بھی نہ بھر سکے۔ وہ وہیں سے شکستہ قدموں کے ساتھ واپسی کے راستے پر ہارے ہوئے مسافر کی طرح لوٹ گئیں۔

☆.....

کے ہاتھ میں رکھ دیتی، میری آرزوئیں، خواہشیں تو احساس کمتری میں دب گئی تھیں۔ ابھی ڈریننگ کرنے پر میری دوستیں اور اسٹوڈنٹ تعریف کرتے تو مجھے لگتا یہ لوگ بھی میری بد صورتی کا مذاق اڑا رہے ہیں، آہستہ آہستہ میں نے خود پر توجہ دینا چھوڑ دی۔ ایک مشینی، حساس سے عاری زندگی گزارنے لگی۔ مگر اب مجھ میں ایک اور منفی تبدیلی آئی کہ اپنی ماں کا دیا ہوا زہر، سچ باتیں، نفرت و حقارت بھرا رویہ میں اپنی چھوٹی بہن پر اٹھیلنے لگی، جس کی وجہ سے وہ بھی مجھ سے پہلے سے زیادہ گستاخی و بد تمیزی کرنے لگی۔ یعنی ایک میری والدہ کے غلط رویے کی وجہ سے میرے ساتھ ساتھ باقی بہن بھائیوں پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔ اس پرستم نظریں کی میرا رشتہ نہیں ہو رہا تھا، جو بھی آتا وہ میری اعلیٰ تعلیم اور جا ب کا سن کر پلٹ کر نہیں آتا، ان کے خیال میں جا ب کرنے والی لڑکیاں شاید گھر نہیں سہا سکتیں۔ اس کا بھی مجھے طعنہ ملتا اور کہا جاتا کہ میری بد صورتی اور پختہ عمر کی وجہ سے کوئی رشتہ نہیں کرنا چاہتا مگر اللہ سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے، میں اللہ سے فریاد کرنی اپنا دردا اس سے کہتی۔ وہ جوشہ رگ سے بھی قریب ہے، جو اپنے بندوں پر برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، اپنے بندے کو تباہ نہیں چھوڑتا، جس نے ہر جاندار کا جوڑا بنایا ہے، بالآخر میری کم نائیگی و احساس ذلت کی زندگی میں ایک ہوا کا جھونکا آیا۔ میری اندھیری قسمت کو ایک روشنی کی کرن نصیب ہوئی، میری پرنسپل کے توسط سے میرا رشتہ ایک اچھے اور شریف گھرانے میں ہو گیا، جس پر میری والدہ کو اطمینان ہوا تو مجھے بھی سکون ملا کہ شاید اب ان کی طنزیہ باتوں سے چھٹکارا مل جائے، شاید اب وہ میری جدائی کی وجہ سے مجھ پر محبت پھجھور کرنے لگیں، مگر جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے، ان کا رخ رویہ واپس لوٹ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا مجھے اس گھر سے رخصت نہیں کیا جا رہا بلکہ میرے جنازے کو کندھا دیا جا رہا ہے۔ بالآخر بغیر ماں کی دعاؤں اور بہنوں کی شہادتوں کے خوشگوار پاؤں کے بغیر میں رخصت ہو کر اس گھر میں آگئی مجھے کوئی امید نہیں تھی اپنی آئندہ زندگی کے حوالے سے کوئی خوش گمانی

حمیرا قریشی

الحسانہ

سجیدتِ جبرائیلؑ نہا میرا



READING
SOCIETY



شام کے سائے تاریکی کی چادر میں مدغم ہونے لگے تھے، نیلگوں آسمان پر سیاہی پھیلنا شروع ہو چکی تھی، جگمگ کرتے بے شمار ستاروں کے جھرمٹ میں اکلوتا چاند علیہ کی بے قراری کا مزہ لے رہا تھا۔ علیہ بے چینی کے احاطے میں گھری مسلسل ٹہل رہی تھی۔ چھت پر تہائی کے ہمراہ منتظر محبوب تھی، نگاہیں ہنوز برابر والی چھت پر لگی تھیں، کچھ لمحے سر کے تو نگاہوں کو یکدم فرار آیا۔ وہ دبے قدموں سے اسی کی سمت آ رہا تھا۔ چھتوں کی دیوار آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ دیوار پھلانگ کر علیہ کے روبرو آکھڑا ہوا، نگاہیں پھل پھل کے محبوب کے دیدار سے سیراب ہو رہی تھیں۔

”کب سے انتظار کر رہی ہوں اتنی دیر لگا دی۔“ علیہ نے معصوم سا شکوہ کیا۔
 ”کھانا کھا رہا تھا، کھانا کھاتے ہی سیدھا تیرے پاس آ گیا۔ مجھے پتا تھا میری رانی میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔“ عاشق بے باک نگاہوں سے نکلتے ہوئے بولا۔ علیہ خود میں ہنست کر رہ گئی۔

”میرے پاس آ دوں کیوں کھڑی ہے۔“ استحقاق سے بھرپور لہجہ تھا۔ بنا کسی جھجک کے اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ کاشن کے میروں اور واٹ سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ہارک ٹیفون کا ڈائی ہوا دو پٹہ شانوں پر پھیلا ہوا تھا۔ پشت پر بکھرے بال عاشق کو مزید گستاخی پر اکسار ہے تھے۔

”تیرے لیے لایا تھا۔“ جیب میں سے پان اور چاکلیٹس نکال کر علیہ کو دیتے ہوئے بولا۔ اس نے لینے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو عاشق نے مزید خود سے قریب کر لیا۔ اتنا قریب کہ کوئی فاصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ علیہ کی سانسوں میں کھلنے لگی تھیں۔ اس کی کمر کے گرد بازو جمائل کیے عالم مدہوشی میں اس کے چہرے سے چہرہ لگائے کھڑا تھا۔ علیہ کی کمر پر بیگناہ عاشق کا ہاتھ احساسات کی دنیا میں پھل برپا کر رہا تھا۔ جذبے منہ زور ہوتے معلوم ہو رہے تھے۔ علیہ مدہوشی

میں بہکنے لگی تھی۔ عاشق کا قرب اسے پاگل کیے دے رہا تھا۔ دونوں نہ جانے کب تک اسی طرح ایک دوسرے میں الجھے رہتے، نیچے سے آئی دادی ماں کی ٹھیف آواز پر علیہ چونکی جھٹ عاشق سے جدا ہو گئی۔ شانے سے پھسلتا دوپٹہ سر پر ہنہ سر پر جمالیا۔

”آئی دادی ماں!“ بے ترتیب سانسوں کو ہموار کرتے ہوئے دقت سے بولی۔ عاشق کی گستاخ نگاہیں ابھی بھی اس کے دلکش ہنرے سے الجھی تھیں۔
 ”میں جارہی ہوں دادی ماں بلا رہی ہیں۔“ دھیمے لہجے میں بولی۔

”کتنا سرور آ رہا تھا تمہاری بانہوں میں، جی چاہتا ہے ساری عمر تمہاری بانہوں میں ہی گزر جائے۔“ علیہ مسکراتے ہوئے جانے کو پلٹی اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی گھنیری پلکوں میں جنہش ہوئی۔
 ”حانے دو عاشق!“ منت بھرے لہجے میں بولی۔ ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد ہوا تو دوڑتی ہوئی نیچے آئی سیرھیوں کے عین وسط میں دادی ماں کھڑی تھیں۔

”کتنی بار تجھے کہا ہے علیہ ارات میں چھت پر مت جایا کر پر تیری سمجھ میں نہیں آتا، خدا نخواستہ کہیں کوئی آسیب تجھے لگ گیا تو.....“ دادی ماں زیر لب آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کرنے لگیں۔ اس بات سے بے خبر کہ آسیب تو بہت پہلے ہی پیچھے لگ چکا تھا۔
 ”پھولوں کی طرح تجھے پالا ہے، کیسے کانٹوں کے حوالے کر دوں؟ یہ محبت نہیں ہے، علیہ! لالچ ہے اس گھر کا خواب اسے تجھے اپنانے پر اکسار ہا ہے تو سمجھ کیوں نہیں رہی میری بچی، محبت کے نام پر وہ بد بخت تجھے فریب دے رہا ہے تیرے فونیز معصوم جذبوں سے کھیل رہا ہے چھل کر رہا ہے وہ، میں نے تو تجھے دھوپ میں پاؤں بھی نہ رکھنے دیا اور تو ہے کہ تپتے آسمان اور بھلتی زمین پر رول جانا چاہتی ہے۔ مجھے دکھ مت دے علیہ یہ عمر دکھ سہنے کی تو نہیں ہے۔“
 دادی ماں گلو گیر لہجے میں بولیں۔

آنکھیں شدتِ غم سے بھیگی ہوئی تھیں۔ علیہ کے معصوم چہرے پر چٹانوں کی ہی سختی تھی آنکھیں کھلے عام بغاوت کا نعرہ لگا رہی تھیں۔ دادی ماں کا دل دال گیا۔

”علیہ! پرانے درخت اور بزرگ دونوں ہی اپنے وجود سے فائدہ دیتے ہیں، بھلا میں تیرا برا چاہ سکتی ہوں۔ تیری خوشی سے عزیز مجھے کوئی دوسری شے نہیں ہے۔ مگر تو آگ میں کودنا چاہتی ہے تو کیا میں تجھے کود جانے دوں، ارے بچے تو ہوتے ہی نادان ہیں۔ خاص کر لڑکیاں، نادانی میں نہ جانے کیا کچھ کھو پھینکتی ہیں۔ پھر پچھتاوا حیاتِ ناسور کی صورت دھڑکنوں میں پلتا ہے۔ ہر سانس میں کرب اٹھیلتا ہے۔ تیری وفا کی بہت قدر ہے میرے دل میں علیہ پر وہ محبت برباد ہو جاتی ہے جو غلط شخص کو سوئپ دی ہے جائے۔ تو سمجھ کیوں نہیں رہی۔“

”دادی ماں اچھا ہو تو میری جان لے لو پر میں شادی عائق سے ہی کروں گی۔ مرجاؤں گی میں اس کے بغیر بہت چاہتی ہوں میں اسے دادی کیسے سمجھاؤں آپ کو۔“ علیہ نے سی سے بے بس ہو کر رو پڑی تھی۔

دو دن سے مسلسل بھوک ہڑتال کر رہی تھی دادی کی تمام نصیحتیں قدموں تلے روند ڈالی تھیں۔ اس پر تو قضا محبت کا بھوت سوار تھا۔ دادی ماں جانتی تھیں محبت کا تعلق عقل کے بجائے جذبات سے زیادہ ہوتا ہے۔ شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے علیہ کے پاس آ بیٹھیں۔ انتہائی کرب سہتے ہوئے شکست تسلیم کر لی۔

☆.....☆

ہردن عید اور ہر رات شبِ برأت تھی۔ علیہ عائق کا ساتھ پا کر کھل اُٹھی لیکن پھر بہت جلد علیہ کی آنکھوں پر بندھی محبت نام کی پٹی اتر چکی تھی۔ دادی ماں کی تمام باتیں سچ کا لبادہ اوڑھے علیہ کے روبرو آکھڑی ہوئیں اس کی نام نہاد محبت پر خوب تہقہ لگائے علیہ دنگ رہ گئی تھی۔ عائق کے بدلتے رویے سے بدلتی زبان سے جو کلمہ تک اسے جی جان سے

چاہتا تھا آج وہ ہی اس کی ٹھوکروں کی زد پر تھی۔ ایسے جذبات سر د پڑے تو دل دماغ کی دلہیز پر جا کر رویا۔ وقت کا کام گزرتا ہے۔ سو گزرتا گیا۔ وہ ننھے صحن میں پسینے میں شرابور ہوئے چٹنی پیس رہی تھی۔ سارا وجود پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ ننگے پیر پتی زمین پر ایسے پٹھنی تھی جیسے کوئی ملکہ اپنے تخت پر، شاید وہ عادی ہو گئی تھی۔ آج ٹھیک دو دن بعد اسے روٹی نصیب ہوئی تھی۔ وہ بھی چٹنی کے ساتھ۔ عائق کی پول پوری طرح کھل چکی تھی۔ آج کل وہ نئی لڑکی کے عشق میں گرفتار تھا۔ دن برے دوستوں کی صحبت میں برباد کرتا تو راتیں چھت پر علیہ ہر رات کی لکڑی کی پائند سہکتی تھی۔ دادی ماں بہت شدت سے یاد آیا کرتی تھیں۔ پر وہ وہاں جا چکی تھیں۔ جہاں سے لوٹ کر نہیں آیا جاتا، اکثر عائق گھر سے غائب رہنے لگا۔ ہفتہ گزر جاتا تو بھی لوٹ کر نہیں آتا۔ علیہ نے جو بویا تھا وہ ہی کاٹ رہی تھی۔ پتی زمین بلکتے دو معصوم بچے بری طرح رو رہے تھے۔ دو بچے علیہ کی محبت کی نشانی تھے۔ پروردگار نے اسے جڑواں بیٹوں سے نوازا تھا۔ بھوک کی شدت ان معصوموں کو رونے پر مجبور کر رہی تھی۔ علیہ دیوانہ وار بھاگتے ہوئے بچوں کی سمت آئی بچے ناں کا کس پاتے ہی مزید بلک اٹھے۔ علیہ دونوں کو سینے سے لگائے بلک اُٹھی تھی، بچوں کا رونا اسے کند چھری سے ذبح کر رہا تھا۔ ناقابل برداشت دکھ وہ اپنی رگوں میں دوڑتا محسوس کر رہی تھی۔ محبت کے نام پر ملنے والا ہر گھاؤ علیہ نے سہہ لیا تھا۔ پر مہتا پر پڑنے والے زخم اسے لہو لہان کر رہے تھے۔ گہری اذیت سے دوچار کر رہے تھے۔ علیہ نے محبت کی، انجام پایا پر ساتھ دو معصوم جانیں بھی ریل گئی تھیں۔ علیہ نے نہیں پڑھا تھا پر ایمان اب لائی تھی۔

کیونکر بسر ہو سکتی تھی حیاتِ آسودگی سے معمولی تو نہیں محبت جرم تھا میرا

☆.....☆

رواڈ انجسٹ [133] فروری 2016ء

READING
Section

میں ڈوبی گرج دار آواز پر بری طرح چونک کر لرز گئی۔
 ”تم..... کون ہو تم؟“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا
 ہوا اور وہ اس اچانک پیش آنے والی صورت حال پر
 بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی۔

”مم..... میں ہوں۔“ وہ بمشکل بول پائی۔ اپنے
 سامنے ایک اجنبی لڑکی کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر
 ریان کا پارہ سا توں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

”بولو اب بولتی کیوں نہیں ہو کون ہو تم اور یہاں
 اس صلیبے میں میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟“ وہ
 دھاڑا تو وہ مزید سہم کر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

”میں..... عن..... عنابیہ ہوں۔“ وہ انک انک کر بولی۔
 ”شبث اپ..... تم عنابیہ نہیں ہو۔ میں تمہیں جانتا

رات کے ڈھائی بجے وہ دل میں ڈھیروں ارمان
 لیے سرخ گلابوں سے سجے خوشبوؤں سے مہکتے
 کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے شاہانہ انداز سے
 براجمان اپنی نئی نویلی دلہن کو محو انتظار پا کر اس کے لبوں
 پر رقصاں مسکان مزید گہری ہو گئی۔ اس لمحے قدموں
 کی چاپ پر دلہن کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ اب
 اس کے پہلو میں آن بیٹھا تھا۔

”آداب بیگم صاحبہ!“ اس نے خوش دلی سے گفتگو
 کا آغاز کیا تو جواب بھی اسی کے انداز میں آیا۔

”تسلیمات!“ اس نے مسکرا کر اس کا نرم دنازک
 حنائی ہاتھ تھام لیا تو گھونگھٹ میں جھکا سر لاج سے
 مزید جھک گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چمکی سرخ

پاک سوسائٹی

بھی نہیں ہوں۔ تم جو کوئی بھی ہو بہت گھٹیا مذاق کر رہی
 ہو۔“ ریان کا مارے غصے کے برا حال ہو رہا تھا اور وہ
 خوف سے تھرتھر کانپ رہی تھی۔

”میں..... میں مذاق نہیں کر رہی۔ خدا را میرا یقین
 کیجیے میں ہی عنابیہ ہوں۔ آپ کی بیوی عنابیہ ریان۔“

”بکواس بند کرو۔ ابھی اور اسی وقت میرے کمرے
 سے نکلو۔“ ریان کی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا اس نے اس

کی کلائی تھامی اور اسے کمرے کے دروازے کی جانب
 گھسیٹا اور کمرے سے باہر دھکا دیا اور دروازہ اندر سے

لاک کر لیا۔ دھکے کے باعث وہ دور جا گری تھی۔ اس کی
 ساری چیڑیاں ٹوٹ کر کلائی میں پیوست ہو کر کلائی کو زخمی

کر گئیں تھیں وہ ہمت کر کے اٹھی اور اپنا بھاری بھر کم لہنگا
 سنبھالتے ہوئے دروازے تک آئی اور روتے پلکتے

دروازہ پیٹتے ہوئے کہنے لگی۔

ڈبیا نکالی اور اس میں سے گولڈ کے دیدہ زیب کنگن
 نکال کر اسے پہنا دیئے۔

”یہ آپ اپنی منہ دکھائی قبول کیجیے۔“ اس نے کہا۔
 ”مگر آپ نے تو مجھے ابھی دیکھا ہی نہیں۔“ وہ

گھونگھٹ کی ادٹ سے حیرت زدہ ہو کر معصومیت
 سے بولی تو اس کا لے ساختہ قہقہہ اس کی سماعتوں سے

نکل آیا تو وہ جھینپ سی گئی۔
 ”جان ریان! آپ کو دل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔“

میرے لیے یہی کافی ہے خیر کیسے لگے کنگن؟“ وہ اس
 کی کلائی تھام کر کنگن کو گھما کر مخمور لہجے میں بولا۔

”بہت اچھے۔“ وہ دھیرے سے کہتی ہوئی شرمناک
 مسکرا دی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا گھونگھٹ اٹھایا

وہ کرنٹ کھا کر ساکت و جامد رہ گیا۔ وہ جو اپنے
 سزا سے جانے کی منتظر تھی۔ ریان کی حیرت کے سمندر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

Downloaded From
Paksociety.com



”پلیز ریان! دروازہ کھول دیں، میرا یقین کریں میں ہی عنابیہ ہوں۔ خدارا میری بات سنیں۔ میرا نہیں تو گھر والوں کا ہی خیال کریں، وہ سب کیا سوچیں گے۔ خدا کے لیے آج کی رات کمرے میں پناہ دے دیں۔ دروازہ کھول دیں ریان پلیز ریان۔“

وہ بے تحاشا روتے ہوئے پاگلوں کی طرح اس سٹمگر سے فریاد کر رہی تھی مگر وہ سن ہی کب رہا تھا اس کے چاروں طرف تو صرف ایک ہی لفظ کی بازگشت تھی۔

”دھوکا..... ریان سے دھوکا۔“

☆.....☆

داوی جان تہجد کی نماز ادا کرنے کے لیے اٹھیں تو ان کا گزر ریان کے کمرے کے سامنے سے ہوا تو وہ سامنے کا منظر دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو ساکت رہ گئیں۔ سامنے فرش پر ان کی لاڈلی پوتی عنابیہ بے ہوش پڑی تھی۔ ان کے قدموں تلے زمین نہ رہی انہیں اپنی نظر پر یقین نہ آیا وہ دوڑ کر عنابیہ کے قریب آئیں، داوی جان نے سب گھر والوں کو شور مچا کر اکٹھا کر لیا تھا سب ہی لوگ آنکھیں ملتے ہوئے عنابیہ تک پہنچ گئے تھے۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ عنابیہ کو پانی کے چھینٹوں سے ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی مگر رائیگاں گئی۔ عنابیہ کو اس کی چچا زاد بہن عنبر اپنے بھائی احمد کی مدد سے اس کے کمرے تک لے گئی۔ پھر سب کو ریان کا خیال آیا، وہ ہی بتا سکتا تھا اس معاملے کی وجوہات مگر جب اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی گئی تو وہ بنا کچھ کہے سنے گھر سے نکل گیا اس کے تیور بتا رہے تھے کہ معاملہ سنگین ہے۔ مہمانوں سے بھرا گھر، شام کو ویسے کی تقریب، بخار میں تڑپتی بے ہوش دلہن اور دلہا غائب، ایسے حالات میں مارے پریشانی کے سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ریان سے رابطے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ فی الحال اس کی کہیں کوئی خبر نہیں تھی۔ ریان کو اپنی شادی کے سلسلے میں پاکستان آئے

ہوئے ابھی چند روز ہی تو ہوئے تھے۔ اس کی یہاں کسی سے کوئی جان پہچان بھی نہ تھی جہاں سے اس کی خیریت کی کوئی اطلاع مل سکتی، رات سے صبح اور صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔ داوی جان عنابیہ کے سر ہانے بیٹھی قرآنی آیات کا درود کر رہی تھیں۔ داوی کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔ عنابیہ کو ہوش آ گیا تھا۔ ایک ہی رات میں وہ گلاب کی کٹی مرچھا کر زرد پڑ گئی تھی۔

”شکر ہے میرے مالک۔“ شکر سے داوی جان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

”میری گریا کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ وقار حسن اپنی اکلوتی بیٹی کے بال سہلاتے ہوئے پوچھ رہے تھے اور وہ ان کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے نقاہت سے بولی۔

”بابا جان! داوی اماں آپ مجھے بتائیں۔“ وہ بشکل بول پارہی تھی۔

”جی داوی کی جان بولو کیا بات ہے؟“ داوی نے پیار سے کہا۔ عنابیہ کے ہوش میں آنے کا سن کر گھر کے باقی لوگ بھی کمرے میں آگئے تھے سوائے اس کے تایا ابرار حسن کے وجہ شرمندگی تھی جو انہیں اپنے بیٹے ریان کی وجہ سے اٹھانی پڑ رہی تھی۔

”داوی اماں! میں..... میں عنابیہ ہوں ناں۔“ عنابیہ کی یقین دہے یعنی کی کیفیت میں درود میں ڈوبی بھگی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آئی تھی۔ سامعین کو اس کی دماغی حالت پر شبہ گزرا وہ سب یہی سمجھے صدے کی وجہ سے ایسا بول رہی ہے مگر صدمہ کس بات کا ہے وہ ابھی تک اس بات سے انجان تھے۔ ڈاکٹر نے بھی منع کیا تھا کہ ابھی فی الحال عنابیہ سے ایسی ویسی کوئی بات نہ کی جائے۔

”ہاں میری چندا تم میری پیاری ہی شہزادی عنابیہ ہو۔ اچھا اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے آرام کرو۔“ داوی جان نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تو دو آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر ٹہکیے بھگو گئے۔

”عنابیہ! یہ سب کیا ہو گیا؟“ عنبر نے نرمی سے

اس کا ہاتھ تھام کر فکر مندی سے کہا تو عنابیہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور ایک کبر آلود نگاہ عزیز اور احمر پر ڈال کر رخ پھیر لیا۔

”دادی اماں! ان سے کہہ دیں یہ دونوں یہاں سے چلے جائیں میں ان کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“ عنابیہ نے کہا اور وہاں موجود تمام افراد کو حیرت نے گھیر لیا۔

”عنابیہ! ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ عنابیہ بیٹا کیا ہوا ہے؟“ وقار حسن اس سے استفسار کر رہے تھے اور عزیز اور احمر کا رنگ فق ہو رہا تھا چچا چچی بھی بے چین ہوئے تھے۔

”بابا جانی! میرے ساتھ جو بھی ہوا ہے ان دونوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان کے ایک مذاق نے میری زندگی کو مذاق بنا دیا ہے۔ تماشا بن گئی ہوں سب کے سامنے کہیں کا نہیں چھوڑا انہوں نے مجھے میری ساری خوشیاں چھین لیں۔ میں کبھی معاف نہیں کروں گی انہیں۔ کبھی بھی نہیں۔“ عنابیہ بولتے بولتے بے حال ہو کر زار و قطار رونے لگی تھی۔ دادی سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ عزیز اور احمر کو تو سانپ سوکھ گیا تھا۔



حسن ہاؤس کی سربراہ بیگم عذرا حسن جب شدید علیل ہوئیں تو ان کو اپنے بڑے صاحبزادے ابرار حسن کی پادشہت سے ستانے لگی۔ ابرار حسن کا داخلہ وہ بیس بائیس برس قبل حسن ہاؤس بند کر چکی تھیں کیونکہ جب عذرا بیگم نے اپنے سر تاج حسن احمد کی وفات کے بعد ابرار حسن کو اعلیٰٰ تقسیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ بھیجا تو انہوں نے وہاں اپنی پسند کی لڑکی سے بیاہ رہ چا لیا جب کہ ابرار حسن کی نسبت اپنی خالہ زاد ستارہ سے ملے تھی۔ عذرا بیگم اس قدر ابرار حسن سے ناراض ہوئیں کہ دوبارہ کبھی بھی ان کی شکل نہ دیکھنے کی قسم کھالی۔ ان کے چھوٹے بیٹوں وقار حسن اور حماد حسن نے ماں کو بہت سمجھایا مگر انہوں نے کسی کی نہ سنی۔ بہن اور بھانجی کی محبت کے سامنے انہیں

کچھ دکھائی نہ دیا تب ہی انہوں نے اپنی بھانجی ستارہ کی شادی اپنے پچھلے بیٹے وقار حسن سے کر دی مگر عذرا بیگم کو اپنی لاڈلی بہو ستارہ کا ساتھ زیادہ عرصہ نصیب نہ ہوا ستارہ اپنی بچی کو جنم دیتے ہوئے چل بسیں تھیں پھر عذرا بیگم نے ہی اس بچی کی پرورش کی جس کا نام وقار حسن نے عنابیہ رکھا تھا۔ وقار حسن نے دوسری شادی نہ کی انہوں نے اپنی زندگی اپنی بیٹی عنابیہ کے نام کر دی تھی۔ کچھ عرصے بعد حماد حسن کی بھی شادی ہو گئی سارہ بہت اچھی بہو ثابت ہوئی تھی خدا نے انہیں دو پھولوں سے نوازا تھا احمر اور عزیز کی صورت میں حسن ہاؤس کے مکین اپنی اپنی زندگیوں میں لگن تھے بظاہر تو سب ٹھیک تھا مگر ابرار حسن کی یاد عذرا بیگم کو اندر ہی اندر دکھائے جائے رہی تھی جو بھی تھا آخر وہ تھیں تو ماں، عمر کے آخری حصے میں آ کر وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں انہیں اپنی غلطی کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ ادھر ابرار حسن بھی بڑھتے تھے گھر والوں سے ملنے کے لیے ان کا اپنے بھائیوں سے فون پر رابطہ رہتا تھا مگر ماں کے ڈر سے کبھی پاکستان نہ آئے اب جب ماں کی طبیعت کا سنا تو ان سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے وقار حسن سے کہہ کر ماں سے واپس آنے کی اجازت مانگی تو عذرا بیگم مان گئیں۔ ابرار حسن پاکستان آ گئے تھے حسن ہاؤس کے باسیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ابرار اکیلے ہی آئے تھے کیونکہ ان کی شریک حیات چند برس قبل ہی ان کو داغ مفارقت دے گئی تھیں اور ان کا اکلوتا بیٹا ریان ان دنوں امتحانات میں مصروف تھا اس لیے وہ ابرار حسن کے ساتھ نہ آ سکا۔ برسوں بعد حسن ہاؤس میں بہار آ گئی تھی۔ ہر چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا، چھڑے ہوئے اپنوں کے گلن کا منظر ہر آنکھ کو خوشی سے نم کر رہا تھا۔ ابرار حسن کا اپنی بھابی اور بیٹی بھتیجیوں سے تعارف کروایا گیا۔ انہوں نے عنابیہ کو تو پہلی ہی نظر میں اپنے بیٹے ریان کے لیے پسند کر لیا تھا۔ انہیں حماد حسن کے شرارتی سے ہنس کھ

بچے احمر اور عنبر بھی بہت اچھے لگے تھے۔ عنابیہ، عنبر اور احمر بھی اپنے پر وقار سے تایا جان سے مل کر بہت خوش تھے اور اپنے کزن ریان سے ملنے کو بے تاب تھے۔ ابرار حسن نے ریان کی بات اسکاٹپ پر ان سے کروا دی تھی تمام گھر والوں نے ریان سے بات کی سوائے عنابیہ کے کیونکہ ایک تو وہ قدیرے کم گوشر میلی سی لڑکی تھی اور دوسرا یہ کہ وہ جان گئی تھی کہ ابرار تایا جان نے اس کا ہاتھ اس کے بابا جان سے ریان کے لیے مانگ لیا ہے اور بابا نے ہاں بھی کر دی ہے۔ شادی چند ماہ بعد متوقع تھی۔ ریان کی احمر اور عنبر سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ عنبر تو ریان کو چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہو گئی ریان اکثر عنبر سے عنابیہ کے بارے میں پوچھتا تو عنبر نے اسے عنابیہ کا نمبر دے کر کہا خود بات کر لیا کرے۔ پہلے تو عنابیہ ریان سے بات کرنے سے ہچکچاتی مگر پھر وہ دونوں اکثر بات کرنے لگے ریان کی باتیں عنابیہ کے دل میں اترنے لگیں۔ یوں عنابیہ نے ریان کو اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھا کر ڈھیروں خواب آنکھوں میں سجالیے تھے مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ جن پسندوں کی وہ پرستش کر رہی ہے وہ ایک دن یوں ٹوٹ کر بھریں گے کہ اس کی روح تک کو گھائل کر جائیں گے۔

☆.....☆

”ریان! مجھے تم سے ایسی گھٹیا حرکت کی امید ہرگز نہیں تھی۔“ ابرار حسن غم و غصے سے چلا رہے تھے اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھاس رہا تھا۔

”تم نے مجھے اماں جان اور وقار سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا، تمہیں کچھ اندازا بھی ہے کہ کس قدر ذلت و شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہمیں ویسے کی تقریب ملتوی کرتے ہوئے لوگوں کی طرح طرح کی باتیں اور اس معصوم پر لوگوں کی ہمتیں دل چیر کے رکھ گئیں مگر تمہیں کہاں احساس۔ تم نے تو شادی کو کسی کھیل یا مذاق سے زیادہ نہیں جانا۔“

”ڈیڈی! مذاق تو میرے ساتھ ہوا ہے۔ آپ

میری بات تو سنیں۔“ ریان نے ہمت کر کے لب کشائی کی تو انہوں نے اسے ٹوک دیا۔

”اب سننے کو رہا ہی کیا ہے، ریان! تمہیں اگر عنابیہ پسند نہیں تھی تو پہلے بتایا ہوتا۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ کسی معصوم کی زندگی تباہ کرو اس کی تذلیل کرو؟“ ابرار حسن نے تاسف سے کہا تو ریان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”پلیز ڈیڈی! بس کرو بس۔“ وہ چلا اٹھا اور پھر اپنی گستاخی محسوس کر کے قدرے نرمی سے گویا ہوا۔

”ڈیڈی! آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے عنابیہ کو بنا دیکھے ہی پسند کر لیا تھا۔ کیونکہ مجھے آپ کے انتخاب پر بھروسہ تھا اور ویسے بھی ڈیڈی بات پسند و ناپسند کی نہیں ہے۔ بات سچ اور جھوٹ کی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ مجھے جھوٹ سے کس قدر نفرت ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر جھوٹ ہرگز نہیں میرے جذبات و احساسات کا خون کیا گیا ہے۔ مجھ سے جھوٹ بولا گیا ہے ڈیڈی جھوٹ۔“ وہ کرب سے بولا۔

”کیسا جھوٹ ریان؟“ ابرار حسن حیران ہوئے تو وہ کہنے لگا۔

”وہ لڑکی جس سے میں فون پر بات کرتا تھا جسے میں چاہنے لگا تھا جس سے آپ نے میرا رشتہ طے کیا تھا وہ یہ ہے ہی نہیں جس سے میرا نکاح ہوا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ابرار حسن نہ سمجھے تو وہ بولا۔

”وہ عنابیہ نہیں ہے۔“

”وہ عنابیہ ہی ہے ریان بیٹا۔“ حماد چچا کی آواز کرے میں گونجی تو ابرار حسن اور ریان نے ان کی جانب چونک کر دیکھا۔ ندامت کے رنگ حماد حسن کے چہرے پر نمایاں تھے۔ ان کے ہمراہ ساڑھ چچی اور عنبر، احمر بھی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”آخر یہ معاملہ کیا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں

آ رہا۔ ابرار حسن نے سر تھام لیا تھا اور ریاں بھی بری طرح الجھ گیا تھا۔

”بھائی صاحب! میں سخت شرمندہ ہوں یہ سب کیا دھرا میری نالائق اولاد کا ہے۔“ حماد حسن نے ایک قہر آلود نگاہ احمر اور عنبر پر ڈالی جو پہلے ہی ان کی زبردست ڈانٹ کھا کر آئے تھے اور اپنی مزید عزت افزائی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔

”کم بختو! اب بتاؤ بھی ساری بات اپنے تایاجی اور ریاں کو اور ان سے معافی بھی مانگو۔“ ساڑھ چھٹی نے سر جھکائے بیٹھے ان دونوں سے کہا تو انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور نگاہوں ہی نگاہوں میں یہ طے کیا کہ کون اپنے کروت بیان کرے گا۔ سو عنبر نے ہی ہمت کر کے لب کشائی کی اور کہا۔

”تایا جان! پلیز ہمیں معاف کر دیں اور ریاں بھیا سے بھی خفا نہ ہوں کیونکہ جو ہوا اس میں ریاں بھیا یا عنابہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ دراصل بات یوں ہے کہ ایک دن میری بس اپ پڑ ریاں بھیا سے بات ہو رہی تھی کہ باتوں ہی باتوں میں ذکر عنابہ کا چل نکلا اور ریاں بھیا نے عنابہ کو دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔

اس وقت احمر میرے پاس ہی بیٹھا تھا میں نے اسے بتایا تو وہ اور میں بہت حیران ہوئے کہ ریاں بھیا نے ابھی تک عنابہ کو نہیں دیکھا۔ جب کہ ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔ ایک ماہ بعد شادی ہے اور

ریاں بھیا ابھی تک اپنی ہوسنے والی شریک حیات کے دیدار سے محروم ہیں۔ ایسے میں احمر کو شرارت سوچھی اس نے کہا کہ ریاں بھیا کو کسی کالی کلونی سی لڑکی کی تصویر بھیج دو دیکھتے ہیں کہ بھیا کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ ریاں بھیا تصور دیکھتے ہی شادی سے انکار کر دیں گے اور پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ یہ عنابہ نہیں ہے ہم نے آپ کو مایوں بنایا ہے مگر حیرت انگیز طور پر ہم نے جو تصویر بھیجی تھی اپنی کام والی ماسی کی بیٹی فریدہ کی وہ تصویر ریاں بھیا کو پسند آگئی تھی ہم سخت

حیران ہوئے کہ امریکہ میں پلا بڑھا ہینڈ سٹم لڑکا ایک عام سی شکل و صورت کی سانولی سی لڑکی سے شادی کرنے کی حامی کیسے بھر سکتا ہے۔ میں نے اپنے ان خیالات کا اظہار ریاں بھیا سے بھی کر دیا تو انہوں نے کہا کہ ”میرے نزدیک خوبصورتی کی نہیں خوب سیرتی کی اہمیت ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے پاپا کی خوشی کی“ ہمارے دل میں بھیا کی یہ بات اتر گئی پھر ہم نے سوچا کہ جب بھیا پاکستان آئیں گے تو ان کو بتائیں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ مذاق کیا ہے اور ان کو دکھائیں گے کہ ان کی ہمسفر کتنی حسین ہے۔ ہم نے یہ سب عنابہ کو بتایا تو وہ ہم سے سخت خفا ہوئی اور کہنے لگی یہ سب غلط ہے۔

میں ابھی ریاں کو بتا دیتی ہوں

کہ وہ تصویر میری نہیں ملازمہ فریدہ کی ہے مگر ہم نے عنابہ کو قسم دے دی کہ تم ریاں بھیا سے کچھ نہیں کہو گی چپ رہو گی۔ ہم نے عنابہ کو منا لیا تھا کہ یہ بس ایک چھوٹا سا مذاق ہے، جو صرف چند دن ہی جاری رہے گا کیونکہ ریاں بھیا کی آمد جلد ہی متوقع تھی ہم نے عنابہ کو پورا یقین دلایا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ مگر وہ نہ ہوا جو

ہم نے سوچا تھا ریاں بھیا کو پاکستان آنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ شادی سے صرف چند روز قبل ہی آئے تھے اور تب تک عنابہ کو مایوں بھی بٹھا دیا گیا تھا، دادی اماں نے ان دونوں کی ملاقات پر پابندی لگا دی تھی کہ

اب یہ ایک دوسرے سے شادی کے بعد ہی ملاقات کریں گے اور شادی کے ہنگاموں میں ہم دونوں یہ بات بالکل ہی بھول گئے تھے کہ ریاں بھیا کو ہم نے کچھ بتانا ہے۔ ہمارا چھوٹا سا مذاق اتنا بڑا طوفان لائے گا، ہمیں بالکل خبر نہیں تھی۔ یقین کیجیے ہم نے یہ سب

نہیں چاہا تھا۔ ریاں بھیا پلیز آپ عنابہ سے خفا نہ ہوں۔ اس بے چاری کا دوش نہیں وہ تو آپ کو بہت چاہتی ہے۔ آپ دونوں نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر لیں اور پلیز ہمیں معاف کر دیں۔“

”تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو تمہیں غم کی قسم اس دل کی ویرانی مجھے دے دو میں دیکھوں تو سہمی یہ دنیا تمہیں کیسے ستاتی ہے کوئی دن کے لیے اپنی تمہیانی مجھے دے دو“ نیم تاریک کمرے میں اس کا من پسند گیت گونج رہا تھا اور وہ آنکھیں موندھے پیشی سوچوں میں گم ریان کے دیئے ہوئے نکلن سے کھیل رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کمرہ روشن ہو گیا۔ عنابہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کے ہاتھ سے نکلن چھوٹ کر گرتا ہوا کمرے میں داخل ہوتے ریان کے قدموں میں جا گرا تو اس نے نیچے جھک کر نکلن اٹھالیا۔ مکان اس کے لیوں پر رقص کر رہی تھی عنابہ نے اس سے نظریں چرا لیں اور جلدی سے آڈیو پلیئر بند کر دیا۔

”میں یہ نکلن تو نہیں لینے آیا جو آپ نے آتے ہی میرے قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔“ ریان نے مسکرا کر نکلن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا یہاں اور ہے بھی کیا نکلن کے سوا۔“ وہ جل کر بولی تو ریان کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

”نکلن والی تو ہے ناں۔“ وہ شوخ لہجے میں کہتا ہوا اس کے قریب ہوا تو وہ ”ہونہہ“ کرتے ہوئے اس سے دور کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ کھڑکی کے باہر کا منظر اسے خوشگوار حیرت و مسرت میں مبتلا کر گیا۔ حسن ہاؤس کے تمام مکین شام کی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

زندگی کا حسن رشتوں سے ہے اگر رشتے غلط نہیں کی نذر ہو کر کمزور پڑ جائیں تو زندگی کی چمک و مک ماند پڑ جاتی ہے۔ اس بات کا اندازہ حسن ہاؤس کے مکینوں کو خوب ہوا تھا اور اب باہر کا منظر اسے باور کروا رہا تھا کہ غلط فہمیوں کی گرو چھٹ چکی ہے اور زندگی ایک بار پھر حسن ہاؤس میں مسکرائی ہے۔ اتنے دنوں کے بعد سنٹ کو ایک ساتھ خوش دیکھ کر عنابہ کو دلی خوشی ہوئی

تھی۔ وہ اپنا دکھ بھول گئی تھی۔

”آہم..... میری نکلن والی کیا سوچ رہی ہو؟“ ریان نے کہا وہ چونک کر پہلی وہ آنکھوں میں ڈھیروں جھکتیں سمونے کھڑا اسی کی جانب مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی نکلن والی فریڈہ ہے۔ اس رات بھی آپ نے مجھے فریڈہ سمجھ کر نکلن پہنائے تھے۔ اب بھی جائیں آپ اسی کے پاس اسی کو پہنائیں نکلن۔“ وہ نزدکھے لہجے میں بولی۔ وہ جانتی تھی کہ جو ہوا اس میں قصور ریان کا نہیں تھا مگر پھر بھی وہ اس سے خفا تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اسے منائے اور وہ منا رہا تھا۔

”پلیز عنابہ! ایسا مت کہو جو بھی ہو وہ غلط نہیں کی بنیاد پر ہوا۔ میں اس رات اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ پایا اور تمہارے ساتھ بہت غلط کیا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف سہنا پڑی میں سخت نادم ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔“ ریان کے معافی مانگنے پر وہ کھل گئی۔

”ریان! آپ معافی مت مانگیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔“ عنابہ نے کہا تو اس کے دل سے بوجھ اتر گیا۔

”عنابہ! زندگی کے وہ حسین لمحات جس کا خواب ہر کسی کی آنکھوں میں بسا ہوتا ہے۔ وہ خواب ہر مندہ تعبیر ہوا بھی تو میری بے خبری و غلط فہمی کی نذر ہو کر اپنا حسن کھو بیٹھا۔ میں وہ لمحات واپس تو نہیں لاسکتا مگر اپنی پوری کوشش سے تمہاری زندگی کے آئے والے لمحات کو اس قدر دلکش بنا دوں گا کہ تم ان بچے ہوئے لمحات کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دو گی اگر تم میرا ساتھ دو تو۔“

ریان کے لہجے کی صداقت پر عنابہ کا دل ایمان لے آیا تھا۔

”عنابہ! تم میرا ساتھ دو گی ناں۔“

ریان نے ہاتھ میں پکڑا نکلن اس کی جانب بڑھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے استفسار کیا تو اس نے نگاہیں جھکا کر اپنا ہاتھ ریان کی جانب بڑھا کر اثبات میں سر ہلا دیا اور ریان نے مسکرا کر عنابہ کو نکلن پہنا دیا۔ خوشی و سکون کی ایک لہر ان دونوں کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ ☆☆

غول بے زولہ زو

کھول دیا تھا۔ آہٹ بتا رہی تھی احمد آچکا تھا۔ گھر کے اندر ماں اور آبا جان ایک کتے کے عالم میں بیٹھی تھیں۔

شام کا پہرہ تھا۔ سامنے والی اونچی دیوار سے سورج اس پار اتر گیا۔ بھی ہارن کی آواز پر گاڑنے بڑا سا گیٹ

Downloaded From
Paksociety.com

READIN
bits & bytes

اور آمنہ تو اتنی اچھی ہے اسے پھر کوئی مل جائے گا۔
 ”ہاں ذرختوں پر رشتے لٹک رہے ہیں ہاں جب
 چاہو جسے چاہو توڑ لاؤ۔“
 ”چلیں چھوڑیں امی! آپ خالہ کے پاس گئیں؟
 چلیں انٹھیں میں آپ کو لے کر چلتا ہوں۔“ احمد بول
 رہا تھا۔

مغرب کا پہر تھا جب احمد اپنی ماں اور بہن کو لے کر
 خالہ کے گھر گیا تھا۔ خالہ، احمد کو دیکھ کر آبدیدہ تو ہوئیں
 لیکن انہوں نے منہ پھیر لیا اگر احمد راضی ہوتا اور شادی
 آمنہ سے کر لیتا تو آج یہ دن دیکھنے کو نہیں ملتا۔

”کیا ہوا امی! خیریت؟“ احمد نہیں دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔
 ”نہیں خیریت نہیں آمنہ کو طلاق ہو گئی ہے۔“
 ”کیوں امی کیوں؟“ وہ بھی گھبرا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”بس وہی کہ پانچ سال ہو گئے کہ کوئی بچہ نہیں ہوا۔“
 اچانک احمد کے دل میں آمنہ کے لیے ہمدردی سی
 پیدا ہوئی۔

”اب کہاں ہے آمنہ؟“ احمد پوچھ رہا تھا۔
 ”کہاں ہوگی ماں کے گھر آگئی ہے۔“ بھانجی کے
 دکھ پر امی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔
 ”ارے امی آپ اتنی اداس اور پریشان کیوں ہیں

Downloaded From
 Paksociety.com

Amid Said

READING
 Section

”ہے کہاں آمنہ؟“ احمد نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اٹھ کر آمنہ کے کمرے میں چلا آیا۔

”کیا ہوا آمنہ؟“

آمنہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے چونک کر احمد کی جانب دیکھا۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں سے تو اتارے آنسو بہنے لگے۔ پھر جلدی سے اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

”کیسے ہوا احمد؟“ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ احمد ویسے کا ویسا تھا وجیہہ، پنڈسم، اسمارٹ لگتا تھا پانچ سال ایک پل میں گزر گئے ہوں۔ البتہ تھوڑی بہت تبدیلی آمنہ میں تو آئی تھی۔ سسرالی زندگی میں اسے ہر لمحہ طعنے ہی ملتے رہے کہ اس کی گود ہری نہیں ہوئی اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ وہ لوٹ کر اسکے آگئی۔ احمد کے سامنے وہ بہت بے بسی سے بیٹھی تو تھی لیکن وہ ابھی تک بھول نہیں سکی تھی اس کا اس کی ضرب کو جو احمد نے اس کی روح پر لگائی تھی کہ وہ آمنہ سے شادی نہیں کرے گا۔ آمنہ کیا اس نے کسی سے بھی شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اماں مٹیں کرتیں۔ بہن بھی سمجھاتی لیکن احمد نے ٹھان لی تھی کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ لوگ حیران تھے کہ ایسا احمد میں کیا تھا کہ وہ کہتا ہے کہ اسے شادی ہی نہیں کرنی اور تو اور چھوٹے بھائی کی شادی کے بعد سے ہی احمد نے گھر میں اودھم مچا دیا تھا کہ وہ چھوٹے بھائی کے ساتھ نہیں رہے گا کہ اُسے گھر میں شور شرابہ پسند نہیں ہے۔ اس لیے وہ ماں اور بڑی آپا کے ساتھ الگ رہ رہا تھا۔ کئی دنوں سے احمد صرف آمنہ کے بارے میں ہی سوچے جا رہا تھا کہ آمنہ تنہا رہ گئی۔ پھر اسے کئی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ آمنہ تو اس کے لیے ایک پرفیکٹ آئیڈیل ہے۔

”چلو کمرے اور کھوٹے کی پہچان تو ہوئی ایک پرفیکٹ لائف گزر سکتی تھی لیکن یہ کیا کیا احمد تم نے۔ اپنے ہی آئیڈیل کو خود سے دور کر دیا تھا اور جب وہ

لوٹ کر آئی تو اب تم کیا سوچ رہے ہو جاؤ جا کر اماں سے کہہ دو کہ خالہ پریشان نہ ہوں۔“

☆.....☆

جس نے سنا وہ حیران رہ گیا کہ احمد، آمنہ سے شادی کر رہا ہے۔ احمد بہت ہی سنجھا ہوا محبت کرنے والا انسان تھا۔ آمنہ تو خود حیران رہ گئی کہ احمد اس پر ترس کیوں کھا رہا ہے۔ ہر آنے جانے والے احمد کو بہت تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”احمد! تم مجھ پر رحم کھا رہے ہو۔ میں تمہارے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔“

”تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو آمنہ؟“ احمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے بہت غور سے دیکھا احمد کتنا بدل چکا تھا۔ محبت میں پور پور ڈوبا ہوا احمد اس کے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اتنا پرسکون چہرہ اور اتنی خوابوں بھری آنکھیں کہ ایک پل کے لیے آمنہ کو بھی یقین نہ آیا۔ آہستہ آہستہ احمد خود ہی اس سے دور ہوتا چلا گیا تھا اور جب بات گھر میں شادی کی چلی تو وہ ساری محبتوں کو بھلا کر مگر گیا۔ آمنہ نے اس کو فلٹرٹ جانا اور گھر والوں نے کچھ اور یوں برسوں پرانی بات ختم ہو گئی اور آج وہ برسوں پرانے رشتے جوڑنے آیا تھا۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ آج وہ اپنی ماں کو بھی منا کر لے آیا تھا۔ ماں بہن پرانے رشتے کا حوالہ دے رہی تھیں۔ سب تو یہی سمجھتے تھے کہ آمنہ بالکل سیدھی سادی ہے اور احمد باہر سے بڑھ لکھ کر آیا ہے۔ آمنہ اس کے قابل نہیں۔ جو فرق کل تھا وہ آج بھی ہے۔ آمنہ کی ماں بے بسی سے بولیں۔

”میں احمد کے کہنے پر ہی آئی ہوں۔“ چھوٹی بہن ساجدہ بہت سوچ کر بولیں۔

”یہ فیصلہ اب آمنہ نہیں مان رہی میں مجبور ہوں۔“

”تم ماں ہو تم اسے سمجھاؤ اب اگر احمد مان گیا ہے تو اسی کو اس کا نصیب جانو۔“ وہ سمجھا کر جا چکی تھیں۔

”اللہ اتنا مہربان ہو گا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔“

آمنہ تو نبی ہی میرے لیے تھی پھر میں یہ غلطی کیسے کر گیا۔“

کیا کچھ نہیں تھا اس کے پاس اسٹیٹس سب کچھ تو تھا ہر لڑکی کی خواہش احمد کو پالینے کی تھی۔ اس کا بس ایک ہی جواب ہوتا۔

”ای مجھے شادی نہیں کرنی، بس کہہ تو دیا۔“ تو پھر بس تو بس ہی رہی اور آج اچانک وہ بھند تھا کہ مجھے شادی کرنی ہے تو آمنہ سے ہی۔ ہر قیمت پر اسے آمنہ چاہیے تھی۔ وہ بہت تیز رفتار گاڑی سے آمنہ کے خیالوں میں گم گھر لوٹا۔ گاڑی نے جونہی دروازہ کھولا سامنے سے گھر کی ماسی اپنا چھوٹا سا بچہ اٹھائے ہوئے نظر آئی تو اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا۔

”احمد! بہت بری بات ہے گناہ کبیرہ ہے کسی غریب کو دیکھ کر منہ پھیرنا۔“ ماں آہستہ سے بولیں۔ احمد پر اس وقت ایک وحشت سی طاری تھی وہ جلدی سے اتر کر اندر آیا۔

”کیا ہوا احمد! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ کیا آمنہ نے انکار کر دیا؟“

”نہیں!“ وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔



سنجیدہ سا احمد آج کل بڑے موڈ میں گھوم رہا تھا۔ شوخ کپڑے، دھمے سروں میں میوزک، بار بار سی ڈی پلیئر پر۔

گلوں میں رنگ بھرے بادلوں بہا رہے چلے چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے مہدی حسن کی سریلی آواز میں آمنہ کا ہیولا آہستہ آہستہ سگریٹ کے دھوئیں میں نظر آتا۔ شام ہوتی تو وہ گاڑی لیے ہوئے وہ حالہ کے دروازے پر پارن ویتا۔

”آمنہ! چلو آؤ کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”نہیں احمد! آپ کیوں نہیں سمجھتے اپنی اور میری پجوشن کو۔ خاندان کیا حملہ بھی جانتا ہے کہ تم میرے گلشن کو خراب ٹھکرانے جانے کے بعد میں تمہارے

ساتھ کہیں جاؤں گی تو لوگ کیا سمجھیں گے۔“

”سو واٹ لوگ کیا سمجھیں گے، Who Cares۔“ احمد کے ہونٹ مسکرائے۔

”احمد! ہم بہت سارا وقت اپنا پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“ وہ اپنا رخ پھیر کر بولی۔

”کوئی نہیں وقت کبھی نہیں گزرا تم ایسا مت سوچو۔“ اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”احمد پلیز! مت کرو ایسا میں تمہیں کچھ نہیں دے سکوں گی۔“ اس نے نظر بھر کر احمد کو دیکھا تو احمد بول پڑا۔

”مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے ایچی۔“ احمد کی شوخ آنکھیں اس کے چہرے کو ایک پیش وے رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنی نظر س نیچی کر لیں۔ تو احمد نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کر لیا۔ اس کی آنکھیں اسے آپ بند ہو گئیں۔

”پلیز ایچی! مجھے معاف کرو ایک بار۔ مجھ سے ہوئی غلطی تم میری زندگی میں ایک بار آ کر تو دیکھو احمد تمہیں ساری خوشیاں دے گا۔“ آمنہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ احمد گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آمنہ سنک سنک کر رو رہی تھی۔

”اوکے ایچی اوکے۔ میں تو سمجھا تھا کہ اللہ مجھ پر مہربان ہو رہا ہے۔“ وہ کمرے سے جلدی سے باہر نکل گیا۔ ایچی نے سزا ٹھا کر دیکھا لیکن وہ جاچکا تھا۔ خوشی اور دکھ اچانک وارد ہوتے ہیں وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ زندگی جب کر وٹ بدلتی ہے تو حادثات خوشی اور غم کے اسنے ہی آپ چلے آتے ہیں۔ سو آج بھی احمد کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایچی کی عدت کے بعد آمنہ کا نکاح احمد سے ہے۔



آمنہ اپنے ماں باپ کی ایک ہی بیٹی تھی۔ سب اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے کہ وہ احمد کی بیوی بننے جا رہی تھی۔ کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ آمنہ وہن بن کر احمد کے گھر آئی۔ رنگ برنگے ہوا

میں اڑتے آچل بڑے سے لان میں درختوں میں لگے ققمیہ جل بچھ رہے تھے۔ احمد کی نظریں بار بار آمنہ کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس باریک دوڑے سے چھانکتا ہوا اس کا چہرہ چھوٹی سی ماتھے پر بندیا نظر آرہی تھی۔ احمد اور آمنہ کی جوڑی پر سب کو اس وقت رشک آرہا تھا۔ آمنہ کے سارے دکھ دھل گئے تھے۔

”حسن اور محبت ہی تو ہر چیز نہیں ہوتی ماں نے دولت کے اتہار لگا دیئے تھے لیکن چھوڑنے والوں نے ایک بل میں آمنہ کو نکال دیا تھا۔ سنا ہے کوئی معمولی سی لڑکی کو وہ لے بھی آئے۔ دیکھو اب یہاں کیا ہوگا۔“ کوئی ولی چلی خاتون آمنہ کے بہت قریب بیٹھی ڈسکس کر رہی تھی۔ آمنہ کا دل آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا تھا۔

”اگر احمد کو بھی میری خالی گو کا احساس ہو گیا تو.....“ لیکن احمد اس کے سامنے کھڑا نہیں رہا تھا۔ احمد اسے پا کر بہت خوش تھا اور آمنہ بھی بہت مطمئن سی تھی۔

چھ مہینے بعد ہی کسی خاتون نے احمد کی ماں سے آمنہ کے سامنے ہی پوچھ لیا تھا۔

”کوئی خوش خبری ہے کیا؟“

”ایسی ہماری قسمت کہاں۔“ ای بولیں۔ آمنہ کے اندر ایسا لگا کچھ دھڑ سے گرا ہے۔ تو وہ چکرا کر پلر کے ساتھ لگ گئی تو ماندہ نے پلٹ کر آمنہ کو دیکھا تھا۔

”اوہ آمنہ! تم تو ایسے چکرا کر گری ہو جیسے ماں بننے کی پہلی نشانی ہو۔“ خالہ اب خالہ نہ تھیں وہ ایک سانس تھیں۔

”خالہ! پانی دے دیں۔“

”بی بی اٹھو اور سامنے فریج ہے جا کر پی لو پانی مجھے تو یہ ڈرامے پسند نہیں اگر اکلونی ہو تم اپنی ماں کی تو میں کیا کروں۔ میں نے تو ایک ساتھ چار بچے پالے ہیں۔ تمہاری ماں کے بھی بہت نخرے تھے۔“ وہ چائے کا کب اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

”کیا ہوا ای! تمہارا چہرہ کیوں اتنا پیلا ہو رہا

ہے۔“ احمد شام کو اس سے پوچھ رہا تھا۔

”پتہ نہیں احمد اکل سے بار بار مجھے چکرا رہے ہیں اور میں جوس پی لیتی ہوں شاید پی پی لو ہو گیا ہے۔“

”تو چلو ڈاکٹر سے چیک اپ کروالو۔“

”ابھی تو گھر میں کام ہیں۔ کل تک اور دیکھ لوں۔“ وہ سانس کے خوف سے بہانہ بنا گئی۔

”کیا ہوا آمنہ! کیا تمہاری زیادہ طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ تم آج ناشتے پر نہیں آئیں۔“ خالہ بولیں۔

”خالہ! مجھے بار بار متلی محسوس ہو رہی ہے۔“

”ہاں تو ہر وقت تم احمد کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو تو کھا لیا ہوگا کچھ۔“ وہ عجیب سے طنزیہ لہجے میں بولیں۔

”نہیں خالہ نہیں۔“ وہ جلدی سے بول پڑی۔

”تو جاؤ ڈاکٹر کے پاس دوا لے لو۔ چلو آؤ میں تمہیں لے کر چلتی ہوں۔ پھر تم احمد کو نخرے دکھاؤ گی وہ پورے شہر میں تمہیں لیے لیے پھرے گا۔“ سانس بہت غصے میں ڈاکٹر کے پاس اسے لے گئیں۔

”ارے بھئی چلو کیا ریگ ریگ کر چل رہی ہو۔“

”خالہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کئی دن سے مجھے بخار آرہا ہے۔“ وہ بہت نقاہت سے بولی۔

”اچھا بھئی آ جاؤ۔“ وہ بیزار کن لہجے میں بولیں۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد ماندہ کو مبارک باد دی تھی۔

”بی بی آپ دادی بننے والی ہیں۔“

”ہیں.....“ ماندہ نے حیرانگی سے ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔

”کیا کہا آپ نے کیا کہا۔“ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

وہ آمنہ کا ہاتھ تھام کر گاڑی تک لائیں تھیں۔

”آہستہ چلو آمنہ آہستہ تم نے تو ہمیں اتنی بڑی خوشی دے دی۔“ آمنہ کو خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ گھر پہنچنے میں کانی دیر ہو گئی تھی۔ احمد ہل ہل کر انتظار کر رہا تھا۔ ہارن کی آواز ہوئی تو احمد چائے کا کپ لیے جلدی سے باہر آ گیا تھا۔ ماندہ، آمنہ کا ہاتھ تھامے

ہوئے نظر آئیں تو احمد گھبرا کر بولا۔

”ایمی! تم ٹھیک تو ہو؟“

”ارے احمد! خوشی کی بات ہے ایمی ماں بننے والی

ہے۔“ ایمی کے بجائے ماندہ بول پڑیں۔

”واٹ.....!“ احمد کو کرنٹ سا لگا اور چائے کا

کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔

ایمی نے مسکرا کر احمد کی طرف دیکھا۔

احمد تو ایک سیکنڈ میں اندر جا چکا تھا۔ ماندہ اور آمنہ

نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آگے بڑھیں۔

”کچھ نہیں آمنہ! تم آرام سے چلو۔“ ماندہ اس کو

اس کے کمرے تک چھوڑ کر گئی تھیں۔

”کیا ہوا احمد! تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ ایمی کی ہنستی

ہوئی آنکھیں ایک لمحے میں بجھ گئیں وہ..... وہ احمد ہی

نہیں تھا۔ شدید غصے میں اس کا چہرہ ہی بدل گیا تھا۔

”خوشی.....!“ احمد غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”آمنہ! تم نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا ہے۔“

”فراڈ.....!“ ایمی حیران ہی ہو کر بولی۔

”میں نے تم سے صرف اس لیے شادی کی تھی کہ تم

کبھی ماں نہیں بن سکتیں اور میں اس عورت کو چھو ہی

نہیں سکتا جو ماں بنے اس کے وجود سے جو بچے کی

خوشبو آتی ہے میں اس سے الرجک ہوں۔“ احمد نے

غصے سے اپنی مٹھیاں بچھ لیں تھیں۔

”احمد! تم بڑا اتل کر رہے ہو اس خوشی کے موقع پر۔“

”نو میں ایک پل بھی تمہارے ساتھ نہیں رہ

سکتا۔“ اس کا چہرہ وحشیوں کی طرح ہو گیا تھا۔ اس

نے بازو پکڑ کر اسے بیڈ سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

”تم جاؤ اسی وقت دوسرے کمرے میں۔“

”خالہ.....!“ وہ زور سے چیخی۔

”چھوڑو احمد! اس کا ہاتھ کیا ہوا؟ میں جانتی تھی کہ

تم یہی کرو گے میں تمہاری ماں ہوں۔“ انہوں نے

آمنہ کو ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کر لیا۔

”خالہ.....!“ آمنہ نے گھبرا کر اپنی خالہ کو دیکھا تھا

جو یہ کہہ رہی تھیں کہ میں جانتی تھی کہ تم یہی کرو گے۔

”میں کہہ رہا ہوں تم اس وقت نکل جاؤ میرے

کمرے سے۔“ وہ بری طریقے سے دھاڑا۔ آمنہ گھبرا

کر باہر نکلی۔

”احمد! تمہاری ضد تھی کہ میں آمنہ کو لے کر آؤں گا

میں اسی وقت سمجھ گئی تھی میں نہیں چاہتی تھی کہ ایسی

لڑکی ہمارے گھر آئے جو ہماری نسل کو آگے نہ بڑھا

سکے لیکن اب یہ اللہ کا خاص کرم ہے تم پر اور اس بار

تمہاری ماں تمہارے ساتھ نہیں ہے یہ جان لو تم۔“

احمد نے آگے بڑھ کر ماں کے لیے دروازہ کھول دیا تھا

کہ آپ باہر جائیں۔ احمد دروازہ بند کر کے اپنا سر

دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر روتا رہا۔ گھر میں ایک اداس فضا

تاکم تھی۔ آمنہ کی برسوں پرانی ایک خواہش کہ وہ ماں

بن جائے احمد نے ایک پل میں اٹھا کر اسے گھرے

گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ کوئی بھی اس کے لیے کچھ

نہ کر سکا۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر ماندہ کے

روم میں زندگی گزار رہی تھی۔

”وہ بہت ضدی ہے۔ میری بات بھی نہیں سن

رہا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”پھر خالہ! آپ اسے سمجھائیں یہ کیسے ممکن ہے

جو احمد چاہ رہا ہے۔“ ایمی رو پڑی تھی۔

”بس یہ ہماری بد نصیبی ہے اور کچھ نہیں۔ احمد کو کوئی

بات سمجھ نہیں آ رہی۔“ خالہ تڑپ کر بولیں۔

”میں کہیں چلی جاؤں گی چھپ کر رہ لوں گی مگر

میں اپنے بچے کو نہیں مار سکتی۔ وہ کہتا ہے یہ بچہ دنیا میں

نہیں آئے گا میں اپنے بچے کو نہیں مار سکتی خالہ۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں آمنہ! تم کہیں جا کر

چھپ جاؤ۔ جب بچہ پیدا ہوگا ناں تو نیہ بان جائے گا۔“

”نہیں خالہ نہیں، وہ کہتے ہیں کہ صرف دو ہی

راستے ہیں بچہ یا طلاق۔ ای کہتی ہیں تم طلاق لے

لو۔ آپ بھی یہی کہتی ہیں لیکن میں دوبارہ طلاق یافتہ

نہیں بن سکتی۔ ہو گا وہی جو احمد چاہتا ہے۔“

”تو کیا تم اس بچے کو مار دو گی؟“ مائدہ حیران سی ہو کر بولیں۔

”نہیں بالکل نہیں۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی گردن میں ڈال کر خود کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ وہ دس بے قدموں احمد کے کمرے میں چلی تو آئی بھی احمد آج ہاں اور ناں کا جواب چاہ رہا تھا۔

”احمد پلیز!“ اس نے احمد کے دونوں پیر تھام لیے تھے لیکن اس نے بے رحمی سے ایکی کو جھٹک دیا تھا۔

پھر ہوا وہی جو احمد چاہتا تھا۔ احمد وہ بلا تھا جو اپنے ہی بچے کو کھا گیا تھا اور آمنہ نے دوسری بار طلاق یافتہ ہونے سے خود کو بچا لیا تھا۔

آمنہ کی ماں اس عم میں سال بھر بھی نہ جی سکیں لیکن احمد کو کوئی دکھ نہ احساس تھا وہ اپنی زندگی میں بہت خوش تھا۔ دوسری بار پھر ایسا ہوا اور اس بار ایکی نے نہ کوئی احتجاج نہ جھٹ نہ بحث کچھ بھی نہ کیا اس بار پھر احمد جنگلی بلا بن کر اپنے ہی بچے کو کھا گیا۔ ایکی چپ رہتی رہتی کوئی پوچھتا کہ کتنے بچے ہیں تو وہ بہت حسرت سے ہتی۔

”دو بچے تھے احمد نے مار دیئے۔“ لوگ فوراً اس کی کہانی سننے بیٹھ جاتے اور وہ ہر ایک کو اپنی کہانی بتانے لگتی۔

”احمد کو کبھی شہائی کا احساس نہیں ہوتا۔“ صائمہ نے پوچھا تو اس نے لٹی میں سر ہلا دیا۔

”بچی تمہارے درمیان اس ٹائیک پر بات نہیں ہوتی۔“ تو وہ جواب لٹی میں تھا۔ گہری گہری آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔

”تمہیں یہ کھیلتے ہوئے بچے اچھے نہیں لگتے۔“

صائمہ بولی۔

”میں کیا کر سکتی ہوں جب احمد راضی نہیں۔“ اس کی نظریں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔

گرے آنکھوں میں سزئی بادل سے اتر آئے۔

لٹی لٹی سنہری دھوپ پورے لان میں اتر آئی تھی۔

آمنہ احمد کے ساتھ بیٹھی چائے پیتے ہوئے بولی۔

”احمد دونوں بچے اتنے کیوٹ ہیں بالکل سفید ایک گلاؤڈی کی شکل ہے اور ایک زری کی شکل ہے۔ گلاؤڈی تو اپنے بچوں کو چھپائے ہوئے بیٹھی ہے۔ بالکل ان کے پاس سے ہٹ نہیں رہی۔ احمد چاہے جب اسے بین ہو رہا تھا تو وہ بار بار میرے قدموں پر لوٹ رہی تھی۔ شاید میں اسے اس تکلیف سے بچاؤں۔“ احمد زور سے ہنسا تھا۔

”ایکی اتن بلیوں کے پیچھے دیوانی ہو، بچپن میں بھی تم نے ایک بلی پالی تھی مجھے آج تک یاد ہے۔“ چائے کاسپ لیتے ہوئے وہ بولا۔

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ ایکی ٹرنے سا اس لہجے میں بولی۔

”لیکن تمہارا بلا بہت لاپٹی کیا ضرورت تھی اس روڈ پر اس کے قصائی کی دکان پر جانے کی۔ چھوڑو ایکی اس مت ہو۔ افسوس تو مجھے بھی بہت ہوا تھا۔ بس روڈ ایکسپرنٹ میں مر گیا۔ بے چارہ بوبا۔“ احمد ہنسا لیکن ایکی بہت ادا اس تھی۔

”ارے..... ارے۔“ ایکی جھپٹی۔

”یہ کیا کر رہا ہے زری ادا بلی گاڈیہ بلا اپنے ہی بچے کو مار کر کھا رہا ہے۔“ ایکی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لان کے دوسرے کونے پر زری میل بچے کو مروڑ کر پھینک چکا تھا اور دوسرے بچے کو منہ میں دبا کر لے جا رہا تھا۔

”ادامانی گاڈ! احمد..... احمد یہ وحشی بلا اپنے ہی بچے کو کھا رہا ہے۔ احمد اس نے اپنے ہی بچے کو مار دیا۔“ وہ سکتے کے عالم میں احمد کو دیکھنے جا رہی تھی۔ احمد کی نظریں جھکی کی جھکی رہ گئیں اور ایکی تک احمد دیکھنے جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا احمد اور بلی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کی باڈی لیکن چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

”دیکھو احمد دیکھو اس کو میں نے خود پالا کتنی محبت کی اور آج وہ خود ہی اپنے بچے کو منہ میں دبا کر ٹنگی کے پاس پھینک کر آیا ہے۔“ وحشی ورنہ۔“ ایکی چیخ چیخ کر بول رہی تھی اور احمد شرمندہ سا رخ پھیر گیا۔

☆.....



مرحباً اسپاگول کیونکہ صحت ہے اول اول



READING
Section

MARHABA LABORATORIES (PVT.) LTD.
Marhaba Laboratories • UAN: 111-152-152 • www.marhaba.com.pk

میری دشمنی کا آغاز تیرے ہو

”اماں! بس اب دیر مت کریں۔ بہت ہی اچھے اور بھی کئی لوگ بیاہنا چاہتے ہیں۔ یہاں اپنی بیٹیوں کو جیسے ہی ہاں ہو آپ بھی جلد بیاہ دینا۔“ شبانہ لوگ ہیں لڑکا اتنا قابل ہے رشتے والی بتا رہی تھی کہ

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section



Downloaded From
paksociety.com

READING
Section

ماں کے کندھے سے لگی انہیں اپنے نادر مشورے سے نواز رہی تھی۔

”اے لو، تو کیا میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی جلد اپنے گھر کی ہو جائے مگر دل کو تسلی بھی تو ہو جلدی جلدی کے چکر میں کہیں ہمیشہ کا چھتاوانہ دھرا رہ جائے۔“ زہرہ بیگم کی بات پر شبانہ برے برے منہ بنانے لگی۔

”پورے چھبیس کی ہو گئی ہے اپنی سزا اور آپ کو ابھی بھی یہ سب جلدی لگتا ہے اور وہ جو فریال کو گھر میں گھسالیایا ہے آپ نے۔ ہم لاکھ انکار کریں مگر کیا اس کی خوب صورتی اور کم عمری کے سامنے سزا کا رشتہ ہو سکتا ہے کہیں؟“

”کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر میں کیا کروں تمہارے ابا کو ہی ہمدردی کا بخار چڑھا ہے۔ سال ہونے کو آیا ہے، کہتے تھے کہ اس کے باوا کے دور کے بھائی لگتے ہیں کوئی کزن، وہاں چھوڑ آئیں گے سال کے بعد مگر اب مجھے تو یہ سب نرا دھوکہ اور جھوٹ ہی لگتا ہے ان کا۔“ زہرہ بیگم نے بے بسی سے جواب دیا۔

”ہے کہاں یہ فریال اس وقت؟ آپ کو معلوم ہے ناں اسفند نے رات کھانے پر آنا ہے خوب اہتمام ہونا چاہیے ورنہ سوطرح کی باتیں سننا پڑیں گی مجھے۔“ شبانہ نے ٹوہ لینے کے ساتھ ساتھ آرڈر بھی جاری کر دیا۔

”ہو گی کہاں؟ یہیں کچن میں ہو گی مفت کی روٹیاں توڑتی رہتی ہے سارا دن۔“ زہرہ بیگم نے زہر خند لہجے میں جواب دیا توجہ نفرت سے پڑھا۔

”اب ایک کپ چائے ہی پلوادیں، کب سے آئی بیٹھی ہوں مگر یہاں تو کسی کو پروا ہی نہیں میری ایک وہ سزا ہے تو فیق نہیں ملتی کہ آکر سلام ہی کر لے۔“ شبانہ نے سخت کوفت کے عالم میں کہا۔ وہ جب بھی آتی تھی اس کے یہی لگے بندھے شکوے ہوتے تھے۔ کوئی بھاگ کر پانی پیش کر کے ساتھ ہی

آکر چٹ کر بیٹھ جائے تاکہ گھر میں ہونے والی سرگرمیوں کی پوری رپورٹ لے سکیں۔ شبانہ ان لوگوں میں سے تھی جن کو شادی کے بعد بھی اپنی گھر گرہستی سے زیادہ پیکی میں ہونے والی سرگرمی سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

”ارے نہیں بیٹا! سزا تو کمرے میں ہو گی اور میں ابھی کہے دیتی ہوں چائے پانی کا۔“ زہرہ بیگم نے محبت پاش لہجے میں اسے کہا تو وہ آلتی پالتی مار کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

”اماں! ادانیال کی اتنی اچھی جا ب لگ گئی ہے۔ اس کا بھی اب رشتہ ڈھونڈیں کہیں۔“ شبانہ کے پاس مشوروں کی کمی نہ تھی۔

”پاگل ہوئی ہو کیا؟ ابھی کر دی ناں اس کی شادی تو یہ جو تیرے عیش ہیں ناں یہ سب ختم ہو جائیں گے۔ جب تک سزا کی شادی نہیں ہو جاتی تم نام بھی مت لینا ادانیال کی شادی کا۔“ زہرہ بیگم کا پارہ ایک دم ہی ہانی ہو گیا تھا۔

”فریال! کہاں مر گئی ہونا مراد۔“ اب سارا غصہ فریال پر ہی اترا تھا زہرہ بیگم کا، شبانہ فقط کندھے اچکا کر رہ گئی۔

”اری او فریال۔“ زہرہ بیگم کی تیز گونج دار آواز پر فریال جو ابھی ابھی برتن دھو کر فارغ ہوئی تھی تیزی سے کچن سے نکل کر زہرہ بیگم کے سامنے حاضر ہو گئی۔

”کہاں دفغان ہو گئی تھیں۔ اتنی دیر سے تمہارے نام کی صدا لگا رہی ہوں۔“ زہرہ بیگم نے شعلہ بار نگاہوں سے فریال پر نگاہ ڈالی۔ سرخی مائل سفید رنگت بڑی بڑی سیاہ آنکھیں گھنیری پلکیں، بکھری لٹیں لیے وہ ہر اسان نظروں سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”نا مراد اپنی مری ماں پر گئی ہے وہ بھی کم بخت یوں ہی حسین تھی۔“ زہرہ بیگم نے دل میں فریال کو کوسا۔

”اماں! آپ بھی ناں جانے کن خیالوں میں کھو

گئی ہیں اب کہہ بھی دیں جو کہنا ہے، سچ مجھے تو اس منوں کو دیکھ کر وحشت سی ہوتی ہے۔ خود ہی کھا گئی اپنے ماں باپ کو۔“ شبانہ نے ماں کو ٹوکا۔

ماں باپ کے نام پر فریال کی آنکھوں میں واضح نمی آگئی تھی مگر خاموشی سے ہم تن گوش تھی۔

”ہاں وہی کہنے جا رہی ہوں تم ایسا کرو فریال شام کے کھانے میں بریانی اور ٹرائفل بنا لو، کہاں بھی تیار کر لینا۔ سلا دو طرح کے بنانا۔ میرا خیال ہے اتنا کافی ہوگا۔“ زہرہ بیگم نے ساتھ بیٹھی بیٹی سے مشورہ طلب کیا۔

”جی ہاں امی! مگر میرے بچے تیز مرچوں والی بریانی نہیں کھاتے ان کے لیے پلاؤ بنوائیں اور بھیجی تم جاؤ بچوں کے لیے نوڈل اور میرے لیے چائے کا کپ لاؤ۔“ شبانہ نے حکیمہ انداز میں کہا۔ تو فریال سعادت مندی سے سر ہلا کر کچن میں آگئی۔

اتنا کچھ بنانا تھا اور وقت بھی کم رہ گیا تھا۔ پھر شبانہ آپی آئی ہوئی تھیں۔ ان کو ہر کام وقت پر ملنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ اس قدر تذلیل کرتی تھیں کہ فریال کو اپنے بکھرے وجود کی کرچیاں سینٹنا ہی دو بھر ہو جانا تھا اس کا کام تھا کولہو کے تیل کی طرح جھٹ جانا۔ سو وہ جھٹ گئی اور لگا تار ایک کے بعد ایک کام کرتی چلی گئی۔ فریال کی کمر بری طرح دکھ رہی تھی اک نہیں سی اٹھی تھی جس کو دہاتے ہوئے وہ دوبارہ تندھی سے کام میں لگ جاتی، کھانے کی مہک چار سو پھیل گئی تھی سارا کھانا تیار ہو چکا تھا۔ ایک دم انجانی سوچ نے فریال کے چہرے کو تر کر دیا۔

☆.....☆

”نہیں ناں بابا جانی مجھے آج کھانا بنانے دیں ناں، میرا دل کرتا ہے میں اپنے ہاتھوں سے اپنے بابا کو کھانا بنا کر کھلاؤں۔“ فریال نے لاڈ سے اپنے بابا کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔

”نہیں بالکل نہیں۔ میری ”کولہ پری“ تو کھانا

کھانے کے لیے پیدا ہوئی ہے اور پھر ابھی بڑھائی مکمل نہیں ہوئی جب ہوگی تو بھی ہرگز منع نہیں کروں گی منت نئی ڈشز بنا بنا کر کھلانا اپنا بابا جانی کو۔“ بابا پیار سے اپنی بیٹی کو کولہ پری کہا کرتے تھے مگر جب بابا نے فریال کی اتری ہوئی شکل دیکھی تو زیر لب مسکرا اٹھے۔

”اچھا ٹھیک ہے اگلے سال سے گھر میں کھانا صرف میری بیٹی بنایا کرے گی مگر اس وقت تو چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔ جاؤ جا کر اچھی سی چائے بنا لاؤ۔“ بابا کی بات سن کر وہ ایک دم کھل اٹھی تھی اور کھلکھلائی ہوئی کچن کی جانب چل دی اپنے پیارے بابا جانی کے لیے چائے بنانے مگر وقت کو کچھ اور ہی منظور تھا اس کی خواہش کہ وہ اپنے بابا جانی کے لیے کھانا بنائے ایک جسم حسرت ہی رہ گئی۔

”آہ کتنے پیارے پیارے عزیز رشتے کھو دیئے ہیں میں نے۔“ تجھائی کا احساس شدت اختیار کر گیا تو اس کے گال خود بخود تیزی سے جھینگنے لگے۔

”ارے یہاں تو ٹسوے بہائے جا رہے ہیں۔“ شبانہ آپی کچن میں داخل ہوئیں تو اس کو یوں روٹا دیکھ کر ناگواری سے بولنے لگیں۔

”چار کام کیا کہہ دیئے تمہیں تمہارا رونے دھونے کا پیریڈ اشارٹ ہو گیا، احسان مانو ہمارا کہ ہم نے تمہیں پناہ دی ہوئی ہے۔ دو کام کر کے کون سا احسان کر دیا تم نے ایک ہم ہیں مجال ہے جو کبھی اف بھی کی ہو۔ ہزار کام نمٹنا کرتے ہیں اپنے سسرال کے۔ تب کہیں جا کر خلاصی ملتی ہے جان چھوٹی ہے کہ جاؤ اب جہاں جانا ہے۔“ شبانہ آپی تیز تیز لہجے میں بولنے لگیں تو فریال ایک دم گھبرا کر اپنے تر چہرے کو دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

”نہیں آئی! ایسی تو کوئی بھی بات نہیں ہے۔“ فریال نے کھی کھی آواز میں وضاحت پیش کرنا چاہی مگر یہاں کسی کو اس کی وضاحتوں کی ضرورت

تھی نہ حاجت۔

”نہ تو پھر کس خوشی میں بہہ رہے ہیں یہ زارو قطار آنسو؟“ شبانہ آپنی نے باقاعدہ کمر پر ہاتھ لگا کر لڑنے والے انداز میں پوچھا۔

”شبانہ آپنی! آپ کب آئیں؟“ وانیال کی آمد کی وجہ سے ان کی ساری توجہ اب وانیال کی جانب ہو گئی تھی۔ وانیال نے اشارے سے فریال کو وہاں سے جانے کو کہا۔ وہ خاموشی سے کچن سے نکل گئی۔ جمع جوڑ کا کوئی کلینہ کوئی قاعدہ اس کی زندگی میں لاگو نہیں ہوتا تھا۔ سوائے وکھوں اور ڈالتوں کے جمع جوڑ کے۔

ابھی اس نے بی اے آنرز ہی کیا تھا کہ اس کے عزیز از جان بابا اور ای ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہمیشہ کے لیے اسے پتی دھوپ میں تنہا چھوڑ گئے۔ وہ اپنے والدین کی اکلونی اولاد تھی۔ خوب نازوں پٹی، خوشیوں کے جھولے میں جھولا جھولتی ہوئی وہ بڑی ہوئی تھی۔ کوئی آرزو کوئی خواہش تشنہ لب نہ رہی تھی۔ نامعلوم کیسے کوئی خواہش لب پر آنے سے پہلے ہی اس کے والدین جان جاتے تھے مگر اس جان لیوا حاویٹے کے بعد اس کی زندگی کی کیا ہی پلٹ گئی۔ وہ تنہا تھی اور سامنے ایک سنگدل دنیا تھی۔ اس کے بابا بھی اس کی طرح اپنے والدین کی اکلونی اولاد تھے۔

دور پرے کے ایک پچھتے مگر وہ معاشی لحاظ سے اس قدر کمزور تھے کہ اس کی کفالت کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے تھے یوں وہ خود بخود اپنے اکلوتے ماموں کی ذمہ داری بن گئی۔ ماموں نے اس کے سر پر دست شفقت تو رکھا مگر حقیقی سائبان نہ بن سکے۔ ممانی سے ہزار بحث و مباحثہ کے بعد اسے ماموں کے گھر میں ایک چھت ایک آسرا تو مل گیا تھا مگر صبح سے شام تک وہ کاموں میں جتی رہتی اور ہزار طعنے ملتے تھے شبانہ آپنی وانیال بھائی اور چھوٹی شزاء سب کے سامنے وہ ادب سے رہتی ایک ریکار پر حاضر ہو جاتی تھی شاید اس کے کہنے کے دل اس کے لیے وسیع ہو جائیں

مگر حالات جوں کے توں تھے۔

”اب چھوڑ بھی دو بچی کو کیا جان سے مار ڈالو گی؟“ فرید ماموں نے ممانی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ممانی فریال کو بری طرح پیٹ رہی تھیں پھٹروں اور گھونسوں کی بارش برسا رہی تھیں۔

”سارا دن کام کاج کے بعد رات کو یہ انعام یہ صلہ ملا تھا۔“

”بچی! یہ بچی ہے ناگن ہے یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ آج شزاء کو دیکھنے لڑکے والے آرہے ہیں اور پھر بھی یہ منہ اٹھائے چلی آئی ڈرائنگ روم میں کیا یہ اتنی ہی بچی ہے؟“

ممانی کا پارہ بہت ہائی تھا۔ آج جو لوگ شزاء کو پسند کرنے آئے تھے وہ فریال کو پسند کر گئے تھے اور نہ صرف پسند کر گئے تھے بلکہ جھٹ منگنی اور پٹ شادی کا سندیسہ بھی دے گئے تھے۔ کیونکہ لڑکے نے جلد ہی امریکہ پلٹ ویزے پر جانا تھا۔ ممانی کا تو دکھ اور صدے سے برا حال تھا۔ اتنا اچھا رشتہ ہاتھوں سے نکل گیا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ فریال کو اس سارے معاملے کی قطعاً خبر نہ تھی کہ آج شزاء کو دیکھنے لوگ آرہے ہیں۔ شبانہ آپنی کے بڑے بیٹے حیدر نے آکر فریال سے کہا کہ نانو آپ کو بلا رہی ہیں۔ وہ جو ممانی کے ایک بلاوے پر جن کی طرح حاضر ہو جاتی تھی کیسے جائے بنا رہتی مگر اندر ڈرائنگ روم کا منظر تو اس کے اندازوں سے بالکل مختلف نکلا۔ دو خواتین اور ایک بزرگ مرد اور ساتھ ساتھ ماموں ممانی بیٹھے تھے۔ شزاء ان خواتین کے درمیان سر پر وپٹہ جمائے بیٹھی تھی۔

”جی ممانی! آپ نے مجھے بلا پاتھا؟“ فریال نے سعادت مندی سے پوچھا تو ممانی کو تو ایک دم جیسے سانپ ہی سونگھ گیا ہو۔ ان خواتین کی اب ساری دلچسپی شزاء سے مفقود ہو کر فریال کی سمت مرکوز ہو گئی تھی اور وہ گہری نگاہوں سے فریال کا جائزہ لے رہی

تھیں پھر انہوں نے باقاعدہ فریال کو پکار لیا اور ساتھ بٹھا لیا اور فریال سے مختصر سوال پوچھنے لگیں۔ فریال گھبرائی سی سوالوں کے جواب دینے لگی۔

”ارے بہن! یہ ہیرا کہاں چھپا رکھا تھا۔ ماشاء اللہ کس قدر حسین ہے۔ نگاہ ہی نہیں لوٹی چہرے پر سے۔“ خواتین اپنی خوشی کا برملا اظہار کرنے لگیں۔

”فریال! جاؤ تمہیں مگن میں کچھ کام تھا شاید۔“

نمائی حالات کی کایا پلٹ پر بہت کڑھ رہی تھیں اور پہلو پر پہلو بدل رہی تھیں مگر بے بس تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا فریال کو یہاں سے غائب کر دیں۔ فریال نمائی کے ساتھ اتنے عرصے میں رہ کر ان کے اشارے سمجھنے لگی تھی۔ ان کی تنبیہ پر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور سیدھی باہر نکل آئی مگر ان خواتین کے دل سے نہ نکل سکی اور ان خواتین کو فریال اس قدر بھاگنی کہ شزاء کی جگہ فریال کا ہاتھ مارتے لگیں۔ نمائی نے طریقے سے سوچ کر جواب دینے کا کہہ کر بات ختم کر دی۔

فریال نے بتایا بھی کہ حیدر نے بلایا تھا مجھے مگر شبانہ آپ نے صاف کہہ دیا۔

”اس گھریلو سیاست میں میرے بچوں کو استعمال نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔“ یوں بھی یہاں تھا ہی کون جو اس کی بات سنتا اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

”جاؤ دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ اپنے زخمی وجود اور زخمی روح کے ساتھ اسٹور نما کمرے میں آگئی جو یہاں اس کا مستقبل ٹھکانا ٹھہرا تھا۔ چھلنگا سی چار پائی بچھادی گئی تھی۔ وہ اپنے بستر پر ڈھسی گئی اور گرم سیال آنسو تکیہ بھگونے لگے۔ نارسائی کا گہرا دکھ اس کی ذات میں نمود ہو گیا تھا۔ یہی آہٹ پر وہ چونک سی گئی۔ دانیال تھے۔ ٹرے اٹھائے ہوئے اندر کی جانب آگئے۔

”فریال! میں جانتا ہوں تم صبح سے کاموں میں لگی ہو اور بھوک ہوگی، میں امی کی طرف سے تم سے

معافی مانگتا ہوں پلیز یہ کھانا کھا لو.....“

فریال اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی روٹی روٹی سوچی آنکھیں وکھ کر دانیال نے دل میں گہرا دکھ محسوس کیا۔

”پلیز آپ یہ کھانا لے جائیں مجھے بھوک نہیں ہے۔“ فریال نے بے دلی سے جواب دیا۔

”اگر تم نے کھانا نہ کھایا تو میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے بھی بھوکا مارو گی کیا؟ حیدر نے سب کے سامنے اعتراف کر لیا ہے کہ اسے شزاء خالہ اور فریال خالہ میں سمجھ نہ آئی کہ کس کو بلانا ہے۔ یوں یہ ساری غلط نہی ہوئی تھی۔ ابھی شزاء آئی ہی تھی ڈرائنگ روم میں کہ ادھر تم بھی آگئیں۔“

دانیال دھیرے دھیرے اسے ساری بات بتانے لگے۔ دانیال کے دل میں فریال کے لیے گہری محبت تھی، یہ سلسلہ تو جانے کب سے تھا شاید جب احساس کی پہلی کوہنل ان کے دل میں پھوٹی تھی یہی اسی لمحے فریال کا نام ان کے نہاں خانوں پر رقم ہو گیا تھا پھر انہوں نے فریال کو کھانا کھلا کر ہی دم لیا۔ کھانا کھاتے کھاتے فریال کی نگاہ دانیال کے چہرے پر پڑی تو وہ ایک دم گھبرا سی گئی گہری نظروں کی پیش محسوس کر کے وہ بہت پرل ہو گئی تھی۔ کتنے رنگ کتنے جگنو تھے ان ڈارک براؤن آنکھوں میں، وہ مزید سکت نہ پاتی تھی۔ ان نگاہوں میں دیکھنے کی اس کی نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔

”او کے تم کھانا کھاؤ آرام سے میں چلتا ہوں۔“ دانیال نے اس کی فطری شرم محسوس کر لی تھی۔

☆.....☆

نیا طلوع ہونے والا دن بھی گزشتہ دنوں کی طرح ہی تھا۔ کچھ نیا پن نہ تھا۔ وہ صبح خیزی کی عادی تھی۔ سو نماز فجر میں جائے نماز بچھائے خاصی دیر تک بارگاہ ایزوی میں سر بسجود رہی۔ آنسو بہتے رہے اور اس کا وجود لرزیدہ پتے کی مانند کانپتا رہا۔ مالک

کائنات رب دو جہاں کو بتانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا اس کے پاس وہ تو جانتا تھا اس کے پاس صرف آنسو تھے جو بارگاہِ خداوندی میں بہتے چلے جا رہے تھے۔ دل ہلکا ہو گیا تو جائے نماز قرینے سے طے کر کے رکھی۔ اپنے کپڑوں کی سلوٹوں کو سیدھا کرتی وہ باہر کی جانب چل دی۔ ماموں جان ناشتے سے پہلے چائے کا کپ پیتے تھے۔ اس نے چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا۔ اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پلٹ کر دیکھا تو دانیال تھے، گہری ڈارک براؤن آنکھوں میں نہ جانے ایسا کیا رقم تھا کہ اس کی نگاہیں شرم کے بوجھ سے جھکتی چلی گئیں۔

”آپ کو کچھ چاہیے تھا؟“ فریال کی آواز نے ان کا سارا بھر توڑ دیا تھا اور وہ چونک سے گئے۔

”ہاں! ایک کپ چائے۔“ دانیال نے مسکرا کر کہا۔

”جی“ فریال نے کہا۔

”سنو.....“ وہ ہمتن گوش تھی۔

”خوش رہا کرو، حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ جلد یا بدیر بدلتے ضرور ہیں۔ وعدہ رہا ایک دن تمہارے اچھے دن ضرور آئیں گے۔ تمہیں مجھ پر یقین تو ہے نا؟“ دانیال کی خمیر آواز میں بہت کچھ تھا۔ آس، امید، دلاسا اور آنے والے کل کی نوید۔ وہ صرف سر جھکا کر رہ گئی وہ یہ کہہ کر کے نہیں تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے چکن سے باہر نکل گئے۔

شزاء کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ لڑکے والوں کو کہلوا دیا گیا تھا کہ فریال کی بات بچپن سے ہی طے ہے یوں یہ بات ختم ہو گئی اور شزاء کے لیے ان لوگوں نے ہاں کا عندیہ دے دیا۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں کیونکہ کچھ دن بعد ہی لڑکے نے واپس امریکہ چلے جانا تھا۔ بات بے بات کھلکھلاتی شزاء اچانک ہی بہت ہنس مکھ ہو گئی تھی۔

ہر وقت خوشگوار موڈ میں رہنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ فریال سے بھی ہنس کر بات کر لیتی تھی۔ چند دن پہلے ہی شزاء کو ماپوں بٹھا دیا گیا تھا۔ شزاء کے اصرار پر ہی مماتی جان کو فریال کے لیے کپڑے لینے پڑ گئے۔ ورنہ ان کو تو یاد تک نہ تھا کہ فریال بھی اس گھر میں رہتی ہے۔ وقت بہت کم تھا۔ یہ فرض دانیال کے ذمے سونپ کر وہ بری الذمہ ہو گئیں تھیں۔ جس قدر معمولی رقم انہوں نے فریال کے کپڑوں کے لیے دی تھی اس میں شادی کے موقع کی مناسبت سے لباس ملنا ناممکن تھا۔ دانیال نے اپنی طرف سے رقم شامل کر کے نہایت عمدہ طرز کے دو قیمتی سوٹ فریال کے لیے خریدے، جو سلیے سلوائے تھے، وہ بے حد خوش تھے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے فریال کے لیے کچھ خریدا تھا۔

دانیال نے وہ شاپ فریال کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”دیکھو تو سہی اگر پسند نہ آئیں تو میں پھینچ کر دوں گا۔“ دانیال کے سامنے اس نے شاپ کھولا۔ دو سوٹ تھے ایک سرسئی کا مدار سوٹ تھا دوسرا پرپل کلر کا نفیس سا کڑھائی کا کام والا سوٹ تھا۔ دونوں بہت ہی قیمتی اور خوب صورت لباس تھے۔ فریال کی آنکھیں شکر کے جذبات سے بھر آئیں۔

”بہت ہی اچھے ہیں۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ وہ براہ راست اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بری طرح پریشان ہو گئے۔

”ہر بات پر رونا اچھی بات نہیں ہوتی ہے پاگل لڑکی، اب اچھی طرح تیار ہونا۔“ دانیال نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ دانیال واقعی اس کے لیے خلوص بھرے جذبات رکھتے تھے۔ ورنہ باقی سب رشتے تو مجبوری کے تھے اور مجبوریاں تو اس کے مقدر میں اسی دن لکھ دی گئیں تھیں جب شیفت ہتے وجود ہا با جانی کی صورت اور ماما بھری خوشبو لیے امی کی ہستی اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چل دی تھی، خوشیوں کے

بدلے لازوال دکھوں کا سوا طے ہو گیا اور والدین سے دائمی جدائی جیسے عم کا کوئی پداوا ہی نہ تھا۔ شزاء کی بارات شادی ہال میں آئی تھی، شزاء ریڈ کارڈ مار سوٹ لہنگا میں واقعی بہت اچھی اور خوش لگ رہی تھی۔ فرراز بھی خوب لگ رہا تھا۔ فریال شزاء کو دیکھ کر بہت مطمئن تھی۔ کیونکہ اس کی ذات شزاء کی خواہشوں میں رکاوٹ نہ بنی تھی۔ شزاء اور فرراز ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کا فوٹو سیشن ہوا پھر مووی میکنگ ہوئی اور سبھی فرزاد اولہا دلہن کے ساتھ بیٹھ رہے تھے۔ فریال نے پرل سوٹ زیب تن کیا تھا۔ لڑکیوں میں سے کسی من چلی لڑکی نے فریال کو پکڑ کر لپ اسٹک لگا دی تھی۔ وہ یوں بھی بہت حسین تھی مگر اپنی ہی تیاری کے بعد نہایت جاذب نظر لگ رہی تھی۔ دانیال، فریال کے حسن جاوداں میں کھو سے گئے تھے۔ انہیں آج بہت فخر ہو رہا تھا کہ فریال ان کی چاہت ہے۔ دانیال کن اکھیوں سے فریال کو دیکھتے اور زیر لب مسکراتے رہے۔ یہ سب کچھ ممانی جان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ انہیں آنے والے خطرات کا نمل از وقت اندازہ ہو رہا تھا۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ان کا اکلوتا سپوت فریال کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے اور ان کو دانیال کی نظروں کے تعاقب میں فریال کا دمکتا وجود بھی دکھائی دے رہا تھا۔ فریال نے جس قدر قیمتی لباس پہن رکھا تھا اس کے پیچھے دانیال کی چاہت کو بھی وہ بخوبی سمجھ چکی تھیں۔

مگر ایسا موقع نہ تھا کہ وہ اپنے غصے کا اظہار بر ملا کرتیں، بالآخر شزاء ماں باپ کی دعاؤں کے سائے تلے رخصت ہو کر پیادئیں سدھا رہی۔ گھر ایک دم ہی سونا سونا سا لگنے لگا تھا۔ شانہ آپی بھی شام تک اپنے گھر جانے کے لیے تیاری کر رہی تھیں۔ ہر سو جامہ خاموشی چھائی تھی۔ پھر یہ خاموشی ممانی جان کے ایک زلزلے سے ٹوٹ گئی۔ ان کا فیصلہ تھا

کہ فریال کو ابھی اور اسی وقت ماموں اس کے دوھیال میں چھوڑ کے آئیں۔ ماموں جان عجیب کشمکش کا شکار تھے۔ ایک طرف عزیز بھانجی تھی اور دوسری طرف بیگم تھیں۔

”بس بہت ہو چکا سال بھر کا کہا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ عمر بھر کے لیے سینے پر مونگ دلنے کے لیے آئی ہے۔“ ممانی ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر با آواز بلند بول رہی تھیں۔

”ارمی نیک بخت کچھ تو خوف خدا اول میں رکھ، وہ یتیم و بے آسرا بچی کہاں جائے گی؟ دو وقت کی روٹی کے سوا کیا مانتی ہے وہ، پھر وہ میری ذمہ داری ہے میں سگا ماموں ہوں اس کا۔“ ماموں جان فریال کی وکالت کر رہے تھے مگر لہجہ اس قدر کمزور تھا جیسے خود پر یقین ہی نہ ہو کہ وہ یہ منوا بھی سکیں گے کہ نہیں۔

”یہ میرا آخری فیصلہ ہے یہ لڑکی اب مزید اس چھٹ کے حقے نہیں رہے گی۔“ ممانی جان نجانے کیوں اتنی سخت دل ہو گئیں تھیں۔ ہر دلیل ہر جواز ان کے سامنے بے سود تھا۔

مگر دانیال سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے فی الوقت وہ خاموش تھے کہ ماموں جان تو بول ہی رہے تھے اپنی بھانجی کے حق میں۔

”ابو! ای بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور پھر ہم نہیں چاہتے کہ اس لڑکی کی منحوسیت کا سایہ ہم سب پر پڑے۔“ شانہ نے جاہلیت سے کہا۔ دانیال کو یہ بات سخت ناگوار خاطر گزری۔

”ای جان! میں کانی عرصہ سے آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا۔ کسی اچھے موقع کے انتظار میں تھا۔ میرا خیال ہے آج وہ موقع آن پہنچا ہے میں فریال کو اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ اب وہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں اسی گھر میں رہے گی۔“

گئیں۔ فریال جو دوسرے کمرے میں موجود یہ ساری باتیں سن رہی تھی کمرے میں داخل ہو گئی اور اپنے دوپٹے کے کنارے سے انگلی لٹپٹنے لگی۔

”ممائی جان! میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں بھی اپنے چچا کے یہاں جانا چاہتی ہوں اور دانیال بھائی نے جو کہا وہ بھی میں نے سن لیا ہے مگر میرے دل میں ان کے لیے کوئی جذبہ نہیں ہے اور نہ ہی میں ان سے شادی کی خواہاں ہوں۔ یہ ان کا یکطرفہ فیصلہ ہے جو مجھے منظور نہیں میں ابھی اور اسی وقت چلنے کو تیار ہوں۔ چلیں ماموں جان مجھے ابھی چھوڑ آئیں۔“

فرید صاحب اپنے بیٹے کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ تک رہے تھے وہ ایک پل میں ہی جان چکے تھے کہ ان کا بیٹا فریال کی محبت میں کس قدر آگے بڑھ چکا ہے۔ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ زہرہ بیگم نے طمانیت کا سانس لیا اور ایک فاتحانہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر رقصاں تھی۔ یہ بات جیت کا چکر تھا۔ نہ جانے کس کی مات تھی اور کس کی جیت۔

☆.....☆

یہ ایک چھوٹا قصبہ تھا۔ کوئی گنجان آباد جگہ نہ تھی۔ سرشام ہی لوگ سو جاتے تھے۔ وہ بہت طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد یہاں پہنچی تھی۔ یہاں غربت و افلاس کا ڈیرا تھا۔ وہ اس کے بابا کے کزن تھے۔ دور پرے کے چچا جن کی اپنی سات اولادیں تھیں اور وہ خود معذور ہو چکے تھے اور پنشن پر گزارا ہوتا تھا۔ ایسے میں ایک اور وجود کا اضافہ ان لوگوں کے لیے سخت گراں گزارا ہوگا۔ ماموں جان نے اس کے چچا کو معقول رقم بطور خرچہ دی جسے بہت اصرار کے بعد چچا جان نے قبول کر لیا۔ فریال کے سر پر چچا جان نے ہاتھ رکھ کر دعاوی۔ فریال کو اب یاد آ رہا تھا کہ وہ بابا جانی اور ای کے ساتھ بہت عرصہ قبل یہاں آ چکی ہے مگر تب چچا جان معذور اور اس قدر ضعیف نہ تھے چچی جان نے اسے کمرہ دکھایا۔ کل دو ہی

دانیال نے بالآخر وہ بات کہہ دی جسے عیاں کرنے سے وہ خود بھی ڈرتے تھے کہ فریال کی زندگی پہلے ہی کس قدر کٹھن دشوار گزار تھی۔ ان کی محبت کے معلوم ہونے کے بعد حالات مزید نہ بگڑ جائیں۔ ماموں جان کے چہرے پر خوشی کے رنگ رقصاں تھے۔ انہیں اپنے بیٹے سے اتنی اچھی بات سننے کی شاید توقع نہ تھی مگر وہیں زہرہ بیگم نے سخت برا منایا۔

”دیکھ رہے ہیں آپ، آپ کی عزیز از جان بھانجی نے کیسے ڈورے ڈالے ہیں میرے بیٹے پر۔ کس قدر بے شری سے ماں کے سامنے اظہار محبت کر رہا ہے یہ تربیت کر کے مری ہے اس کی ماں۔“

زہرہ بیگم نے سخت لہجے میں کہا۔

”ای! مجھے فریال نے کچھ نہیں سکھایا میں تو خود دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سب کہہ رہا ہوں۔ آپ کا اور سب گھروالوں کا ناروا سلوک تو میں کافی عرصے سے دیکھ اور برداشت کر رہا ہوں مگر فریال کے کردار کے حوالے سے کوئی بات کرے میں یہ قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔ اس معصوم کو تو معلوم بھی نہیں کہ میں اسے کتنی شدتوں سے چاہتا ہوں۔“ دانیال کا لہجہ جذبات کی شدت سے بھاری ہو گیا تھا۔

”تو یہ زہرہ بھرنی رہی ہے وہ تمہارے دل میں ہم سب کے خلاف۔“ زہرہ بیگم کا غصے سے برا حال تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دھکے دے کر فریال کو گھر سے بے دخل کر دیں۔ فرید صاحب کبھی بیوی اور کبھی بیٹے کا منہ تک رہے تھے۔ وہ اس نئی صورت حال سے سخت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

”آپ ابھی اور اسی وقت اس منحوس کو چلتا کریں، ورنہ میں خود اسے دھکے دے کر باہر نکال دوں گی۔“ ممائی جان کا طیش سے برا حال تھا۔

”ای! میری بھی ایک بات سن لیں اگر آپ نے ایسا کیا تو میں ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ زہرہ بیگم بیٹے کے الفاظ سن کر جہاں کی تہاں رہ

کمروں کا یہ مکان تھا۔ ایک میں بچا اور چچی کے علاوہ تین لڑکے سوتے تھے اور دوسرے کمرے میں چار لڑکیاں پہلے ہی سوتی تھیں جہاں اس کے لیے کچی گنجائش نکال دی گئی۔ بڑی کا نام سحر پھر مہک، شفق اور مہوش تھا۔ سب نہایت لطف سا لڑکیاں تھیں۔ سحر نے فریال کو ایک تھالی میں ساگ اور لٹی کی روٹی لاکر دی۔ فریال کو یاد آیا کہ اس نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب رات ہو چکی تھی اس نے باہر صحن میں آ کر نلکے کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔

فریال نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو تروتازگی کا احساس اجاگر ہوا۔ پھر کمرے میں آ کر اللہ کا نام لے کر اس نے کھانا کھانا شروع کیا بے حد لذیذ ساگ تھا۔ اس نے پوری روٹی کھائی اور رب کریم کا شکر ادا کیا جس نے ہر طرح کے حالات میں بھی رزق عطا کیا، کچھ دیر بعد چچی کمرے میں آئیں تو وہ باادب ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے طائرانہ نظروں سے فریال کا جائزہ لیتی رہیں، پھر گویا ہوئیں۔

”بیٹیا! میں بھی چار بیٹیوں کی ماں ہوں اور اللہ سے ڈرتی ہوں خدا بھی کسی پر بھی برا وقت نہ لائے۔ ہمیں تمہارے آنے سے کوئی مسئلہ نہیں جو یہ بچیاں کھاتی ہیں تم بھی کھالیا کرو مگر صرف ایک بات یاد رکھنا اس گھر کی عزت کو اپنی عزت خیال کرنا۔“ چچی جان کونہ جانے کون سے خوف لاحق تھے مگر وہ ان کی تسلی کی خاطر بس اتنا ہی کہہ پائی کہ ان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ رات گئے اسے کسی وقت نیند آئی تھی۔ نئی جگہ نیا ماحول اور تنہائی کا احساس غالب تھا۔

صبح مہوش اور دو لڑکے اسکول پڑھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ بڑی لڑکیاں گھر کی صفائی سہرائی کرنے لگیں اور بڑا لڑکا مکینک کا کام جانتا تھا۔ وہ کام پڑھا گیا۔ فریال نے گھر کے کام کرنے کی حتی

الوسیع کوشش کی مگر وہ لوگ خود ہی اپنے کام کرنے کے عادی تھے۔ یوں اسے فراغت ہی فراغت رہی۔ کچھ دن تو وہ یہ سب دیکھتی رہی پھر اس نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ اس گھر کے حالات سنوارے گی۔ یہاں اسے حقیقی اپنائیت اور عزت ملی تھی وہ بھی اس گھر کے مکینوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ سو ایک دن جب بچے اسکول جانے لگے تو اس نے بھی چچی سے اجازت طلب کی، انہوں نے بہ خوشی اجازت دے دی وہ اپنی اسناد ساتھ لے کر چل دی۔ بچوں کو کلاس روم میں چھوڑ کر وہ خود آفس میں آگئی۔ عمر رسیدہ نیک دل خاتون اسکول کی پرنسپل تھیں۔ اس نے اپنی اسناد کی فائل سامنے رکھ دی۔ جسے دیکھ کر پرنسپل نے بہت سراہا اور معقول تنخواہ کی پیشکش کی۔ فریال بے حد خوش تھی۔ یوں اس کی زندگی نے ایک نئی جہد اپنالی۔ صبح کے وقت وہ جاگ کر تھی اور شام کے وقت وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی، جس دن اسے پہلی تنخواہ ملی اس نے آ کر وہ چچی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ منظر دیکھ کر چچی بہت آبدیدہ ہوئیں۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوشیوں کی دعا دی۔ فریال کی آنکھیں بھی نم تھیں، سارا دن تو مصروفیت سے گزر رہی جاتا تھا مگر رات کو جب بھی بستر پر سونے کے لیے لیٹتی تو دو ڈارک براؤن آنکھیں شکوہ کناں ہو جاتی تھیں۔ ان آنکھوں کے جگنو نہ جانے کیوں میر جھائے سے لگتے۔ وہ اعتراف محبت سے ڈرتی تھی مگر یہ وہی جانتی تھی کہ وہ بھی کتب عشق میں داخل ہو چکی ہے، ایک نام تھا جو اس کے دل پر نقش ہو چکا تھا۔ ”دانیال“۔

فریال کے جانے کے بعد دانیال کی زندگی جیسے تھم سی گئی تھی۔ سو گوار بیت چار سو پھیلی تھی۔ غم، جہراں نے اس کو اذیت ناک پلوں سے دوچار کر دیا تھا۔ زیست میں نارسانی کا یہ روگ نیا تھا، جہاں محبت کو پانے کی چاہ اور طلب کا سوال بن کر بھی وہ تپتے صحرا

کی مانند پیاسا تھا دانیال صبح کا گھر سے نکلتا تو شام ڈھلے ہی گھر لوٹا تھا اور اپنے کمرے میں بند ہو جاتا، اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا دل نہیں کرتا تھا۔ جتنا وقت بھی گھر میں بسر ہوتا سخت تکلیف وہ ہوتا ہر طرف فریال چلتی پھرتی دکھائی دیتی۔

فریال سے اس صحبت کا یہ نا طہ آج سے تو نہیں جڑا تھا، بہت سال پہلے جب وہ پھوپھا جان کی طرف جاتا تو فریال سے بھی ڈھیروں باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی معصوم باتیں دانیال سے شیئر کرتی تھی۔ اس کے اسکول میں آج کیا ہوا اس کی کتنی فرینڈز ہیں۔ وہ بھی تنہائی سے تنگ آتی تھی۔ اس کا بھی دل کرتا تھا کہ وہ کسی سے ڈھیروں باتیں کرے۔ اس لیے جب کبھی دانیال آتے وہ ان سے فرینڈز کے قصے تک شیئر کر لیا کرتی تھی۔ دو یونیاں کے فرائک میں کسی گڑیا کی مانند ادھر ادھر بھاگتی وہ فریال ان کو بے حد عزیز تھی۔ اسے پھوپھی جان کا گھر ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا پھوپھی جان بھی دانیال کو بہار سے ہر شے کھلاتی رہتی تھیں مگر دانیال کی امی جتنی دیر وہاں ٹھہرتیں تھیں ان کا انداز احساس عظیم کرنے کے مترادف ہوا کرتا تھا۔ انہیں پھوپھی کا یہ انداز نرا دکھانا ہی لگا کرتا تھا۔ پھر ان لوگوں کا پھوپھا جان کے گھر جانا خاصا کم ہو گیا۔ کافی عرصے سے اس کی جل پری سے بھی ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ جب عرصہ کے بعد جانا ہوا تو وہ کول پری اب ایک اسپر میں بدل چکی تھی۔ اس قدر حسین اور جاذب نظر ہو چکی تھی۔ دانیال، فریال کے حسن جاوداں کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک جھجک سی تھی جو دونوں کے درمیان آگئی تھی۔ پھر جب کبھی بھی جاتے بس گا ہے بہ گا ہے فریال کو سکتے رہتے اور پھر واپس آ جاتے۔ دل میں شدت سے خواہش جاگی تھی کہ وہ فریال کو اپنی شریک حیات بنائیں مگر قبل اس کے کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا، اس کی پیاری پھوپھا دار قانی سے کوچ کر گئیں اور

وہی دانیال اب بے بسی کی تصویر بنا تھا اور فریال پر ہونے والے مظالم کو خاموش آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وہی فریال اب اس گھر سے بے وقعت اور بے عزت کر کے نکال دی گئی تھی۔ یہ نیا قدری فریال کی نہیں اور حقیقت ان کی اپنی ذات کی تھی۔ گھر کی ساکن نضا اور جامد خاموشی کو شزاء کی آہوں اور سسکیوں نے توڑا۔ شزاء کے سسرال والے فراڈ نکلے تھے۔ فیضان کی یکے بعد دیگرے شزاء سے پہلے پانچ شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ جہیز وغیرہ لوٹ کر سب کو طلاق دیتے رہے۔ بعض فیملیز سے باقاعدہ فراڈ کے ذریعے نقد رقم بٹورتے رہے۔ اب شزاء کو بھی گھر کی لاڈلی اور چھوٹی بیٹی سمجھ کر بہت کچھ دیا گیا تھا۔ وہ سب وہ لوگ بیچ باج کے فرار ہو گئے تھے اور طلاق نامہ دے گئے تھے۔ شزاء کا سارا زور بھی فیضان نے بہانے سے اپنے پاس رکھ لیا۔ فقط دو انگوٹھیاں تھیں جو شزاء کے ہاتھ میں رہ گئیں تھیں۔ شزاء کے آنسو گرتے رہتے تھے اور کبھی وہ بالکل جامد سکتے سی کیفیت کا شکار ہو جاتی تھی۔ زہرہ بیگم اس کو دیکھ دیکھ کر روتی تھیں تو شزاء ایک دن چلا ہی اٹھی۔

”امی! آپ کیوں روتی ہیں؟ یہ سب فریال کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے، ہم سب فریال کی بددعاؤں کے حصار میں ہیں، دیکھ لیں آپ نے فریال کی جگہ مجھے بیاہ دیا اور یہ سب ہم آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے میرے مقدر میں رقم کر دیے اور یہ تمہے طلاق کا طوق ملا ہے مجھے۔“

زہرہ بیگم کا دل دکھ سے پارہ پارہ تھا۔
 ”بیٹا! ایسا تو مت کہو۔“ اپنی سب سے لاڈلی اور چھوٹی بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر وہ بلک بلک کر رو دیں۔ ابھی تو دانیال کی خستہ حالی دیکھ کر ہی وہ دن رات کڑھتی تھیں۔ ان کے ہنستے مسکراتے بٹے کو روگ لگ گیا تھا اور اب شزاء وہ لاکھ پتھر دل سہی مگر دن میں ایک وقت ایسا ضرور آتا تھا جب ان کو بھی

فریال کی آواز کی صدا لگاتے لگاتے چونک جانا پڑتا تھا۔ فریال نے جس خوش اسلوبی سے گھر کو سنہال رکھا تھا اب وہ بھی دل سے اس بات کی قائل ہو چکی تھیں۔ اب شبانہ کے بھی روز کے چکر بند ہو چکے تھے۔ گھر میں ہر روز کی آمدورفت بند ہو گئی تھی۔ کیونکہ اب خدمتیں کرنے والی فریال یہاں نہیں ہوتی تھی۔

ابھی زہرہ بیگم انہی صدمات کو جھیل نہ پائی تھیں کہ شبانہ کے شوہر کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ خوب چوٹیں آئیں تھیں اسپتال میں فوراً لے جایا گیا۔ زہرہ بیگم شبانہ کو تسلیاں دے رہی تھیں مگر انہیں اپنی ہی آواز کھوکھلی لگ رہی تھی۔ اسپتال کے کوریڈور میں چلتے چلتے شبانہ تھک گئی تھی۔ ابھی تک اسفند آئی سی یو میں تھے اور ڈاکٹر زکچہ بتا نہیں رہے تھے۔ انہیں اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

”منہوس ہے یہ لڑکی، کھا گئی ہے اپنے ہی ماں باپ کو۔“

”ارے امی اس منہوس کو تو فارغ کریں سچ اس کی شکل دیکھ کر دل کو وحشت سی ہوتی ہے۔“ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ عداامت اور شرمندگی کے آنسو۔

”اگر آج اسفند کو کچھ ہو گیا تو کیا لوگ مجھے بھی منہوس کہیں گے۔ خدا نہ کرے۔“ دل کانپ کر رہ گیا۔ اور وہ بے ساختہ زار و قطار رونے لگی۔ زہرہ بیگم نے بڑھ کر شبانہ کو گلے لگایا۔

”حوصلہ کرو شبانہ!“

”امی! مجھے فریال کے پاس جانا ہے۔ اس سے معافی مانگی ہے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دوں گی میرے اسفند کو کچھ نہ ہو۔ اگر ان کو کچھ ہوا تو میں مر جاؤں گی امی۔“ شبانہ ہچکیوں سے رونے لگیں۔

بس ایک لمحہ ہی ہوتا ہے جو انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ یہ وہی ایک لمحہ تھا جس نے زہرہ

بیگم کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ یہ ظاہر بیٹی کے سامنے مضبوط چٹان کی مانند کھڑی تھیں مگر درحقیقت ان کا وجود ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ آج رب حقیقی نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ آج ان کا گھر آفتوں کی زد میں آ گیا تھا۔ کسی تنہیم اور بے آسرا کے سر پر ہاتھ نہ رکھنے اس کو ذلت سے گھر سے نکال دینے کی سزا بھی جو مل رہی تھی۔ اسی وقت آئی سی یو سے ڈاکٹر باہر نکلا۔

”اسفند صاحب کی حالت اب خطرے سے باہر ہے مگر خون خاصا بہہ چکا ہے اور چوٹیں بھی شدید آئی ہیں۔ وقت لگے گا انہیں مکمل صحت یاب ہونے میں۔“ شبانہ نے بے ساختہ اپنے آنسو پونچھے اور اس کے ہاتھ شکرانے کے انداز میں آسمان کی جانب اٹھ گئے۔

☆.....☆

اگر زندگی کو زندگی مل جائے تو وہ ایسی ہی ہوا کرتی ہے جیسے کہ اس وقت دانیال اور فریال کی تھی۔ آج ان دونوں کا دعوت ولیمہ تھا اور دونوں کے لب مسکرا رہے تھے۔ رب کریم نے آج دونوں کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا تھا۔ زہرہ بیگم اپنے بیٹے کی خوشی کس میں ہے بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھیں۔ اسی لیے ہاتھ پھیلائے اور فریال کو دانیال کے لیے مانگنے اس کی چچی کے یہاں گئی تھیں۔ ان غریب لوگوں نے بہ خوشی وہاں ہاں کر دی تھی۔ یوں یہ حسین ساعت دانیال اور فریال کا مقدر بن گئی تھی۔ دانیال مدہم مدہم گنگناتا رہے تھے اور فریال شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

”میرا گیت تم ہو میرا صدا ساز تم ہو
میری ہر خوشی کا آغاز تم ہو
جینے کی وجہ جو بھی رہی ہو
میری دھڑکنوں کی آواز تم ہو“

☆.....☆

رداڈ انجسٹ 161 فروری 2016ء

READING
Section

مومن شاہ

افسانہ

فکوری

”آداب“! معمول کے مطابق ”چاند میاں“ کی آمد پر گلناز نے چائے کی بڑی ٹرے میز پر رکھ کر ماتھے

Downloaded From
Paksociety.com

READ

SOCT

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

کالی گھٹاؤں جیسی زلفوں کے گھیرے میں اس کا سیاہ
چہرہ بھی غیر معمولی کشش یا پرکشش خال و خد سے
آراستہ نہیں تھا ہاں لیکن۔

بے کشش چہرے یہ سچی اس کی بڑی بڑی زندگی
سے بھر پور روشن سیاہ آنکھیں، جو گھنیری پلکوں کے
بوجھ سے جھکی رہتی تھیں، کبھی کبھار جو لمحہ بھر کے لئے ان
کی طرف اٹھتیں۔ تو صحیح معنوں میں چاند میاں کو تیر جگر
کے آر پار محسوس ہوتے۔ ناک میں چھلی کا ننھا سفید
نگ جب دائیں بائیں حرکت کرتا تو چاند میاں کو لگتا

تک ہاتھ لے جا کر ”میزبانی“ کی رسم ادا کی۔ جواب
میں ”چاند میاں“ نے ہمیشہ کی طرح سر ہلا دیا۔ لیکن
نظریں گلناز کے سر پے پہ جچی تھیں۔ جواب دلہا ریتیم کو
پان بنا کر دے رہی تھی۔ اسکا وہ کوئی حور پری نہ تھی کہ
چاند میاں جو اسم با مسمی تھے، دل تمام کر رہ جاتے، لیکن
پھر بھی نجانے کیوں سفید میٹ کے آنچل تلے کھلے
ہوئے اس کے کالی گھٹاؤں جیسے دراز بالوں میں ان کو
ایجاد ”گمشدہ“ مسافر کی طرح بھٹکتا ہوا محسوس ہونے
لگتا۔

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

گویا کالی گھوڑا رات میں ننھا سا تارا چمک کر رہی کر رہا ہو۔

وہ بازار حسن میں ”غزل“ کی غزلوں کا چرچا سن کر آئے تھے، غزلوں کی طرح ”غزل“ کے حسن کی بھی دھوم مچی ہوئی تھی مگر کیا کیجئے.....! غزل کی نازک اندامی، پری صورت، نازدادار آواز و انداز اپنی جگہ چکا چونک سہی۔ لیکن چاند میاں تو کوشھے پہ گاہکوں کو چائے پیش کرنے والی گلناز کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے۔ بے ناں حیرت کی بات! کہاں گلابوں جیسی ملائم اور چاندنی جیسی شفاف غزل..... اور کہاں تاریک چہرے والی نصیب کی کالک جیسی گلناز بلا مقابلہ جیت تو غزل کی ہونی تھی، جس کے شیدائی دل قدموں پر پھجھاور کرتے تھے، لیکن ہونی کو کون روک سکا ہے، چنچل غزل کم گو گلناز حرفِ گلوڑی سے مار کھا گئی تھی۔ وہ گلوڑی جو اسی کوشھے پر کسی پرانی طوائف کی بیٹی تھی۔ اور اب مہمانوں کو چائے پانی پیش کرتی تھی۔ یہ بات غزل کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ یہ شکست اس کا چین دقرار چھین کر لے گئی تھی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی، ایسا نہیں تھا کہ وہ مردانہ وجاہت کے حامل ”چاند میاں“ کو من میں بسنا بیٹھی تھی، بس گلوڑی کی جیت اور اپنے حسن کی ہار اور ناقدری پہ کڑھ رہی تھی۔ اس کا غرور ذات کا پندار کاری ضرب سے تڑخا جا رہا تھا۔ اور دماغ یہ سوچ کر چیخ رہا تھا کہ ”چاند میاں“ اس کی سریلی تانوں کے دوش پہ ”گلوڑی“ کا چوکھٹا نظروں میں بسائے بیٹھے مرد دھنتے تھے۔ غزل کے ناز و انداز اور رعنائیاں و دلربائیاں گلوڑی کی تھلی میں جھولتے گلینے کی چمک کے سامنے ماند پڑ گئی تھیں، اور وہ حسد کی آگ میں جل جل کر کوئلہ ہو رہی تھی۔ عاشقوں کے قصیدے آخر کار اسے پھر مرہم لگا گئے تھے، اور وہ چاند میاں کو بھول بھال کر بلکہ اپنی ناقدری کو پس پشت ڈال کر قدر دانوں پر دانوں، اور

دیوانوں کے ہجوم میں گم ہو گئی تھی۔ اور چاند میاں کئی دنوں کی طویل بحث اور ایک لاکھ کے عوض گلوڑی کو دلہنہ بیگم سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ گلوڑی کی روشن آنکھوں میں حیا کی ڈدریاں کھینچ گئی تھیں۔ چاند میاں سے کورٹ میرج کے بعد ”گلوڑی“ گلناز چاند بن گئی تھی۔ لیکن قسمت کا کیا کہیے کہ جب ”گلناز چاند“ نے چاند میاں کی ہمراہی میں گھر کی دلہنہ پر قدم رکھا تو بانو بیگم کلیجہ پکڑ کر رہ گئیں۔

”اے چاند میاں..... یہ ”گلوڑی“ کون ہے؟“
سسرال میں بھی اس کا سوا گت گلوڑی کے نام سے ہوا۔ شاید بانو بیگم کو اس کی تاریک پیشانی پر کالی کمان دار بھنوں کے درمیان ”گلوڑی“ کی بندیا شکارے مارتی نظر آ گئی تھی۔ یوں گلوڑی کی حیرانی پل بھر میں غائب ہو گئی۔ اور وہ جوئی نئی ”گلناز چاند“ بنی تھی۔ اس ناز کے خمار سے نکل کر دوبارہ گلوڑی بن گئی۔

”گلناز میری بیوی ہے، میا..... میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔“ چاند میاں نے نظریں چرا کر جواب دیا۔ بانو بیگم کے تلووں سے لگی سر پہ ہنسی تھی۔

”میاں! تمہیں اندازہ ہے کیا کہہ رہے ہو..... جاؤ اسے وہیں چھوڑ آؤ، جہاں سے لے کر آئے ہو۔“
”اب یہ ممکن نہیں ہے، میں گلناز کو نہیں چھوڑ سکتا، اگر آپ نے مجبور کیا تو ہم اسے چھوڑنے کے بعد دوبارہ شادی نہیں کریں گے۔“ خاصا کمزور لہجہ تھا۔

”کہاں تو چاند میاں شادی کا نام نہیں لیتے تھے اور کہاں گلناز کو بیاہ کر لے آئے۔ بانو بیگم کے لبوں پر خاموشی کے قفل لگ گئے۔ انہوں نے کالی چادر میں لپٹی گلوڑی، کو سر تا پا دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔ اور سر منہ لپیٹ کر چار پائی پر جا پڑیں۔ یہ صدمہ کم تو نہیں تھا، خاندان بھر کی تحسین و تہلیل لڑکیوں کو چھوڑ کر وہ بد صورت گلوڑی کو سر منڈھ لائے تھے۔ زمانے بھر کی باتوں کے خوف نے

رہیں۔

”نجانے غسل بھی اچھے طریقے سے کرنا آتا ہے یا نہیں“۔ وہ لبوں کو سی کر باغیچے میں چکراتی پھرتی۔ جب تھک جاتی تو غنڈھوں غنڈھوں کرتے کبوتروں کے کابک کے پاس کھڑی ہو جاتی۔ اسے سفید بے داغ نرم پروں والے کبوتروں کی سرخ ٹانگوں میں گھومتے سبز نیلے چھلے بڑے بھلے لگتے۔ کبوتروں کے ناز نخرے۔ اور ان کے بچوں کے چونچلے..... وہ انہیں دیکھ کر مسکراتی رہتی، پھر مٹی بھر جاتا تو مستانہ چال چلتے موروں کو دیکھ کر خوش ہو جاتی۔ موروں کا ناچ اسے پسند تھا، اور اس کے پیر بھی تو مور جیسے ہی تھے۔ یا شاید ان میں اوزنگوڑی میں رنگوں کی خوبصورتی کا فرق تھا، یہ سوچ کر وہ ہنس پڑتی، اور آنکھوں کے خم گوشے دوپٹے کے پلو سے صاف کر لیتی۔ اور ایک بار پھر موروں کا رقص اشتیاق سے یوں دیکھتی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ رنگین پنکھوں کی رنگینی میں اسے اپنے غم بہت پھیکے پڑتے محسوس ہونے لگتے۔ تخت پر چھالیہ کترتی ہانو بیگم اسے ”خپلی“، ”دیوانی“ اور ”پاگل“ کے القابات سے نوازے جاتیں، واحد چاند میاں کی محبت اس کے لئے جس میں باد صبا کا جھونکا بھی۔ لیکن یہ جھونکا بھی اکثر اوقات ہانو بیگم کی تیز نظروں کی نذر ہو جاتا۔ اور وہ چاند میاں کی پیشی نظروں سے جی بہلا لیتی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی چاند میاں مجبور تھی لیکن اسے پوری سچائی کے ساتھ چاہتے ہیں۔ انہیں امید تھی کہ ہانو بیگم، گلناز کو قبول کر لیں گی۔ قبولیت کا یہ انتظار سولی پر لٹکنے کے مترادف تھا۔ چاند میاں چوری جیسے اسے صبر کرنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ وہ بھلی لوگ صبر کی تلقین کی خاص ضرورت مند بھی نہ تھی۔ کیونکہ صبر تو اس نے پیدائش کے ساتھ ہی کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس کا معمولی وجود کوٹھے والوں کے لئے بھی کھوٹا سا تھا۔ خیر جو بھی تھا

ان کا بلڈ پریشر Low کر دیا تھا۔
”چاند میاں نے شادی کر لی، وہ تو شادی کے نام سے بدکتے تھے۔ جس نے بھی سنا انگشت بدنداں ہو کر رائے زنی کرنے لگا۔

”اب 42 ویں سن میں شادی کی سوچھی تو..... اے چاند کیا چھو کر یوں کا کال پڑ گیا تھا، خاندانی شرافت و نجابت کا ذرا بھر لحاظ نہ کیا۔ دو دن تک محلے اور خاندان والیوں کا تانتا بندھا رہا، ہر کوئی گلوڑی کو یوں دیکھتا جیسے منڈی میں ترہانی کا بکرا پسند کرنے آئے ہوں۔ کوئی ہاتھ پیروں پر تھمرے کرتا تو کوئی چہرے کی رنگت پر، کم عمر شوخ لڑکیوں نے تو ”ٹیمیز اینڈ لولی“ استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور گلوڑی سر نہ ہواڑے خاموشی سے سب سنتی رہتی۔ گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو، ہانو بیگم سب کے ساتھ مل کر خوب ہنسی ٹھٹھول میں شامل ہو کر قسمت کو روتی رہیں، اور کہیں۔

”کالی شب اور اچلے چاند کا بھلا کیا جوڑ؟ کیسا سنگم؟“ دو روز بعد حالات معمول پر آ گئے تھے۔ چاند میاں تو جنرل اسٹور پر چلے جاتے اور وہ بولائی بولائی سنی خاندانی حویلی میں پھرتی رہتی۔ کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی ہانو بیگم اسے کسی کام کو ہاتھ لگانے دیتیں۔ ان کا کہنا تھا۔

”تیرے ہاتھوں کی میل اتر کر برتنوں اور کپڑوں کو ناپاک کر دے گی“۔ وہ من ہی من میں حیران ہوئی تھی۔ آج تک اس نے تو اپنے ہاتھوں کی میل اترتے نہیں دیکھی تھی۔ اور نہ ہی دلہیا بیگم نے کبھی ایسا کہا تھا۔ ہانو بیگم کا فرمان تھا۔

”سب کام صرف خاندانی عورتیں ہی کرتی ہیں اور تم کام کرنا کیا جانو۔“ سو ہانو بیگم خاندانی ملازمہ کے ساتھ مل کر کام میں جتی رہیں اور اسے دیکھ کر بڑبڑاتی

ایسی جہیں پر ثبت تھی۔ شگفتہ حسن کا ایسا ہتھیار تھی، جس کے جلوے اچھے اچھوں کے ہوش اڑادیں، انہوں نے چاند میاں کو مٹھی میں کرنے کے ہزار ہا جتن کئے لیکن چاند میاں تو اپنی چکوری کے دیوانے تھے۔ شگفتہ کے حسن کی بھول بھلیاں انہیں گھوڑی کے سحر سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں، شگفتہ تلملا کر کہتی۔

” کالا جاو سر چڑھ کر بولتا ہے۔“ گھوڑی ہر دار چپکے سے سہ جاتی۔ شمع کی طرح جلتی رہتی، اور ملازمہ کے ساتھ عام سی کینز بنی شگفتہ کے ہاتھوں مذاق کا نشانہ بنتی رہتی۔ چاند میاں کو بہت اکسایا کہ ”گھوڑی آپ کے قابل نہیں ہے۔ حضور اسے طلاق دیجئے۔“ لیکن چاند میاں کی ایک چپ۔ وہ شگفتہ کے حسن کے جال اور طراری کی چال میں ہرگز نہیں آئے تھے۔ وہ بھلے قیمتی پشائیں، زیورات سے لد کر سامنے آ جاتی تاہناک حسن روشنیاں بکھیرتا، وہ توجہ نہ کرتے اور محویت سے گھوڑی کی سیاہیوں کو تکے جاتے۔ جس کی ٹھہلی کا سفید گمینہ آج بھی بھولے ہوؤں کو راستہ یاد دلاتا تھا، بھٹکے ہوؤں کی رہبری کرتا تھا۔ شگفتہ رانی اس اذیت ناک زندگی سے تنگ آ چکی تھی، ایک طرف گھوڑی من جلاتی تھی اور دوسری طرف بیمار فالج زدہ میاں..... کے احکام سے ناگوار گزرتے۔ بانو بیگم چاہتی تھیں اب گھوڑی کام نہ کرے بلکہ خاندانی بہو شگفتہ رانی کام کاج انجام دے۔ نوکر بننا اسے کب گوارا تھا وہ تو محلوں میں رانیوں کی طرح رہنے کے لئے دنیا میں آئی تھی۔ بانو بیگم اس سے وارث چاہتی تھیں۔ مگر رپورٹ کے بعد پتہ چلا وہ ” بانجھ“ تھی..... بے شجر ثمراتی کامل اور یہ کی! قدرت کے بھی کھیل نرالے ہیں۔ بانو بیگم نے چپ سادھ لی، کچھ ہاتھ نہ آیا تھا، کوئی مقصد پورا نہ ہو سکا۔ اور شگفتہ بھی کون سی مطمئن تھی، دو سال بمشکل گزار کر آزادی کا پروانہ تھا مے شکر کرتی مے روانہ ہوئی تھی، گھوڑی کو بھلا

بانو بیگم میں اگر خاندانی شرافت و نجابت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ تو ”صبر و شکر“ کا مادہ قدرت نے ”گھوڑی“ میں لبالب بھر رکھا تھا۔ وہ عبادتوں میں مصروف ہو گئی، لمبی لمبی دعاؤں میں نجانے کیا مانتی رہتی، پھر یوں ہوا کہ بانو بیگم کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی، ان پر فالج کا ایک ہوا، خاندانی عورت بستر کی ہو کر رہ گئیں، اور گھوڑی کی محتاج بھی..... گھوڑی نے ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ رکھی۔ سب خاندانی کام گھوڑی کے ہاتھوں انجام پانے لگے۔ بانو بیگم خاموش تماشاخی بنی دل ہی دل میں جلتی رہتیں۔ بہترین علاج کے بعد اتنا ضرور ہوا تھا کہ بانو بیگم جو قوت گویائی سے محروم ہو گئی تھیں، اب کچھ نہ کچھ بول لیتی تھیں۔ وہ ”بول“ گھوڑی پر طنز و طعن کے نشتروں کے سوا کیا تھے؟ خیر گھوڑی خاندانی کاموں کے کرنے کو اغزاز سمجھتے ہوئے سب کچھ سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتی۔ اسے خوشی تھی، کہ وہ پالی کے سرخ منقش منکوں کو اپنے ہاتھوں سے بھر کر موہنے کے بار ان کے گلوں پر سجاتی ہے۔ بانو بیگم کا پانہ ان تیار کرنی ہے اور تو اور چاند میاں کی محبت و قربت کے جھوٹے دالہانہ ریشم کی طرح گدگداتے ہیں۔ وہ رب کا شکر ادا کرتی تھی۔ چاند میاں اسے دیکھ کر مسرور ہوتے تھے آج بھی ان کے دل میں گھوڑی کی محبت جوں کی توں قائم تھی۔ میا کی مناسب دیکھ بھال نے اس کی ”قدر“ میں اضافہ کیا تھا۔ لیکن انہوں نے میا کو بستر پر بھی چھین نہ پڑا، اور وہ چاند میاں کی دوسری دہن کی تلاش میں اپنی ہمشیرہ کو دوڑانے لگیں۔ چاند میاں کے دونوں انکار پر بھی انہوں نے کمر کس لی تھی۔ جذباتی باتوں، وارث کی خواہش قسموں کے حربے آزما آزما کر انہوں نے چاند میاں کو منا کر دم لیا۔ چاند میاں کی دوسری نصف بہتر شگفتہ اپنے نام کی طرح شگفتہ تھی۔ خوبصورتی کا کامل نمونہ، نزاکت کا عکس..... اور سب سے بڑھ کر خاندانی ہونے کی مہر اس کی چاند

سوت کے آنے جانے سے کیا فرق پڑتا، اسے تو ہر حال میں گھوڑی بن کر جینا تھا۔ گھوڑی کی اس خزاؤں جیسی زندگی میں بہارتب آئی جب اس کا پیر بھاری ہوا، پہلی بار اس کا من چاہا وہ خوشیوں کے چند دسے میں بیٹھ کر چاند میاں کے ہمراہ افق کے پار اتر جائے، یا دودھیا ”آسمانی چندا“ کو چھو آئے اور کچھ نہیں تو موروں کی طرح رقص کرے یا پھر غزل کی طرح کوئی غزل گائے۔ چاند میاں کو ادا میں دکھائے، لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہ کر سکی، لاج کے رنگوں سے تھمتے چہرے کو ہاتھوں کی اوک میں چھپا کر وہ بس اتنا کہہ سکی۔

”پروردگار ہمیں صاحب اولاد کرنے والا ہے“ اور چاند میاں نے گھوڑی کے ہاتھوں کو دیوانہ وار تھام کر دارقلمی سے چوما تھا۔ گھوڑی نے شرما کر ہاتھ چھڑائے اور چاند میاں نے اس کی نیم سیاہ پیشانی پر روشن ”لمس“ عطا کیا، گویا یہ خاندانی ہونے کی سند ہو۔

”میاں گلنا ز شمر بار ہو گئی ہے، آپ کا وارث دنیا میں آنے والا ہے۔“ چاند میاں نے جب بانو بیگم کو بتایا تو وہ کراہ اٹھیں۔

”کیا..... ہمارا وارث گھوڑی کے نطن سے جنم لے گا، چاند میاں تم اس کو ختم کر دو..... ہم میں مزید صدمہ اٹھانے کی سکت نہیں ہے، کالے پیلے وارث مجھے نہیں چاہئیں، مجھے خاندانی عورت کے وجود سے تمہارا وارث چاہئے۔“ گھوڑی نے سسکیوں کو بمشکل گھونٹا۔ جانے اب کیا ہوگا؟ لیکن چاند میاں اس کی ڈھال بن گئے۔ اس کی ماتا کا خون ہونے سے بچ گیا وہ پہلی بار مضبوط لہجے میں بولے۔

”بھلے کالا ہو یا گورا وہ میرا خون، میرے جگر کا گلزا، میرا وارث ہے، کوئی باپ اپنی اولاد کو موت کے گھاٹ بد صورتی کے خوف سے نہیں اتارتا، میں ہرگز بھی اس قبیح فعل کو انجام نہیں دوں گا۔“ گھوڑی نے شکرانے کے

نفل پڑھے۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب گھوڑی گل گھومتے بچے کی ماں بن گئی۔ بچہ کیا تھا چاند کا گلزا، ہو بہو چاند میاں کا عکس۔ روئی کے گالوں کی طرح نرم۔ چاند کی طرح اجلا، سرمئی آنکھیں کھول کر جب میا کو دیکھا تو ساری کثافتیں دھل گئیں..... بانو بیگم کے سارے خوف و خدشے، فکریں ختم ہو گئیں۔ انہوں نے شادمانی کے ساتھ منے کو گود میں لینے کی فرمائش کی۔ تو چاند میاں نے سر در ہو کر منا بانو بیگم کی گود میں ڈال دیا۔ میا حیرانی سے بولیں۔

”اے گھوڑی! یہ کیسا کارنامہ تو نے انجام دیا، سچ بتائیو، اتنا سندر بچہ تیرے وجود سے کیسے پیدا ہوا؟“ گھوڑی تمام درد بھلا کر ہلکا سا مسکرائی۔ ماتا کا نور اس کے چہرے کو اجال رہا تھا، چاند میاں اسے محو کر دیکھ رہے تھے ان کی آنکھیں گھوڑی کو آزمائش ختم ہونے کا پیام دے رہی تھیں۔ گھوڑی نے متانت سے جواب دیا۔

”میں روزانہ سورہ یوسف کی تلاوت کرتی تھی۔“ بانو بیگم وارث ملنے کی خوشی میں بے اختیار کہنا لگیں۔

”آج سے میں تمہاری بھی میا ہوں، اور ہماری گلنا تو بڑی بھاگوان ہے۔“ بانو بیگم کا کہنا تھا کہ گھوڑی ہتے ہتے بے حال ہو گئی۔ وہ اتنا ہنسی کہ آنکھوں میں آنسو اٹھائے۔

”بیگم صاحب! مجھے گھوڑی رہنے دو، کہوٹاں۔ گھوڑی۔“ یہ کہہ کر وہ ہنستی جاتی تھی۔ پٹھلی کا جگینہ حرکت کرتے کرتے کہیں گر گیا تھا، بانو بیگم حیرانگی سے اس کی پاگلوں والی حرکتیں دیکھ رہی تھیں، چاند میاں پر شرمندہ اور اداس بیٹھے تھے کیونکہ چاند میاں سمجھ گئے تھے کہ رہبری کا تارا کھو گیا ہے..... اور گھوڑی بھاگوان ہونا سہا نہیں پائی اس لئے جی تو وزن کھوپٹھی ہے۔

.....☆.....

شہلا گل سحر صالح

افسانہ

سجیت دکھ وینزلے

جذبات کے مدوجز میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے، آنسو
منجھد ہو جاتے ہیں، آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں، آنسو

دل و دماغ کی جنگ بھی عجیب شے ہے، سوچیں
آبشار بن کر دل پہ گرتی ہیں بوند بوند دل کو پگھلاتی ہیں،



READING
SECTION

قطرہ قطرہ اندر گرتے ہیں مگر دل سے زیادہ ضدی کوئی چیز نہیں ہے، نہ اس کے جذبات میں فرق آتا ہے، اور نہ اس کی دماغ سے مفاہمت ہوتی ہے، چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا ہے مگر پورے کروفر سے پورے وجود پہ حکومت کرتا ہے۔ انسان بھی اکثر اس لوتھڑے کے ہاتھوں بے بس نظر آتا ہے۔ اشمیل پوشع بھی تو اس دل کے ہاتھوں خوار ہوتی تھی۔ شادی کے بعد پوشع سے اس کی محبت دینی ہو گئی تھی، مگر پوشع درانی کی والہانہ محبت بلکہ دھواں دار عشق پہ سرد کہریوں جتنا جارہا تھا وہ یہ نہیں جانتی تھی، حالانکہ اس کی شادی کو صرف دو ماہ ہی ہوئے تھے۔

شادی سے پہلے وہ پوشع کے نرم گرم جذبوں سے پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر وہ اسے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ وہ اس کا جنون تھی، اب ایک عام عادت بن گئی تھی، اشمیل کی کزنز اور فرینڈز اس پر رشک کرتی تھیں، چاہے برتھ ڈے ہو یا ویلنٹائن، عید ہو یا کوئی خاص موقع، پوشع اس کے لئے تحائف کے انبار لگا دیتا، اس کی پسند کی چاکلیٹ، چپس، اساوٹ کے ڈھیر لگے ہوتے اس کے پاس، دنیا کی ہر خوبی وہ اس کے قدموں میں لا کر رکھ دینا چاہتا تھا، سبھی اشمیل کو اس کی دیوانگی سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ خود بھی

پاک سوسائٹی

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

یوشح کے عشق میں گوڑے گوڑے ڈوبی ہوئی تھی، مگر ہر چیز کی زیادتی نقصان کا سبب بنتی ہے۔ وہ یہ بات بھی جانتی تھی۔

”دیکھو اشمہل! شادی سے پہلے سارے جذبات لٹا دیئے جائیں تو بعد کی زندگی پھسکی پھسکی رہتی ہے، اتنا یوشح کے آگے مت جھکو، بل از وقت کہ اس کے دل میں تمہاری کشش برقرار نہ رہے، اس کی بھی مانو اور اپنی بھی منواد۔ بعض اوقات دوریاں فربتوں کو بڑھا دیتی ہیں، اور بعض اوقات فربتوں میں ہی دوریاں جنم لیتی ہیں، بعد کے پچھتانے سے احتیاط کا دامن تھامنے رہنا بہتر ہے۔ اس کی چچا زاد جینی اکثر اسے سمجھاتی۔

”مگر یوشح کی ہٹ دھری کے آگے وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سرنگوں ہی رہتی۔ اس نے رخ موڑ کر ایک نظر بے خبر سونے یوشح پر ڈالی۔

”اشمہل! میں سوچتا ہوں کہ شادی کے بعد تم ہر رات کو میرے پہلو میں ہوگی تو نیند کس کافر کو آئے گی۔“ یاد کا ایک کوڑا لہرایا اور ایک اداس آنسو اس کی پلکوں سے ڈھلک کر اس کے گریبان میں جذب ہو گیا۔ اس کی نیند کہیں کھوی گئی۔ اس کی بھگتی سوچیں اور ماضی کی سلگتی یادیں اسے ماضی کی بھول بھلیوں میں لے گئیں۔ اشمہل لغاری کا تعلق ایک بھرے پرے اور خوشحال گھرانے سے تھا، وہ ایم اے اکنامکس کی فاضل ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

ایک گھر کے دو پورشن میں دو فیملیز رہائش پذیر تھیں ایک حصے میں اشمہل اپنے والد ہمایوں لغاری والدہ لوز دو جڑواں بھائیوں حسن اور احسن کے ہمراہ رہتی تھی۔ اور دوسرے پورشن میں اس کے چچا ماموں لغاری اپنی مسز اور دو بیٹیوں مینی اور نائمہ اور دو بیٹیوں حبیہ اور مومن کے ہمراہ رہتے تھے۔ ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر صنیہ پھپھو کا گھر تھا۔ جن کے ہزبینڈ کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا اور وہ اپنے بڑے مٹے یوشح اور دو بیٹیوں ارم اور کرن کے ساتھ آسودہ زندگی گزار رہی تھیں۔ یوشح ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا، ارم گریڈ کالج میں

لیکچرار اور کرن بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اشمہل کے والد اور چچا کا شراکت میں لیدر کا کاروبار تھا، اور زندگی ہر وہ سے مبرا تھی، ان سب گزرتوں میں بہت پیارا اور اتفاق تھا۔ اشمہل کی بچپن ہی سے یوشح سے بات سے طے تھی وہ اس کا بے حد دیوانہ تھا۔

☆.....

”اشمہل اترو نیچے کوئی اور کام بھی ہے کہ نہیں نماز بھی قضا کر دی، کم سے کم شام کے کھانے میں تو میری مدد کر دو۔“ ای کی پکار پہ اشمہل گڑبڑا گئی۔

”بس ناں یوشح بند کرو ناں فون، دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے ہیں، ہمیں بات کرتے ہوئے۔“ وہ یوشح کی کال آنے پر گزشتہ دو گھنٹوں سے اوپر چھت پہنچ رہی تھی۔

”نہیں یازا بھی میرا دل نہیں بھرا کہہ دو اپنی والدہ محترمہ اور میری پیاری ممانی جان سے کہ میں کسی غیر سے نہیں اپنے شوہر سے بات کر رہی ہوں۔“

”آپ دن بھر بھی مجھ سے بات کرتے ہیں، اور رات میٹ پر بھی کسی چیٹ کرتے ہیں، گھر والے ناراض رہنے لگے ہیں۔“ اشمہل روہا سی ہو گئی۔ یوشح کی دقت بے وقت کال کی وجہ سے وہ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر پاتی تھی، نہ کھانا کھا سکتی نہ نماز پڑھ سکتی نہ کسی فنکشن پہ جا سکتی۔

”اوکے، اوکے زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں، اس قدر عاجز آگئی ہو تو پھر فون نہیں کروں گا۔ میرے پیار کو تو تم دیسے بھی مذاق بھگتی ہو۔“ فون کھٹاک سے بند ہو گیا۔ اور اشمہل سر تھامے رہ گئی۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ تھوڑا سا آرام کی غرض سے لیٹی تھی کہ سیل پہ بختے دالی ٹیون نے اس کا موڈ خراب کر دیا۔ اس نے اسکرین پہ نمبر چیک کیا۔ اس کی ماموں زاو عطیہ آپی کا فون تھا اس نے بولی سے کال پک کی۔

”ہاں اشمہل گڑیا! کیسی ہو؟“ عطیہ آپی کی کھٹکتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”ٹھیک ہوں آپی! آپ اپنی سناٹیں۔“ اس نے بھی

قاریلیٹی نبھائی، نیند سے آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ رات لیٹ آدھ تک یوشخ سے بات ہوتی اس کی نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔ صبح کلاس میں لیکچر بھی اس کے سر کے پر سے گزر جاتے تھے۔

”ڈیڑر پھپھو کا نمبر بہت ٹرائی کیا مگر بند جا رہا ہے۔ میں تم لوگوں کو انوائٹ کرنا چاہ رہی تھی، کہ پرسوں صبح 9 بجے کی فلائیٹ سے ابو اور ای جی سے آرہے ہیں اور سیکنڈ ٹائم ہم نے دعوت رکھی ہے، آپ سب نے ضرور آنا ہے۔ عطیہ آپ کی بات کے دوران ہی یوشخ کا لنگ اشارٹ ہو گئی، ڈر کے مارے اس نے کال ڈراپ کر کے یوشخ کی کال پک کر لی۔

”کیوں نمبر بڑی تھا کس سے بات کر رہی تھیں۔“ یوشخ کی حوصلہ آواز اس کے کان سے لگرائی۔

”وہ بڑے ماموں کے گھر سے کال تھی وہ لوگ جج سے آرہے ہیں، تو انوائٹمن دے رہیں تھیں۔“ وہ بے تصور ہو کر بچی گڑ بڑائی۔

”میں نے تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ تمہارے سیل پر صرف میری کال آنی چاہئے اور بس کسی اورے غیرے کی نہیں۔“ یوشخ نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ چپ ہو گئی اس کا یہ لہجہ اس کا دل کاٹ کے رکھ دیتا تھا۔

”اور ہاں سنو آرام سے اپنے گھر رہو۔ جانے کی ضرورت نہیں، جمنی آجائے گی تمہارے پاس۔“

”مگر یوشخ..... ای تھا ہوں گی۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”بس کہہ دیا سو کہہ دیا کوئی بحث نہیں۔“ ساتھ ہی فون ڈسکنٹ ہو گیا۔

.....☆.....

بلکے فیروزی آٹھ کئی فراک جس کے گلے اور دامن پر سلور کلر کے نگوں کا فینسی کام ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور سلور کھسے پہنے اشمبل بلکے میک اپ اور شو لڈر کٹ ہالوں کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تھی، وہ لوگ دعوت کے لئے نکلنے ہی والے تھے کہ اشمبل کو بہت زور

سے چکر آیا، اور وہ ادھر ہی بیٹھ گئی، ای بری طرح گھبرا گئیں۔ فریق سے جوں نکال کر اسے پلایا۔

”اشمبل اطمینت زیادہ خراب ہے تو پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ ای نے اس کا سر دبا دیا۔ تو بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

”نہیں ای! آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی، آپ جائیں ماموں لوگ خفا ہوں گے۔ میرے پاس جمنی ہے نا۔“ وہ جمنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئی۔ تو جمنی نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ کیا مذاق ہے اشمبل ہے۔ تم نے یوشخ کی خاطر چچی کو چند لمحوں میں کتنا پریشان کر دیا۔ وہ اب وہاں بھی مطمئن نہیں ہو سکیں، بولو یوشخ کہ ابھی تم ہاں کے گھر ہو تم پر روک ٹوک کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ جی ٹیسٹ کا بہانہ، کبھی پیٹ درد کبھی بخار، کتنا جھوٹ بولو گی اس بے مردت کے لئے، سارے رشتے اس کے لئے تم تیاگ رہی ہو۔“ جمنی تہائی ملنے ہی اس پر تڑھ دوڑی۔ اس نے تم آنکھوں سے جمنی کی طرف دیکھا جس کا صاف مطلب تھا، کہ وہ یوشخ کو کسی قیمت پر بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کال قتل کی آواز پردوں چوٹیں۔

”میں دیکھتی ہوں چچی ہوں گی شاید کچھ بھول گئی ہوں، تم مرو ادھر۔“ جمنی نے تیزی سے باہر نکل کر گیٹ کھولا، تو یوشخ کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ غصہ تو بہت آیا کہ وہ تین کھری کھری سناوے۔ مگر اشمبل کی وجہ سے خاموش رہی۔

”مخترمہ مرا سقبے سے باہر آ کر اندر آنے دیں گی آپ۔“ یوشخ نے اسے گم صدم دیکھ کر طنز کیا۔

”چچی لوگ نہیں ہیں گھر پر دعوت پر گئے ہیں۔“ دروازے سے ہٹتے ہوئے اسے جتا دیا۔

”میں اپنی بیوی سے ملنے آیا ہوں آپ کو کوئی اعتراض۔“ اس نے جمنی کو چڑایا۔

”وہ اپنے کمرے میں ہے۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”نوسٹرو ہونے کا سنی ادا کر کے ذرا آپ چائے اور پکوڑے بنانے کا اہتمام کریں گی میرے لئے موسم بھی بڑا خوشگوار ہو رہا ہے۔“ یوشع نے مزے سے آرڈر کیا۔ تو حتمی پیر پختی کچن میں چلی گئی۔ وہ پلیٹیں موندے لپٹی تھی۔ فیروزی کمر اس پر بہت اٹھ رہا تھا۔ خوبصورت چہرہ، ہلکے پھلکے لوازمات کے ساتھ وہک رہا تھا۔ براؤن سلکی بال اس کے چہرے پر بکھرے تھے۔ یوشع نے بکے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ بغیر آہٹ اس کے پاس آیا، اور جھک کر اس کے ماتھے سے بال سمیٹتے ہوئے آہستگی سے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ شامل نے تڑپ کر آنکھیں کھولیں۔ کلون کی مہک اس کی سانسوں میں اتر گئی تھی، گل رنگ چہرے اور دھڑکن کو سنبھالے وہ بستر سے اتر کر یوشع سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی، اس نے اپنا دوپٹہ اچھے سے پھیلا لیا۔ یوشع سے نظریں ملانا سخت مشکل لگ رہا تھا، یوشع نے سارا منظر پیار سے دیکھا اور تھوڑا اس کے پاس آیا اس کا ہاتھ تھام کر کچھ کہنا چاہا کہ اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

”یوشع مجھے قبل از وقت یہ سب پسند نہیں، پلیز خفامت ہونا۔“ اٹھل پھل دھڑکنوں کو سنبھالتے وہ رخ موڑ گئی۔ مگر میرا تم پر پورا حق ہے شامل۔“

”کون سا حق آپ کا اور میرا فی الحال کوئی ایسا شرعی رشتہ نہیں ہے۔“ یوشع کی بات اس نے کافی، ناں کے ساتھ جھوٹ بولنے پر پہلے ہی سے اسے غصہ آیا ہوا تھا۔

”آپ رخصتی لیں پھر مجھ پر ہر قسم کا حق جتا میں۔“

”اوہ تو ٹھیک ہے جو کام چھ مہینے بعد طے پانا تھا، اب انشاء اللہ اسی ہفتے کے آخر میں انجام پذیر ہوگا۔ بہت جلد آپ شامل یوشع بن کر میری ماہیوں کی قید میں ہوں گی۔“ یوشع نے اچھتی نظر شامل کی پشت پر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ چائے بنانی حتمی نے یوشع کے خطرناک تیور دیکھے تو چوہا بند کر کے شامل کے لئے بھاگی۔ جو حتمی کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ اور حتمی کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے تھکنے لگی۔

یوشع نے جو کہا وہ کر دکھایا، ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ روتی دھونی شامل یوشع بن کر اس کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ اس کا ایگزیم ادھورا رہ گیا۔ ساری رسموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اب یوشع کا انتظار کر رہی تھی۔ گلاب اور موٹیے کے پھولوں سے مزین بیج اور کمرے کی ڈیکوریشن، بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے ایک اچھتی نظر اپنے کمرے پر ڈالی اور بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگالی۔ قدموں کی آہٹ پر وہ جلدی سے سیدھی ہوئی اور گھونگھٹ میں چہرہ اور بھی جھک گیا۔ یوشع آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”خوش آمدید مزہ شامل یوشع اپنے وعدے کے مطابق ہم اپنے دل کے ساتھ ساتھ اپنے روم اور اپنی زندگی میں بھی آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔“ یوشع نے اس کے ہاتھ تھامے اور وہ خوبصورت گولڈ کے نگین پہنا دیئے۔ اس کے زرتے ہاتھ یوشع نے مضبوط گرفت میں لے لئے۔ اس کا شعلہ جوالہ روپ یوشع کو شرارت پر اکسار رہا تھا۔ عروسی لباس اور ہار سنگھار سے آراستہ شامل یوشع کی استحقاقہ نظروں اور بے باک جسارتوں سے جیسے چھوٹی موٹی بن گئی۔

”شامل یوشع کیا اب میں آپ کو شرعی حق سے چھو سکتا ہوں۔“ ساتھ اس کے چہرے پر جھک کر جو اس نے بے باک جسارت کی، تو شامل کے تو حیا سے ہوش ہی اڑ گئے۔

”پلیز یوشع! شامل نے سے دھکیلنا چاہا مگر اس کی مضبوط گرفت میں بے بس ہو گئی۔ یوشع کی گرم گرم سانسوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے اس کے سینے میں منہ چھپا لیا اور اس کی سرگوشیاں پوری رات اس کے کانوں میں رس گھولتی رہیں، سارے گلے شکوے دور کہیں کھو گئے تھے۔ شادی کے چند دن یوشع کے طلسمی لمس میں کھو کر اسے کچھ نہ پتہ چلا۔ مگر دھیرے دھیرے یوشع کے مزاج میں تبدیلی آنے لگی۔

”ہر چیز اس وقت تک نایاب ہوتی ہے جب وہ گرفت میں نہ ہو حصول کے بعد اور ملکیت مننے کے بعد وہ عام ہو جاتی ہے۔“ تھوڑا دیر سے اٹھنے پر پوش کی باتیں شروع ہو جاتیں۔

”مسز پوش اٹھ جائیں نمازیں تو ویسے بھی بخشوائی ہوئیں ہیں آپ نے کم سے کم میری ماں کا ہاتھ ہی بنا دیا کریں۔“ اس کا طنز یہ لہجہ سے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ وہ تو اس کے بے تحاشہ پیار کی عادی تھی۔ روٹین میں آ کر اس نے پھپھو کے ساتھ سارے گھر کی ذمہ داری سنبھال لی۔ صبح کام ختم کر کے پھپھو عبادت میں لگ جاتیں تو وہ نی وی کھول کر بیٹھ جاتی یا پھر گھر فون کر لیتی۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ پوش پھر سے اس سے باتیں کر کے گھنٹوں محو گفتگو رہیں۔ مگر پوش نے آفس ٹائم فون پہ سخت منع کیا تھا۔

”محترمہ! گھر داری میں دل لگاؤ اب ویسے بھی میں آپ کے نام ہی لکھا جا چکا ہوں۔“ وہ آرام سے جان چھڑا لیتا۔ ایک رات جب پوش لیپ ٹاپ پر آفس ورک کر رہا تھا تو اس نے پوش کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اتنا کہا۔

”پوش! ہم تنی مون پر کب جائیں گے؟“
 ”یار میرے پاس ٹائم نہیں ہے، آفس میں کام بہت ہے اور ویسے بھی مجھے یہ ٹائم اور پیسوں کا زیاں ہی لگتا ہے۔“ پوش نے لیپ ٹاپ پر نظریں ہٹائے بغیر کہا۔
 ”مگر شادی سے پہلے تو آپ نے کہا تھا۔“ اشمل نے کہنا چاہا مگر اس نے سختی سے بات کاٹ دی۔

”اشمل! شادی سے پہلے والا چیپٹر کلوز کرو اور ہاؤس وائف بن کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالو، مجھے ایک پرفیکٹ اور سمجھدار بیوی چاہئے کوئی الٹا روشینہ نہیں۔“ اس کی تیز آواز پر اشمل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے بے اختیار ہمتی کی بات یاد آ گئی۔

”کہ شادی سے پہلے کی محبت اس طرح، جیسے انظار ہی سے پہلے کوئی روزہ انظار کرے، انظار کا مزہ بھی

نہ ہو، اور گناہ کا بھی مستحق ہو۔ کفارے کا خرچ بھی اور سزا کا دھڑکا بھی ہو۔“ کفارہ تو اشمل کو عمر بھر بھرتا تھا۔ اپنے عزت نفس کی قربانی دے کر۔ اس شخص کے ہاتھوں ذلت اٹھا کر اس کے ساتھ ہی زندگی جینی تھی، پوش نے اپنے جذبے اس پر شادی سے پہلے ہی لٹا دیے تھے، اب اس کو گھرا کے وہ فالتو چیز سمجھ کر بھول گیا تھا۔ اس رات کے بعد اس نے خود کو بہت بدلی لیا۔ زیادہ وقت پھپھو اور پھر ارم کرن کے ساتھ گزارنی۔ اس نے پوش سے مخاطب ہونا کم کرو یا خاموشی سے اس کے سارے کام کر دیتی تھی۔ میسجے جانی تو وہ بھی مہمانوں کی طرح ٹریٹ کرتے، امی زیادہ نہ روکتیں کہ پھپھو اکیلی ہوں گی۔ حمنی کے کندھے پر سر رکھ کر پوش کی شکایت کی۔ تو اس نے سہولت سے سمجھایا۔

”شوہر کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے، اگر تم پوش بھائی میں شادی سے پہلے والا پوش ڈھونڈتی ہو۔ تو یہ تمہاری سب سے بڑی غلطی ہے، پہلے تم اس کی محبوبہ اور اب تم اس کی بیوی ہو، محبوبہ کے ناز اٹھائے جاتے ہیں، اور بیوی سے ناز اٹھوائے جاتے ہیں۔ تم اس کی پسندنا پسند پر۔ حمان و۔۔۔ ان کا خیال رکھو تو وہ خود بخود تمہاری طرف مائل ہو جائیں گے۔“ حمنی کی باتیں اس نے پلو سے باندھ لیں۔ وہ پوش کا ہر کام وقت سے پہلے کر دیتی، اس کے آگے چھتھے گھومتی اس کی پسند کا کھانا بناتی۔ تب کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ خود کہیں کھو گئی ہے۔ بس اسے دوسروں کو خوش رکھنا تھا اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر۔

.....☆.....

پھپھو کے ساتھ اب وہ خود بھی باقاعدگی سے نماز پڑھتی، فارغ وقت میں اسٹڈی سے جا کر اسلامی کتب کا مطالعہ کرتی، اسے دکھ ہوتا تھا کہ شادی کے بعد اس نے ڈھنگ سے کوئی نماز نہیں پڑھی تھی شادی سے پہلے بھی پوش کے فون کی وجہ سے اس کی کئی نمازیں قضا ہو جاتیں تھیں۔
 ”شاید عشق حقیقی پہ اس نے عشق مجازی کو ترجیح دی

تھی۔ "شادی سے پہلے یوشع کی دیوانگی کے ہاتھوں حقوق اللہ کی کوتاہی کرتی تھی۔ اور شادی کے بعد وہ بیگانگی کی وجہ سے اپنے رب کو خفا کرتی تھی۔ اس کی زندگی صرف ایک شخص کے گرد گھوما کرتی تھی۔ جس کی خاطر اپنے رب کے احکامات کی بجا آوری میں سستی کی۔ اپنے خوئی رشتوں کو نظر انداز کیا۔ جھوٹ بولے، مگر اس شخص نے ہی اسے اس کی اوقات دکھادی۔

"شیطان نے تو نہ قتل کیا نہ زنا کیا۔ نہ شراب پی نہ جوا کھلا صرف ایک سجدے کے ہاتھوں رب کی نظر میں ذلیل و ملعون ٹھہرا اور وہ کتنے سجدوں کی خطا وار تھی۔ وہ اپنے رب سے کیسے معافی مانگے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی چاہت میں منہ کے بل گرا کر اپنی چاہت اور اپنے ہونے کا یقین دلا پاتھا۔ وہ نماز میں خشوع و خضوع سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونی، اپنی غیر حاضری کی معافی مانگتی، وہ ہر چھوٹے بڑے گناہ کی معافی مانگتی۔ اپنے نفس کے تابع ہو کر جو نافرمانی کی، رب کی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش میں بھیگ کر بھی ایک کلمہ شکر ادا نہ کیا، دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اس کے لبوں پر یہی دعا تھی۔

"اے اللہ میری نظر کو بد نظری اور نفس کو کام دے، مجھے سکون دے، مجھے اپنی رحمت کے سائے میں رکھ اور راضی رہ۔ عبادت سے دل کو جیسے سکون ملنے لگا۔ کچھ دنوں سے اس کی طبیعت بو جھل بو جھل تھی، اس دن بھی سب کے جانے کے بعد اس نے گھر کی صفائی کی مشین لگا کر کپڑے دھوئے، اور کھانے کا کام نمٹا کے استری بھی کر لئے۔ پھر ٹھہرا حال سی پھپھو کے پاس تخت پر ہی لیٹ گئی۔ پھپھو نے ذکر کے بعد اس پر پھونکا، اور دعا میں دیں، اس کا رنگ زرد اور آنکھیں ویران لگ رہیں تھیں۔ پھپھو نے اسے آرام کے لئے بھیج دیا۔ وہ یوشع کے رویے کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گئی، جانے کتنے ناگم بعد جیز روشنی نے اس کی حساسیت بیدار کی، اور جھکے سے اٹھ بیٹھی، سر میں ابھی بھی ہلکا ہلکا درد

تھا۔ یوشع سامنے صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ "ارے آپ کب آئے۔" اس نے سائیڈ سے دوپٹہ لیا اور نیچا تر کر سلپ پر پہنے۔ "محترمہ کو آرام سے فرصت ملے تو شوہر کے آنے کے وقت کا پتہ چلے۔" یوشع نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "اصل میں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اور کام بھی آج زیادہ تھا۔" اس نے کہنا چاہا مگر۔

"کام کام اور بس کام، ٹھیک ہے میں کل وقتی ایک ملازمہ رکھ لیتا ہوں کہ آپ کی اس کام سے جان چھوٹ جائے۔ ویسے بھی آپ کو آرام سے فرصت نہیں ملتی، تو آپ مجھے یا میرے گھر والوں کو کیا سنبھالیں گی۔ اپنی ماں کے گھر تشریف لے جائیں، جب طبیعت بحال ہو جائے تو واپس آ جائے گا، اور اگر یہاں دل نہیں لگتا تو ساری عمر کے لئے ہی وہاں چلی جاؤ۔" یوشع زہر انگلیا کمرے کا دروازہ تیزی سے بند کرتا باہر نکل گیا۔

"اشمل نے دونوں ہاتھوں سے سر تھما جو بری طرح ٹھکم رہا تھا آنکھوں میں سادون جھڑی لگی تھی، اور شیخ عبدالقادر جیلانی کا پڑھا ہوا قول اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

"اے شخص تو جس سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اس سے جدا کر دیا جاتا ہے، بھی جدائی، بھی موت تو بھی غلط بھی کے بنا پر، اے نادان تو تو وہ خوش قسمت ہے جس پر اللہ نے غیرت کھائی ہے۔ اللہ تجھے اپنے لئے چاہتا ہے، اور تو غیر کا ہونا چاہتا ہے، ہوش کر ایسا جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہ ٹھہرے۔ تو غیر کے پیچھے بھاگے گا اللہ تجھے اس کے ہاتھوں توڑے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کا ہو جائے گا تو ساری مخلوق تیرے قدموں میں ہوگی، تیری محبتیں اور آسائشیں تجھے لوٹا دی جائیں گی۔ اور جس سے تو محبت کرتا ہے۔ وہ تیرے لئے روئے گا۔ مگر تیرا دل بے نیاز ہو جائے گا۔" ایک فیصلہ کر کے وہ اٹھی چند جوڑے بیگ میں ڈالے۔ اور پھپھو کے کمرے میں آگئی۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا، اور خنکی بڑھ گئی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پھپھو نے اشمیل کی طرف دیکھا، شدت ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوچ رہی تھیں۔
 ”پھپھو! میں اسی کے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ باوجود کوشش کے بھی اس کی آواز اندھ گئی۔ سر عجیب بھاری ہو رہا تھا۔

”بیٹا! بات گھر سے نکل جائے تو بڑھ جاتی ہے، غلط نہیں کو گھر کے اندر ہی ٹھہرنا چاہئے۔“ پھپھو نے اس کے ہاتھ سے بیگ لے کر اسے اپنے ساتھ لگایا، وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی، ان دنوں کا غبار باہر نکال پھینکنا چاہتی تھی، مگر اچانک پوری دنیا اسے اندھیری نظر آنے لگی اس نے ایک چیخ ماری اور پھپھو کے بازوؤں میں جمبول گئی۔ ہاسپٹل کے کارڈیڈور میں، ٹہلتے اس کے پیارے پریشانی سے صرف ایک سوال کر رہے تھے، کہ زندگی سے بھرپور ہنسی مسکرائی اشمیل کو نبڑوں بریک ڈاؤن کیسے ہو سکتا ہے۔ اور یوش تو مجرم بنا ہوا تھا اپنے مہمیر کا اپنے پیاروں کا، پھپھو نے اسے خوب سنائی تھیں، اور ناراض بھی ہوئیں، دفتر کے کام اور اپنی خود ساختہ سوچوں سے اچھتے ہوئے اس نے اپنی متاع حیات خود ہی لٹا دی تھی۔ اس خوف کی وجہ سے وہ اشمیل سے یہ رویہ رکھتا، کہ دوسروں کی طرح وہ بھی اسے اس سے جدا کرنے پر مجبور نہ کرے، یا اپنی من مانی نہ کرے۔ اس کی اشمیل U.C.I میں تھی، اور اس کے گرد اس کی اسی، اس کا بس، اس کی چاہت شرارتیں، اس کا مہکتا وجود الوژن بن کر ساتھ ساتھ تھا۔ سب کی دعا میں رنگ لائیں، اور اشمیل کو ہوش آ گیا، ساتھ میں ڈاکٹر نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے، صدقات کی بارش کر دی گئی، ہر شخص کے چہرے پر سچی خوشی کی چمک تھی، ہوش میں آنے کے بعد اس کی نظریں سب کے چہروں پر پڑیں، ہر ایک شخص اس کی خوشی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ اسی نے اس کی پیشانی چومی۔ ابو کے ہاتھ میں تکی ویر تک اس کا ہاتھ تھا۔ پھپھو نے کتنے روپے اس کے سر پر وار کے یتیم خانے بھجوا دیئے، اور وہ دشمن جاں آنکھوں

میں ندامت اور ویرانی لئے اس کے پاس ہی کھڑا تھا، چہرے پر صدیوں کی تنگن بتا رہی تھی کہ اشمیل کی محبت کا درخت پٹ جھڑ سے گزر کر پھر سے ہرا بھرا ہونے لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اشمیل کی آنکھیں کھول کر یوش کے دل سے بھی گردوغبار ہٹا دی تھی۔ سب کے باہر جانے کے بعد وہ اشمیل کے پاس بیٹھا، اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔ تو کتنے آنسو اس کی ہتھیلی پر گرے۔ اشمیل نے تڑپ کر یوش کی طرف دیکھا۔

”تم جس سے محبت کرو گے پھر وہ تمہارے لئے روئے گا۔“ اس کے ذہن میں ایک جھمکا ہوا گویا اس کے رب نے اس کو معاف کر دیا تھا، تب اس نے بھی یوش کو معاف کر دیا دل سے، کیونکہ اس کی نافرمانی اور خطا میں یوش کی خطا سے بہت بڑی تھیں، پھر بھی رب نے اس کی محبتیں اور نعمتیں اسے واپس لوٹا دیں۔ یوش نے اس کی پیشانی پر لب رکھ کر جیسے اس کی ہتھیلی منانی چاہی تو اشمیل نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

”جان یوش! آج کے بعد ایک پل کے لئے بھی تمہیں خود سے الگ نہیں کروں گا، کہ تمہاری پل بھر کی جدائی میں، میں نے صدیوں کی مسافت طے کر لی، بس ایک بار مجھے معاف کرو۔“ یوش نے بے ساختہ اپنے کان پکڑے۔

”بہت کیوٹ لگ رہے ہو پانچ منٹ پکڑے رہو۔“ اشمیل نے مسکراتے ہوئے اسے چڑھایا۔

”دیکھ رہے ہو جانشین تمہاری ماما تمہارے پاپا کو مرغا بنا رہی ہے۔“ اشمیل نے اختیار سرخ پڑ گئی۔ اس نے مکا بنا کر یوش کو مارنا چاہا مگر اس نے اس کا ہاتھ تھام کے لبوں سے لگا لیا۔ اشمیل نے سکون سے آنکھیں موند لیں، کہ ہر محبت دکھ دیتی ہے، اگر اس میں پیارے رب کی چاہت سب سے پہلے موجود نہ ہو، اور اس فلسفہ زندگی نے اس کی زندگی کو حسین اور سہل بنا دیا تھا۔

☆.....☆

اقراء سيف

افسانہ

خبریں بننے والی

”واٹ؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے احمد محبت کرنا ہے اور وہ بھی مجھ سے۔“ فارحہ نے بے یقین لہجے

”فارحہ! تمہیں پتا ہے احمد تم سے محبت کرتا ہے۔“ نازی کی ادھوری بات پر ہی فارحہ اچھل پڑی۔

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

میں محبت اور خود پر زور دیا۔

”ہاں تو اس میں دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے کیا احمد تم سے محبت نہیں کر سکتا یا اس کے سر پر سینک ہیں۔“ نازلی نے الٹا تپ کر سوال کیا۔ نازلی کو پتا تھا کہ فارحہ، احمد کی اس محبت پر شاید کبھی یقین نہیں کرے گی اور احمد میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اسے یقین دلا سکے۔ اس لیے یہ معرکہ اس نے خود ہی سر کرنے کا سوچا تھا۔

”ہاں..... محبت اور وہ بھی احمد کرے گا۔ سچی اس نے نظر اٹھا کر دیکھنا تو گوارا نہیں کیا ہر وقت کتابوں میں سر دیے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کتابی کپڑے کو کیا پتا

محبت کیسے کی جاتی ہے۔“

”اگر وہ لا تعلق رہتا ہے، تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ لا پرواہا یا انجان ہے اسے تمہاری زندگی میں آنے والے پر چھوٹے سے چھوٹے خوشیوں بھرے دن کی خبر ہے۔ تمہاری برتھ ڈے، تمہارا رزلٹ ڈے، حتیٰ کہ جس دن تم نے اس سے ہنس کر بات کی اسے وہ دن بھی یاد ہے۔“ نازلی نے کسی ڈائجسٹ میں پڑھا ہوا ڈائلاگ بھی احمد کی حمایت میں بول دیا۔

”اچھا! محترمہ آپ بتانا پسند کریں گی کہ یہ سب بکواس آپ سے احمد نے کہی ہے۔“ فارحہ نے غصے

Downloaded From
Paksociety.com

FADIN
Section

سے کھولتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں یہ سب احمد نے نہیں اس کی ڈائری میں لکھے بے جان الفاظ نے کہا ہے۔“ نازی کا لہجہ پرسکون تھا۔
”واٹ ڈویو میں؟“ فارحہ بے یقین تھی۔

”میرا وہی مطلب ہے جو تم سمجھی ہو میں نے احمد کے روم کی صفائی کرتے ہوئے اس کی ڈائری پڑھی تھی۔ جس میں اس نے تم سے محبت کا اقرار نامہ لکھا ہے۔“ نازی نے آخر میں شریر لہجہ اپنایا۔

”نازی! تم پاگل تو نہیں ہو گئی آج کے دور میں یہ کتابی محبت کون کرتا ہے اور میں کوئی اسی کی دہائی کی لڑکی نہیں ہوں، جو اپنے عاشق کی جھکی نظروں میں لکھا پیام محبت پڑھتی رہوں اور انتظار کروں کہ کب وہ مجھے اپنی ڈائری میں لکھی محبت کھول کر دکھائے گا اور اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل میں سے سوکھے گجرے نکال کر دکھائے گا جو اس نے کسی شام میرے لیے خریدے تھے مگر وہ شرافت کی بیڑھی پر کھڑے ہو کر شرم سے جھکی آنکھوں کے ساتھ مجھے دے نہیں سکا۔“

”اچھا تو پھر تم کس دہائی کی لڑکی ہو اور کیسی محبت پسند ہے تمہیں؟“ نازی نے لفظوں کو چباتے ہوئے پوچھا۔

”میں اکیسویں صدی کی ایک ماڈرن لڑکی ہوں اور مجھے بولڈ محبت پسند ہے۔ جیسے کہ رومان مجھ سے محبت کرتا ہے، جس کا اظہار وہ دن میں بیسیوں دفعہ کرتا ہے۔ اسے میری پسند ناپسند کا پتا ہے، وہ مجھے اور مجھ پر چھتے ہر رنگ کو سراہتا ہے میرے حسن کی تعریف کرتا ہے اور مجھے ایسی ہی محبت فنیسی میٹ کرتی ہے۔“ فارحہ نے کھکتے ہوئے لہجے میں رومان کی محبت کا اعتراف کیا۔

”معاف کرنا فارحہ! رومان تمہیں سراہتا نہیں بلکہ شیشے میں اتارتا ہے اور تم دیکھنا ایک دن اس شیشے میں پہلا کنکر مار کر توڑنے والا بھی رومان ہو گا اور جب تمہارے ہاتھ اس کا رخ کو جوڑتے ہوئے لہو لہان ہوں گے تب تمہیں احمد کی محبت یاد آئے گی اور شاید پھر تم خالی ہاتھ رہ جاؤ۔“ نازی کا لہجہ دھکی تھا وہ اپنی اس بہن کو سمجھانا

چاہتی تھی جس پر آج رومان کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ جب کہ نازی جانتی تھی کہ وہ صرف وقت گزاری کر رہا ہے لیکن یہ بات فارحہ کو کون سمجھائے۔

☆.....☆

آج یونیورسٹی میں آنرز والوں کا اینول ڈنر تھا۔ فارحہ اور نازی دونوں پر جوش سی اپنی تیاری میں مگن تھیں، فارحہ نے واٹ لائٹ فراک پہنا جس کے گلے پر ریڈ اسٹون لگے ہوئے تھے۔ ہم رنگ جیولری، لائٹ میک اپ اور کلر پر گرتی ہالوں کی کھلی آبیٹار نے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ جب کہ نازی بھی پنک فراک میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

پورچ میں احمد کھڑا ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ نوید صاحب کی خاص ہدایت تھی کہ دونوں کو وہی یونیورسٹی لائے اور لے جائے گا۔

احمد نے ایک سرسری سی نگاہ فارحہ پر ڈالی اور نظریں جھکا گیا۔ فارحہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر احمد کی جگہ رومان ہوتا تو کتنی تعریف کرتا اس کی مگر احمد..... اور ہوا بھی یوں ہی ریسٹورنٹ کے ہال میں رومان بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ داخلی دروازے سے داخل ہونی فارحہ اور نازی کو دیکھ کر بڑی بے تابی سے ان کی طرف بڑھا تھا۔

”ہائے فارحہ! بہت دیر کروی آنے میں۔“ رومان نے گہری نظروں سے فارحہ کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا جب کہ نازی ایک سکیوز کرتی ہوئی اپنی دوستوں کی طرف بڑھ گئی۔

”ہاں بس تیاری میں دیر ہو گئی۔“
”ہم مہم۔“ رومان نے محض ہنکارا بھرا جب کہ نظریں ابھی بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

”کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ فارحہ بھی اس کی نظریں خود پر محسوس کر چکی تھی۔

”کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی پیاری لگ رہی ہو جیسے کوئی پرستان کی پری راستہ بھول کر زمین پر آ گئی ہو۔“ رومان نے سنبھلتے ہوئے اسے تعریفی لفظی میں

الجھایا اور فارحہ جب بھی اس کے منہ سے اپنی تعریف سنتی تو اسے رومان کی آنکھوں میں ناچتی ہوس بھی محبت کے رنگ لگتے اور ان رنگوں میں کھو کر اسے ارد گرد کا ہوش نہ رہتا۔

”فارحہ! میں کچھ پل تمہارے ساتھ تمہاری سنگت میں گزارنا چاہتا ہوں آؤ یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔“ رومان کی پیشکش کو فارحہ نے بغیر کسی حیل و حجت کے قبول کر لیا تھا اور یوں محبت کے نشے میں کھوئے ایک خوب صورت شام کا اختتام ہو گیا۔ لیکن یہ شام کس کے لیے بربادی کا پیغام لائی تھی یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ ابھی تو محبت کا نشہ تھا اور اس نشے میں اٹھا ہر قدم جائز اور ہر عمل ٹھیک لگا تھا۔

☆.....☆

”رک جاؤ فارحہ! کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟“ نوید صاحب کے لہجے میں چھپا غصہ کسی انہونی کا پیش خیمہ تھا۔

”ہمارا آج ایون ڈنر تھا پاپا آپ کو صبح بتایا تو تھا۔“ فارحہ نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

”صبح کے بتانے میں اور اب کے بتانے میں بہت فرق ہے۔ کیا کسی آوارہ لڑکے کے ساتھ ہائیک پر بیٹھ کر سڑکوں پر گھومنے کو تم ٹھیک کہتی ہو۔“ نوید صاحب کی آواز میں درشتی تھی۔ فارحہ کے ساتھ کھڑی نازلی بے گناہ ہی مجرم بن گئی۔

”پاپا وہ.....“ فارحہ نے بولنا چاہا جب نوید صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

”بس کچھ نہیں آج سے یونیورسٹی جانا بند اور ہاں فارحہ کی ماں ایک بات اسے سمجھا دو گل احمد کے ساتھ اس کا نکاح ہے۔“ نوید صاحب نے اپنی نصف بہتر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور کمرے کی طرف بڑھ گئے لیکن فارحہ نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”پلیز پاپا! میری بات تو سن لیں۔ آپ ایک دفعہ رومان سے مل کر تو دیکھیں وہ بہت اچھا لڑکا ہے، میں اس سے محبت کرتی ہوں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

فارحہ نے بلا خوف باپ کے سامنے اقرار محبت کیا۔ ”چٹاخ.....!“ نوید صاحب کا ہاتھ فارحہ کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

”بد تمیز! شرم نہیں آتی باپ کو یہ سب بتاتے ہوئے اگر وہ لڑکا کہیں اپنی عزت جانتا تو یوں سڑکوں پر لیے بے عزت نہ کرتا اور ایک بات کان کھول کر سن لو والدین بھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتے اور مجھے امید ہے تم میرے فیصلے سے انحراف نہیں کرو گی۔“ فارحہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ آگے بڑھ گئے جب کہ فارحہ کے اندر انتقام کی آگ زور پکڑ رہی تھی۔ اس کے پاپا نے اسے پہلی بار زندگی میں پھٹ مارا وہ ایک چھٹڑ کھا کر اپنی محبت سے دستبردار ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کیا تھا اور کمرے میں جا کر رومان کو کال کی کہ وہ اسے رات کے دو بجے پک کرے اور ایک چھوٹا سائیک تیار کر کے بیڈ کے نیچے چھپا دیا اور دیوار پر لگی کھڑی میں چلتی سونسیوں کو گننے لگی۔

وہ اس گھر کو چھوڑنے والی تھی۔ جہاں اس نے آنکھ کھولی بچپن سے لے کر آج تک ساری یادیں اس گھر سے وابستہ تھیں۔ ماں، باپ کا پیار ایک بے حد محبت کرنے والی بہن وہ سب کچھ ہی تو فراموش کر چکی تھی ہاں اگر یاد تھا تو صرف ایک پھٹڑ جو اس کے گال پر اس کے باپ نے مارا تھا۔

زندگی کے اکیس سالوں میں اگر اسے یاد رہا تو فقط ایک پھٹڑ..... انتقام اور..... رومان کی محبت۔

☆.....☆

ٹھیک دو بجے اس نے بیڈ کے نیچے سے بیگ نکالا اور دو بے قدموں بنا آہٹ پیدا کیے لاؤنج میں آئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق داخلی دروازہ لاک تھا۔ ”جاننے کیوں بیٹیوں کے ماں باپ عزت لٹنے کے ڈر سے اپنے آنکھن کے بڑے دروازے تو بند کر لیتے ہیں لیکن اسی گھر میں رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے

درست ہے اور روزانہ بند کرنا کیوں بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اڑنے والے پرندوں کے لیے پنجرے کی ایک ٹوٹی تار ہی کافی ہوتی ہے۔“

کچھ ایسا ہی ادھر ہوا تھا۔ فارحہ کو اڑنے کے لیے ایک کھلا در پچھل گیا تھا۔ کچن کی پچھلی جانب کھلتا دروازہ اس کے لیے آزادی ثابت ہوا تھا۔ وہ نگلی شاید یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ آزادی ہی اس کی بربادی کا باب رقم کرے گی۔ بہت آہستہ سے وہ کمرے کی پچھلی جانب سے دیوار کے ساتھ ساتھ گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب احمد کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے آتی آوازوں نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”احمد بھائی! آپ جانتے ہیں فارحہ آپ سے محبت نہیں کرتی، پھر بھی آپ نے پاپا کو انکار نہیں کیا؟ آخر کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ پاپا نے آپ پر بہت احسان کیے ہیں۔“ یہ آواز نازی کی تھی۔

”نازی! یہ بات سچ ہے کہ پاپا نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں، مجھ جیسے بے شناخت بچے کو اپنا نام دیا ہے گھر دیا۔ ماں کی محبت دی، تم جیسی بہن دی ایک پڑھا لکھا باعزت شہری بنایا لیکن جب پاپا نے مجھ سے میری رضامندی پوچھی تو کچھ لمحے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ قسمت مجھ پر اتنا مہربان بھی ہو سکتی ہے اور میرے خیال میں اگر قسمت آپ کے در پر دستک دے تو اسے خوش آمدید کہنا ہی اصل عقلمندی ہے۔“ احمد کا لہجہ ہی اس کی خوشی کا پتا دے رہا تھا۔ اس کے لہجے سے بھلکتی خوشی تو کوئی بھی محسوس کر سکتا تھا۔

”لیکن احمد بھائی فارحہ رومان سے.....“ نازی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی احمد نے کاٹ دی۔

”فارحہ نادان ہے، حتیٰ کہ تم سب لڑکیاں ہی نادان ہوتی ہو تم لڑکیاں محبت اور ہوس کے فرق کو کیوں نہیں سمجھتیں؟ اور یہ کیوں نہیں جانتیں کہ محبت کے قرینوں میں سب سے بڑا قرینہ عزت ہے جو شخص آپ کی عزت کا خیال نہیں رکھ سکتا وہ محبت کیا خاک

کرے گا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی یہ محبت کی کون سی قسم ہے۔ جو شاہراہوں، پارکوں اور ہوٹلوں میں پروان چڑھتی ہے اور فارحہ اس ایک محبت کے حصول کے لیے وہ سب محبتیں وہ سب خوبی رشتے کیسے نظر انداز کر سکتی ہے جو اللہ نے اس کے لیے بنائے ہیں وہ ان کی عزتوں کو کیسے داؤ پر لگا سکتی ہے جو ازل سے حلے آ رہے ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ مرد اس لڑکی سے کبھی شادی نہیں کرنا جو اسے آسانی سے حاصل ہو جائے اور اگر شادی ہو بھی جائے تو وہ پیار و سکون بھی نہیں ملتا جو والدین کی مرضی سے کیے جانے والے شرعی نکاح میں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ صاف لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جن محبتوں کا معیار شرعی اصولوں کو توڑ کر حاصل کرنا ہے وہ کبھی شفاف نہیں ہوتیں۔“ یہ سب کہنے والا احمد رضا تھا اور ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ پاپا نے بھی تو یہی کہا تھا۔

”اگر وہ لڑکا تمہیں اپنی غیرت جانتا تو سڑکوں پر لیے بے عزت نہ کرتا۔“

”وہ تمہیں سراہتا نہیں بلکہ شیشے میں اتارتا ہے اور تم دیکھنا ایک دن اس شیشے کو پہلا پتھر مار کر توڑنے والا بھی رومان ہو گا۔ اور جب تمہارے ہاتھ اس کانچ کو جوڑتے لہو لہان ہوں گے تب تمہیں احمد کی محبت یاد آئے گی اور پھر شاید تم خالی ہاتھ رہ جاؤ۔“ قریب ہی نازی کی آواز گونجی۔

”او خدا..... میں کیا کرنے جا رہی تھی۔ میں خود ہی اپنے آپ کو بے عزت کرنے چلی تھی۔“ دو آنسو ندامت کے اس کی پلکوں کی باز توڑ کر گرے تھے۔

اس کی نظر موبائل کی روشن ہوتی اسکرین پر پڑی جہاں رومان کی کال آ رہی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارا کیونکہ ابھی واپسی کا در کھلا تھا اور اسے لوٹ جانا تھا۔ ابھی اسے خدا سے معافی مانگنی تھی اور جن کا دل دکھایا تھا ان سے معافی مانگنی تھی اور اپنے پاپا کی امید پر پورا اترنا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ہی بے لگام خوابوں کی خاک میں رکنے نہیں چاہتی تھی۔ ☆☆

خبر لکھنے کی فیصلہ

”مما“..... اس نے کمرے میں داخل ہوتے
ہوئے ماما کو موہوم سی صدا لگائی۔ مگر دوسری جانب سے
صرف ایک سپاٹ وجود کھڑکی کے نزدیک ایتادہ نا
جانے کون سے غیر مرئی نقطے کی جانب توجہ مرکوز کئے

سہیلی

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

کہ ماما کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور جا رہا تھا
اس نے ہراساں ہو کر ماما کو گلے لگا لیا۔
”ماما جان! کوئی پریشانی، اضطراب ہے کیا؟“
اس نے استفسار کیا۔

”نہیں میری جان“۔ ماما نے اپنے ہاتھ اس کے
گرد حائل کرتے ہوئے اسے تسلی دی۔

پکانا؟“ ماما کو کندھے سے پکڑتے ہوئے اس نے
معصومیت سے پوچھا کمرے میں عنادل کی آواز کے
علاوہ صرف خاموشی تھی جب وہ چپ کرتی تو خاموشی

ہوئے تھا۔ نہ وہ وجود متحرک ہوا اور نہ ہی کوئی جواب
ملا۔ نہ جانے شب کی کالی چادر نے ہر شے کو کیسے خود
میں سمیٹا تھا کہ ہر طرف ہر شے کو خاموشی نے بھی اپنے
حصار میں لیا تھا۔ وہ دھیرے سے قدم بڑھاتی ماما کے
قریب آئی۔ اس نے ماما کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ
یکلخت چوکیں۔

”ماما جان! کیا ہوا آپ میری آواز کیوں نہیں سن
رہیں؟“ اس نے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بناتے ہوئے
ماما کے چہرے کو تھاما جس پر نا جانے کون سی اداسی تھی

پاک سوسائٹی

Downloaded From
Paksociety.com

سے کم آمدنی رکھتا تھا اور عنادل سے بہت محبت کرتا تھا۔ مگر ریمیل نے فوراً انکار کر دیا۔

”ارے آپ کی بہن آئی ہے وہ بھی میزری چاندی بیٹی کا رشتہ لینے ارے پاگل ہے میں ان کم لو اسٹینٹس والے لوگوں سے اپنی بیٹی بیاہوں گی واہ اس کے بیٹے کی سیلری بہت کم ہے، میرے اسٹینڈرڈ تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔“ تند کے جانے کے بعد ریمیل نے نہایت مغروریت سے کہا، اس وقت وہ خود کو جیسے بہت بلند سمجھ رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس وقت سعود اپنی بہن سے ہی بات کر رہے تھے اور وہ سب سن رہی تھیں جب سعود نے بتایا تو ان کا ماتھا ٹھنکا، مگر پھر بھی بولتی نکلتیں۔ وہ تو اپنی اپنی باتیں بولے جا رہی تھیں، وہ تو بہت آرام سے کہہ رہی تھیں یہ جانے بغیر کہ وہ الفاظ مقابل پر کیسے اثر کرتے ہیں وجود کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔

”کہنے والے کہہ جاتے ہیں سہنے والے کما کرتے ہیں“

مگر اپنی بہن کی آمد نے غصے کو ختم کر دیا۔ اس دن جتنا وہ خوش تھیں صرف وہی جانتی تھیں وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھیں، ان کے ہیر زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

”سنو! تمہاری بہن بہت پیشگی چھری ہے دھیان رکھنا جتنا طار رہنا، سر پر بٹھانے والے کیسے زمین کی جونی بنالیں پتہ نہیں چلتا۔“ سعود صاحب اپنی سالی کی رگ رگ سے واقف تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنی آراہ سے آگاہ کر رہے تھے۔ ماما بہت خوش تھیں ایک امیر خاندان سے رشتے کا خود چل کر آنا کسی معجزے سے کم نہ تھا، چاہے وہ رشتہ بہن کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو، مگر ماں کا دل بہت نرم ہوتا ہے، جب بیٹی پیدا ہوتی ہے ایک ماں کو تب سے ہی اس کے مستقبل کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ پیدا ہو تو پڑھائی جوان ہو تو پھر شادی کی فکر، چاہے جیسے مرضی ہو، ماں کا بیٹی کے معاملے میں دل بہت نرم ہوتا ہے۔ مگر زندگی میں کئے جانے والے

پکا میری جان!“ انہوں نے تسلی دیتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو نرمی سے تھام لیا۔ ماما کی تسلی دینے پر وہ رضامند ہو گئی اور شب بخیر کہنے کے بعد کمرے سے چلی گئی۔ اماؤں کے اندھیرے نے ہر شے کو اپنی سیاہی میں لپیٹا تھا۔ انہیں جب باہر کے اندھیرے سے ڈر لگنے لگا تھا انہوں نے چونک کر یکنخت کھڑکی کے پردے پھیلا دیئے۔ کتنی عجیب بات ہے نا جب دل کا موسم اداس ہونا تو باہر کا موسم بھی خود بخود اداس لگنے لگتا ہے اور ہم اور اس ہو جاتے ہیں دل بیٹھنے لگتا ہے۔ وجود بوجھل ہو جاتا ہے جیسے میلوں کی مسافت ایک ہی لمحے میں طے کر لی ہو، اور پھر ٹانگیں شل سی ہو جاتی ہیں اور دم ساکت جامد ہو جاتے ہیں۔ بیٹی کو تو تسلی دے چکی تھیں مگر قلب کس کرب سے دھڑک رہا تھا، صرف وہی آشنا تھیں دل پر برق روی سے نشتر چل رہے تھے وجود جل کر خاکستر ہو رہا تھا۔ کتنی ہی تکالیف تھیں جنہوں نے ایک ساتھ ہی انہیں اپنے وجود میں لیا تھا۔ انہیں آج بھی اذیر تھا جب ان کی بہن آئی تھیں۔

”ویکھو میں نے نا نہیں سنی تم جانتی ہونا تمہاری بیٹی صرف اور صرف میری بیٹی ہے، اتنی پیاری سکھڑ اور قناعت پسند ہے مکمل طور پر میری امیدوں پر اترنے والی بہو بنے گی ارے بہو کیا بیٹی۔“ انہوں نے اپنا فیصلہ سنایا اور عنادل کے ہاتھ پر پیسے رکھ گئیں اور انگوٹھی پہنا گئیں اور ریمیل بیگم بس بہن کا اپنی بیٹی کے لئے پیار دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ کچھ بہن کی شہد سے لبریز باتوں نے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ بیگم ریمیل کو اپنی بہن سے بہت پیار تھا، انہوں نے کچھ اور بھی اذیر کیا وہ کتنی پریشان اور غصے میں تھیں، جب ان کی بہن کی عنایت نے ان کے غصے کو ختم کر دیا، بہن کے آنے سے ایک دن پہلے ان کی نندا اپنے بیٹے سالار کے لئے عنادل کا ہاتھ مانگنے آئی تھیں۔ سالار عنقا ربیگم کے بیٹے

بیٹا ہے میرا اب کیا کروں مجبور ہوں اسے ویسے بھی سزا
سمرین کی کینیڈا سے آئی بیٹی پسند آئی ہے۔

اس بار بہنوئی کے بجائے ان کی بہن بونی اور بولتی
ہی رہ گئی کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئیں، کتنا آسان تھا
تاں ان کے لئے کہہ دینا یہ سب۔ لوگ کتنے بے حس
ہوتے ہیں نا دوسروں پر پہاڑ پھینک دیتے ہیں مگر
انہیں ذرہ برابر بھی دکھ نہیں ہوتا دوسری جانب کوئی نا
بولافون بند کر دیا گیا تھا، ریسیور ان کے ہاتھوں سے
چھوٹ گیا تھا۔

”دیکھ لو تمہاری بہن بہت امیر ہے ہواؤں میں
اڑتی ہے اور نا جانے کیسے میری سادہ سی بیٹی پر اس کا
دل آ گیا، میں تو حیران ہوں۔“ انہیں شوہر کے کہے
الفاظ شدت سے یاد آئے اور وہ ڈر گئیں ان کے شوہر
کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ وہ تھیں جو اپنی
بات پر اڑتی تھیں مگر وقت کب کس وقت کیسے بدل
جائے، ہم تو بے خبر ہوتے ہیں وقت کے آگے بے
بس اب وہ جب بھی اپنی بیٹی کو دیکھتیں آنکھیں
اشکوں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کے سامنے
ندامت سے سر تک نہ اٹھاتی تھیں۔ معصوم سی بیٹی پر
اتنے بڑے پہاڑ کا گرنا ماں کے لئے بہت تکلیف دہ
ہوتا ہے۔

☆.....

”شرم نا آئی بھائی صاحب انہیں ایسا کہتے ہوئے
ان کی عقل لگتا ہے بری طرح مفلوج ہو چکی ہے۔
میری بچی کو پاگل کہتے اسے ذرہ بھی شرم نہ آئی، پاگل
وہ خود ہوگی اسے تو ڈوب کر مر جانا چاہئے۔ اللہ نے
بہتر کیا ورنہ یہ رنگ باز لڑکا نا جانے شادی کے بعد کیا
رنگ دکھاتا ابھی کی آشنائی بعد کے برباد ہونے سے
بہتر ہے۔“ پھوپھی جان عنادل کے رشتہ ٹوٹنے کی
بات پر سلگ ہی تو گئی تھیں، وہ بہت مہربان، شفیق
خاتون تھیں ہر رشتے کو خوبصورتی سے نبھانے والی

فیصلے غلط ثابت ہو جاتے ہیں کچھ لحوں میں کیا گیا تکبر
اور غرور ایک دن خاک ہو جاتا ہے اور ہم صرف بے
بس اور لاچار ہو جاتے ہیں۔ مٹی کے بنے پتلے اپنی
عصیاں کو جانے بغیر بے حد انا پرست ہو جاتے
ہیں۔ آج صبح آیا بیگم مختار کا فون ان کے وجود کو ریزہ
ریزہ کر گیا تھا وہ ایسے ٹوٹیں جیسے شیشہ ٹوٹا اور کرچی
کرچی ہو جاتا ہے۔

”السلام وعلیکم!“ بہن فون اٹھاتے ہی اپنے بہنوئی
کی آواز سن کر وہ ہلکا سا مسکرائیں۔

”وعلیکم السلام! بھائی کیسے ہیں مختار کیسی ہے؟“
انہوں نے برسرِ لہجے میں استفسار کیا۔ وہ بالکلونی
میں کھڑی تھیں موسم بہت خوشگوار تھا، تیز ہوا کے
جھولنے ان کے بالوں کو لہرا رہے تھے۔

”اللہ کا کرم ہے مجھے کچھ بات کرنی ہے حسب
اتفاق مجھے ابھی وقت ملا تو سوچا آپ سے بات
کر لوں۔“ ان کے کہنے میں نا جانے کیا تھا کہ وہ
ہراساں ہو گئیں۔

”جی بھائی“ وہ ہنسکر کہیں۔

”بہن دیکھیں! میں لجاجت اور نال مٹول سے کام
لینے کی بجائے سیدھا مدھے پر آتا ہوں تمہاری بہن
منگنی توڑنا چاہتی ہے۔ طرح پیسے اور اونچائی کو دیکھنا بس
اس کی خصلت میں شامل ہے۔ اب اسے تم سے بھی
کوئی اونچا۔“ آواز کٹ سی گئی۔

”ارے بس اس میں اتنا بوکھلانے کی کیا بات ہے
تمہارے بہنوئی سے تو کوئی بات نہیں ہونی فضول
بولتے ہیں صرف چلو بس کیا کروں میں تمہاری بیٹی
سے رشتہ توڑ رہی ہوں مجھے تمہاری بیٹی سچ نہیں رہی،
اور سے وہ سائیکائرسٹ ہے سنا ہے وہ آدھے خود
پاگل ہوتے ہیں اور اس کا چشمہ چھپا مجھے احساس ہوا
نہیں بہولانی ہے بھولی گائے نہیں پتہ ہے تمہیں دکھ
ہوگا، مگر مجھے اپنے بیٹے کا مستقبل دیکھنا ہے ایک ہی تو

میری اکڑ میرا غرور دونوں ٹوٹ گئے۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھی رو رہی تھیں۔ کبھی کبھار انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے کوئی غم نہیں ہوتا کہ وہ کسی کے پیروں میں گز کر معافی مانگ لے اپنی انا کو ختم کر دے ہماری غلطیاں بہت بڑی ہوتی ہیں انا والے انسان کے کندھے جھکا دیتی ہیں۔ ”ارے ایک آپی کہتی ہو اور قدموں میں بیٹھی ہوا جیسی کر رہی ہو تم میری جان ہم تو خطا کے تیلے ہیں ہر انسان خطا کرتا ہے اور جانتی ہو تم نے غلطی نہیں کی بس یہ قسمت ہوتی ہے کچھ فیصلوں میں ہماری عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے ہم نہیں جانتے ہم کیا فیصلہ کر رہے ہیں اور پھر قسمت بھی احساس کراتی ہے اور عقل پر پڑے پردے ہٹ جاتے ہیں تم بھی اسی کیفیت کا شکار ہوئی ہو۔ انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے انہیں اپنے مقابل بیٹھا لیا کتنا شستہ، نرم اور شہد سے لبریز لہجہ تھا کہ ماما کی آنکھوں سے چمکتی آنکھیں مسکراویں۔ سالار کمرے میں داخل ہوا ہنسی کی جلتنگ کمرے میں گونج رہی تھی سالار کو کچھ بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ پاپا نے فراخ دلی سے اسے گلے لگا لیا۔ ”یا اللہ کیا یہ وہ لڑکے ہے جس کے لئے میں نے شدت سے دعا مانگی تھی کہ اے اللہ دلوں کے بھید سے تو واقف ہے تو ہی جانتا ہے کہ میں کتنی پاک محبت کرتا ہوں اس معصوم سی لڑکی سے مجھے اس کا بناوے۔ اور بے شک اللہ ہی دعا قبول کرنے والا اور دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ اس نے چپکے سے عنادل کی جانب دیکھا اس کے چہرے پر خوشی کا حسین امتزاج تھا خوشی اسی کو کہتے ہیں جو اس لڑکی کے چہرے پر نظر پڑے ہی مجھے محسوس ہوتی ہے۔ اور ہاں وہی خوشی ہے وہ حصار یار میں بالکل قید ہو چکا تھا اور اس کا اللہ پر یقین اور بڑھ چکا تھا۔

.....☆.....

انہوں نے بہت سفاک الفاظ سنے تھے، مگر انہیں عنادل سے بہت پیار تھا وہ پھر بھی دوڑ کر چلی آئیں۔ سالار صرف عنادل کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا وہ معصوم سی لڑکی اپنے جذبات کو سینت سینت کر رکھنے والی لڑکی بہت چپ سی ہو گئی۔ ماما کو بار بار بہن کی خود سری اور سرکشی پر غصہ آ رہا تھا، سب ڈرائنگ روم میں براجمان تھے ماما پاپا کے ساتھ بیٹھیں تھیں عنادل پھوپھی جان کے کندھے پر سر رکھے سیاٹ انداز میں بیٹھی تھی اور سالار الگ صوفے پر بیٹھے غصے سے اپنے بوٹ کی نوک کو بار بار زمین پر مار رہا تھا۔ ماما پاپا سے بھری اشاروں میں نا جانے کیا بات کر رہی تھیں، پاپا ماما کو بتا رہے تھے کہ دیکھو میری بہن اور اپنی بہن میں فرق۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا سالار سے عنادل کی خاموشی برداشت نہ ہوئی تو کرب سے اٹھتا ہوا باہر چلا گیا۔ محبت بھی کیسا حسین جذبہ ہوتا ہے نا جس سے محبت ہوتی ہے اس کو درد، دکھ، تکلیف میں محبت کرنے والی آنکھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ ”بھیا مجھے پتہ ہے کہ یہ وقت مناسب نہیں ہے مگر میں کچھ کہنا چاہتی ہوں کہ عنادل میری جان نے بہت دکھ دیکھا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اسی دورا ہے میں رہ کر خاموشی سے پیوست ہو جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ عنادل صرف میری بیٹی بنے کل بھی اس کی طلبگار تھی اور آج بھی میرے بچے نے وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے ایک اچھی جا ب کرتا ہے اللہ نے سب دیا ہے اس ذات کا بہت شکر ہے۔ وہ سرحت سے بولتی ہوئی چپ کر گئیں۔ ماما پاپا بات کو حتمی طور پر سمجھ گئے تھے۔ ”آپی مجھے معاف کر دیں میں نے لاپچی لوگوں کو آپ پر ترجیح دی مجھے معاف کرنا میں اندھی ہو گئی تھی مگر آپ کا دل بہت بڑا ہے کوئی میل نہیں ہے۔ آپ نے میرے سفاک الفاظ پر بھی صبر کیا میرے دکھ، خوشی دونوں میں شریک رہیں۔ اللہ نے آپ کو آپ کی صاف نیتی کا پھل دیا۔

فضائل قرآن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿

☆ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔

☆ حق سبحانہ و تقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔

☆ حسد و شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔

☆ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔

☆ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

☆ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے۔

☆ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اسکے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جسکی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔

☆ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرماویں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے ہارنے میں اس کی شفاعت قبول فرماویں گے جس کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔

☆ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزل ویران گھر کے ہے۔

☆ دلوں کو بھی رنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے رنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

☆ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں اقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق سبحانہ سے نکلی ہے یعنی کلام پاک۔

☆ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چاند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

☆ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا اعلانیہ صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔

☆ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی نئی نہ فرشتہ وغیرہ۔

☆ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھے تو نوافل کی سو 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سیکھے لے خواہ اس وقت وہ معمول یہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

☆ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے نئے ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ان سے ظاہری کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔

حوریہ سعید

افسانہ

چہرہ پیری



READING
Section

پستول نکال کر ہانیہ کے سر پر رکھ کر بولا۔
 ”چوڑیاں بھی ہمارے حوالے کر دو۔“
 ”کیا کر رہے ہو بھائی! ہاتھ ہٹاؤ۔“ ہانیہ دو قدم
 پیچھے ہو گئی۔ دوسری ہانیک والا بھی اپنی ہانیک سے
 جا کر ٹک گیا۔ دوسری ہانیک والا جلدی سے
 آگے آئے۔

”میڈم جو کچھ ہے ہمارے حوالے کر دیں۔“
 ”یہ لو..... یہ لو۔“ ہانیہ نے اپنی چوڑیاں اتار کر

بہت دیر سے دو لڑکے ہانیک پر سوار ایک گاڑی کا
 پیچھا کر رہے تھے۔ پیچھا کرتے کرتے وہ ایک ویران
 سی جگہ آگئے جہاں پر ہانیک پر سوار چاروں لڑکوں نے
 گاڑی کو گھیر لیا۔ ہانیہ نے گھبرا کر گاڑی روک دی۔
 ”میڈم! آرام سے جو کچھ پاس ہے حوالے کر دیں
 اور اپنا بیگ دے دیں۔“ جونہی ہانیہ نے بیگ اس کے
 حوالے کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہانیک والا
 پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا ہانیک والا آگے بڑھا اور



زمین پر پھینک دیں، دوسری بائیک والے بھی گھبرا کر ہانیہ کو دیکھ رہے تھے۔

”اٹھاؤ، اٹھاؤ شرم نہیں آتی عورتوں کو لوٹتے پھرتے ہو۔“ ہانیہ نے غصے سے کہا۔

دور سے آئی ہوئی پولیس موبائل نظر آئی تو ہانیہ موبائل کی طرف دوڑی لیکن چاروں لڑکے فرار ہو چکے تھے پولیس بروقت پہنچ چکی تھی۔ ہانیہ کی چوڑیاں، پرس اور موبائل سب کچھ وہیں پڑا تھا، پولیس والے حیران کھڑے تھے۔

”میڈم! ساری چیزیں تو وہ چھوڑ گئے پھر کیا مذاکرات ہو رہے تھے مجھے تو کسی نے پندرہ منٹ پہلے فون کیا تھا کہ ایک لڑکی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہے اور ہم لوگ بروقت پہنچ بھی گئے۔“

”ہٹائیں میں خود حیران ہوں۔“ اس نے جلدی سے اپنی تمام چیزیں اٹھائیں۔

”میڈم! کیا بات کی انہوں نے آپ سے؟“ پولیس والے پوچھ رہے تھے۔

”کوئی خاص نہیں بس مجھے ہراساں کیا اور پھر خود ہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔“

”حیرت ہے میڈم۔“

☆.....☆

ابھی اس بات کو ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ اسی بڑی سنگٹل

پر پھر ہانیہ کے ساتھ دوسرا واقعہ ہوا۔ ٹریفک سنگٹل ریڈ ہوا

تو ساری گاڑیاں رک گئیں۔ ہانیہ نے بیگ سے برش

نکال کر اپنے بالوں میں کر کے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر

رکھ دیا۔ بھی گاڑی کے ڈور پر ٹوک ہوئی تو ہانیہ نے

کھڑکی کھول دی۔ اسپر کا بڑھتا ہوا ہاتھ پستول سمیت

اندرا آیا اور اس نے بہت غلیظ جملہ بولتے ہوئے کانوں

کی بالیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اتار جلدی۔“ اسپر کا سر تقریباً گاڑی کے اندر

تھا۔ ہانیہ نے سکتے کے عالم میں اپنی بالیوں کو اتارنے

کی کوشش کی، اسپر چیخ پڑا۔

READING
Section

”تم وہی پچھل پیری ہوناں جو ایک بار کلفشن کے راستے پر ملیں تھیں۔“ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا تو وہ بولی۔

”پچھل پیری.....! کون پچھل پیری.....؟“ تبھی دوسرا آدمی سامنے آیا اور بولا۔

”باہر نکلو اور گاڑی کی چابی دو۔“ ہانیہ گھبرا کر باہر

نکل چابی زمین پر گر گئی۔ اسپر نے چابی جھک کر اٹھائی

اور وہ ہانیہ کو پہچانتے ہوئے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

”بھاگ یہ وہی پچھل پیری ہے۔“ ہانیہ کو سکتے کے

عالم میں چھوڑ کر وہ غنڈے بھاگ گئے تھے اور لوگ

گاڑیوں سے اتر کر آگئے۔

”میڈم شکر ہے آپ بچ گئیں۔“ بھاگتے ہوئے

لڑکے بول رہے تھے۔

”بھاگو یہ پچھل پیری ہے بھاگو۔“ کئی لوگوں نے

گھبرا کر اپنی گاڑیوں کے شیشے بند کر لیے۔ سنگٹل کھلا تو

پولیس پہنچی مگر بہت لیٹ۔ کئی لوگ اشارے سے جتا

رہے تھے پھر پچھل پیری سے ڈاکو سے لوٹ نہیں سکے۔

”کیا.....!“ پولیس والوں نے بھی اپنی کار تیزی

سے آگے بڑھائی اور ہانیہ کو جا لیا۔ ایک پولیس والا

پہنچانتے ہوئے بولا۔

”کیا چکرا ہے؟ آپ شہر میں کیا کرتی پھر رہی

ہیں؟“

”میں..... میں کیا کرتی پھر رہی ہوں؟ یہ آپ کی

ذمہ داری ہے یہ لوگ دوبار میری گاڑی کو روک چکے

ہیں اور آپ مجھے پچھل پیری کہہ رہے ہیں۔ آپ

قانون کے رکھوالے ہیں آپ ہمیں تحفظ دیں۔“ ہانیہ

اکڑ کر بولی۔

”میڈم! آپ ہمارے ساتھ تھانے چلیں یہ سب

کیا ہو رہا ہے۔“

”تھانے چلوں.....! کس لیے بھی میں نے کیا

ہے؟“

”ہم نے کچھ اگلے سنگٹل پر لڑکے پکڑے ہیں آپ

انہیں چل کر پہچانیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پولیس والوں کے ساتھ ہانیہ پولیس اسٹیشن آگئی۔
چاروں گرفتار ملزم ہانیہ کو دیکھ کر چیخنے لگے۔
”بھل بھری، بھل بھری۔“

”سنت اپ! ہانیہ زور سے چیخی۔ پولیس والے بھی
سکتے کے عالم میں تھوڑا سا دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔
”میڈم! اس میں کچھ بچائی تو ہے۔“ پولیس والا بولا۔
”آپ بڑے صاحب کے پاس چلیں فیصلہ دیں
ہوگا۔“

”ڈاٹ ڈیوین، فیصلہ بڑے صاحب کے پاس
ہوگا۔ ایسا میں نے کیا کیا ہے؟“ اس نے سیل نکالا
اور اپنے ہسپیڈ سے بات کی۔
”آپ پولیس اسٹیشن آجائیں یہاں بڑا مسئلہ ہو
گیا ہے۔“

حمزہ گھبرا کر پولیس اسٹیشن پہنچا تو سارے واقعات
کی تحقیقات ہوئیں تو حمزہ بولا۔
”یہ میری بیوی ہے کوئی بھل بھری نہیں۔ آپ لوگ
یہ بکواس مت کریں۔“ اس نے سب کو ڈانٹ دیا۔

”پھر آپ ہی اس ماجرے کو حل کریں کہ ان میں
ایسا کیا ہے کہ ہر شخص سکتے ہیں آجاتا ہے۔“
”ادا آئی سی۔“ حمزہ چونک کر بولا۔
”یہ تو ایک راز ہے۔ ہم نہیں بتا سکتے۔“ میڈیا
والے وہاں پہنچ چکے تھے۔ میڈیا والے ہانیہ سے
سوال کر رہے تھے۔

”میڈم! آپ کے پاس ایسا کیا ہے کہ پچھو ڈاکو آپ کو
لوٹ نہ سکے اور ان کا کہنا ہے کہ آپ بھل بھری
ہیں۔“ حمزہ حیران ہو کر بولے۔

”آپ لوگ یہ بکواس بار بار نہ کریں بھل
بھری..... بھل بھری۔“ وہ میڈیا والوں پر بڑس
پڑے۔ میڈیا والے بھلا کب چھوڑنے والے تھے ہر
ایک ہانیہ کا انٹرویو کرنے کے لیے آگے بڑھا کہ ہانیہ
جی کے پاس ایسا کیا خاص ہے؟

”میڈم! آپ کو کچھ تو بتانا پڑے گا یہ ایک حقیقت

ہے پولیس والا بھی کہہ رہا ہے کہ میں ان کے پاس گیا
تو اس کو سکتے ہو گیا۔

”ہاں یہ ایک راز کی بات ہے اگر میں بتا دوں تو
کیا آپ ہمارا پچھا چھوڑ دیں گے۔“
”اگر ہمیں ہمارے سوالات کے جوابات مل گئے
تو یقیناً ہم حلے جائیں گے۔“

”نہیں ہمیں معلوم ہے کہ آپ اس بات کو ہر
چیل پر اچھالیں گے۔“

”میڈم! یہ تو ہم سچ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں
آپ گھبرا کیوں رہی ہیں۔“ حمزہ نے آہستہ سے ہانیہ
کے قریب آ کر کچھ کہا۔

”ہاں یہ بات بھی سچ ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔
پہلی کا اس سے بڑا ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں
میڈیا پر آ کر بچائی بتا دوں کہ میری شخصیت کا
راز کیا ہے۔“ تمام چینلوں کی لائٹس آن ہو گئیں۔

”در اصل بات یہ ہے کہ ”لائف بوائے شیمپو“ کا
یہ سارا کمال ہے کہ اس نے میری شخصیت کو پرکشش
بتا دیا ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے کہ جب کوئی
میرے قریب آتا ہے تو میرے بالوں کی خوشبو اور
شیمپو کی بھینٹی بھینٹی مہک انسان کو بے خود کر دیتی ہے
لائف بوائے شیمپو میں یہ حیرت انگیز کمال ہے۔ یہ
آپ کو مطمئن، پرسکون اور جاذب نظر بنا دیتا ہے۔“
”میڈم! آپ کی شادی کیا ارتج میرج ہے یا لو
میرج؟“ ہانیہ ہنس کر بولی۔

”لو میرج.....! اور یہ سب کمال لائف بوائے
شیمپو کا ہے۔ جس نے حمزہ کو میرا دیوانا بنا دیا تھا۔
پابندی شرط صرف اتنی ہے کہ آپ روزانہ لائف
بوائے شیمپو کا استعمال کریں اور پھر اس کا کمال
دیکھیں۔ نرم ملائم، بھینٹی بھینٹی خوشبو میں بسا ہوا سارا
وجود محسوس ہوتا ہے۔ صرف ایک بار پھر بار بار۔“
ہانیہ چینلوں والوں کو اپنا انٹرویو دے رہی تھی۔

☆.....

عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا، جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ سب جھوٹے ہیں۔

عورت کا بھی اپنا گھر ہوتا ہے، اس کا اپنا ذاتی گھر جہاں سے اسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ جہاں وہ بہت سکون سے رہتی ہے اور کوئی چاہ کر بھی اسے اس کے گھر سے جدا نہیں کر سکتا۔

☆.....☆

”ہائے میں مر گئی۔ مدیحہ تیرا بیڑہ غرق ہو۔“ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں، بریانی کی خوشبو نے انہیں چونکا دیا وہ برقع اتارنا بھول گئیں اور سیدھی کچن میں پہنچیں جہاں مدیحہ گنگناتے ہوئے سلاد بنانے میں مصروف تھی۔ انہیں بے حد غصہ آیا اور

چا رہی ہیں۔“ وہ خفا ہوئی انہوں نے خشمکین نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کیوں نہ چاؤں واویلا، اری کم عقل تو سمجھتی کیوں نہیں ہے تیرا باپ صبح سے شام تک خود کو بلکان کرتا ہے تو چار پیسے کما کر لاتا ہے اس سے بھی گھر کی دال روٹی پوری نہیں ہوتی میں لوگوں کے کپڑے سی کر تیرے باپ کا ہاتھ پٹائی ہوں بہت سوچ سمجھ کر خریدا کرتی ہوں، تب کہیں جا کر چند روپے جوڑ پائی ہوں، تجھے ہزار بار یہ بات سمجھا چکی ہوں، پر تیری موٹی عقل میں کچھ گھستا ہی نہیں ہے۔“ وہ تڑپ کر بولیں اور ایک بڑا سا لیکچر اسے دے دیا۔ وہ بیزار سی کھڑی اپنے منہ کے اٹنے

میرا گھر

افسانہ

اسیری علی

سیدھے زاویے بنانے لگی پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔

”اماں میں تو سوچ رہی تھی کہ تو خوش ہوگی پر تو نے کیا خوش ہونا تھا الٹا تو نے میرے دل کی خوشی بھی عیارت کر دی، اتنے شوق سے میں نے بریانی بنائی تھی اور تو نے اماں.....“ وہ رنجیدہ ہوئی اور اپنی بات بھی ادھوری چھوڑ دی۔

”چندا! یہ شوق دل کی خواہش اپنے گھر جا کر پوری کرنا اس گھر میں تو ہمیں معاف ہی رکھو، سمجھیں۔“ انہوں نے مدیحہ سے عاجز آ کر کہا اور اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے، وہ شرمندہ ہو گئی۔

”اماں! یوں تو نہ کر، کیا یہ گھر میرا نہیں ہے جو تو ایسے کہہ رہی ہے۔“ اماں کے یوں تنگ آ جانے پر

انہوں نے دو دھمو کے اس کی کمر پر جڑ دیئے اور اسے گھورنے لگیں۔

”کس سے پوچھ کر تو نے یہ عیاشی کی ہے؟“ انہوں نے دم لگی بریانی کی طرف اشارہ کیا۔

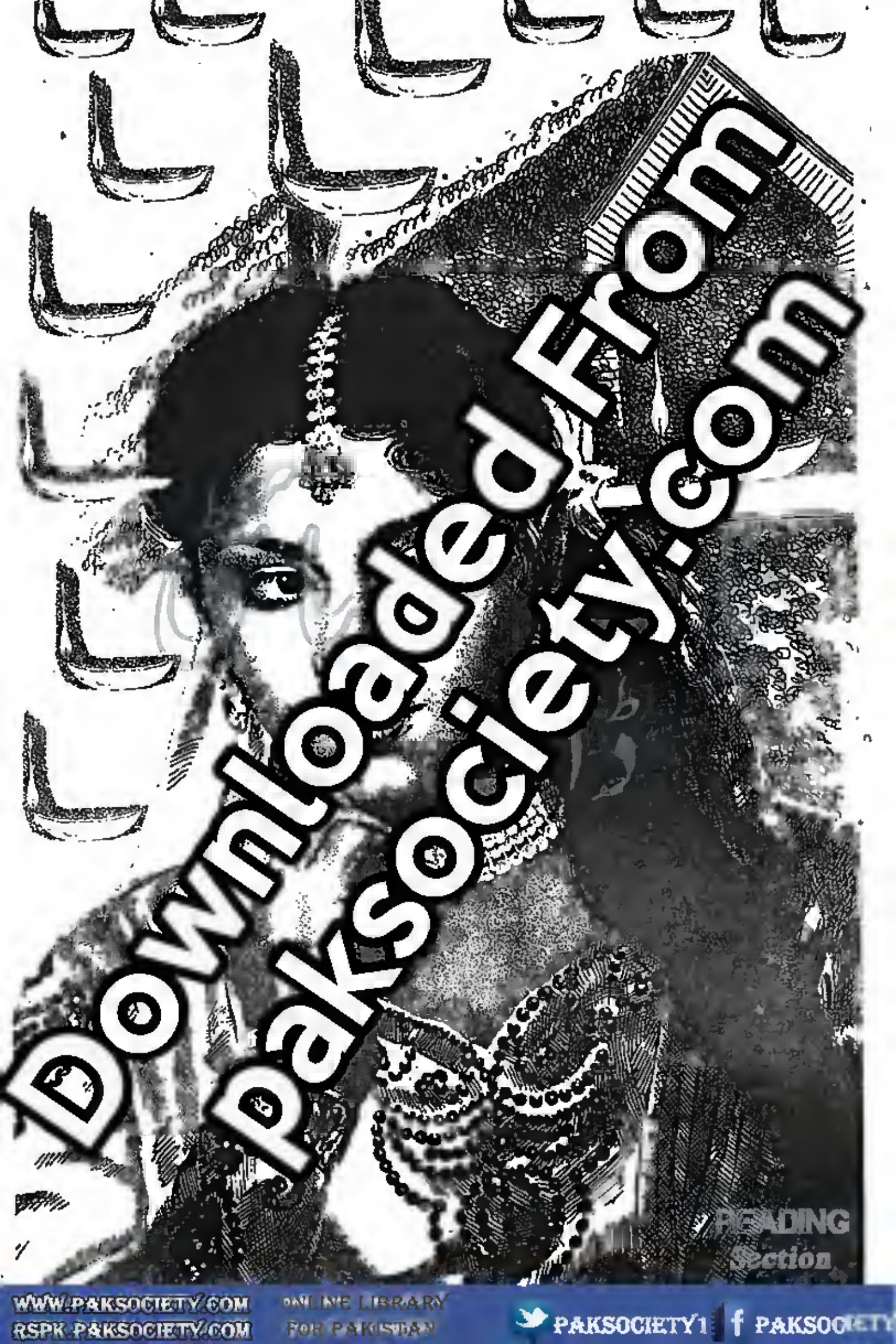
”اماں! میرا دل چاہ رہا تھا۔“ وہ اپنی کمر سہلاتے ہوئے بولی۔ تو اس کے جواب سے انہیں پتنگے لگ گئے۔

”ارے بھاڑ میں جائے تیرا دل..... بد بخت کہیں کی۔ ذرا دیر کو میں گھر سے باہر کیا گئی۔ تو نے خود کو ملکہ عالیہ سمجھ لیا، میری محنت سے جوڑی پائی پائی کو اسنے مزے کے لیے ہڑپ کر گئی۔“ انہوں نے اسے ایک پھٹھر رسید کیا، وہ جربز ہوئی اپنی ماں سے دور جا کھڑی ہوئی۔

!! اماں! اب ایسا بھی کیا ہو گیا ہے جو اتنا واویلا

رداؤ انجسٹ 192 فروری 2016ء

READING
Section



Downloaded From Paksocietyty.com

READING
Section



وہ منمناتی ہوئی بولی۔ آواز میں نمی گھل گئی تھی اور چہرہ بھی ندامت سے سرخ تھا۔ انہوں نے اس کی رندھی آواز سنی تو ایک لمحے کو چپ سی ہو گئیں پھر اس کے قریب جا کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”جھکی ہے تو بالکل، پتا نہیں کب عقل آئے گی تجھے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے سینے سے لگایا۔

”میری ایک بات اپنے پلو سے باندھ لے کہ باوا کا گھر کبھی بھی اپنا نہیں ہوتا، جہاں لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں جو ان ہوتیں ہیں وہ گھر کبھی بھی ان کا نہیں ہوتا۔ لڑکیوں کا گھر وہ ہوتا ہے جہاں وہ بیاہ کر جاتی ہیں۔ یہ تیرے باپ کا گھر ہے یہ تیرا میکہ کہلائے گا، تیرا گھر نہیں ہر عورت کا اپنا گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے بھی کہ نہیں۔“ انہوں نے اس کے سر کو ہلا کر پوچھا تو وہ منہ اٹھا کر حیرت سے اپنی ماں کو دیکھے گی جیسے کہ انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو وہ ساکت سی ماں کی شکل کو سکنے لگی۔

☆.....☆

”مدیحہ، مدیحہ! کہاں مر گئی ہو۔“ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے کمرے کا نقشہ کچھ بدلا بدلا نظر آیا۔ اس نے رک کر غور سے جائزہ لیا تو کمرے کی سیٹنگ چیخ تھی۔ اسے ایک دم غصہ آ گیا اور اس نے اسے چیخ چیخ کر آوازیں لگانی شروع کر دیں۔

”جج..... ججی..... کک..... کیا ہوا؟“ وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی سانس بے قابو تھا اور چہرے پر خوف و وحشت تھی۔

”کیا ہے یہ سب؟“ اس نے اشارے سے کمرے کی چیزوں کی ترتیب دکھائی وہ گھبرا کر سر جھکا گئی۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے۔“ وہ غرایا تو مدیحہ

ڈر گئی اور ہکلاتے ہوئے بولی۔

”مم..... مجھے پہلے والی ترتیب پسند نہیں تھی تو میں نے اپنی مرضی سے اپنے کمرے کی سیٹنگ کر لی۔“ وہ پریشانی سے اپنے شوہر کی انگارہ آنگھٹیں دیکھ کر اپنی انگلیاں مروڑنے لگی اور آنے والے طوفان کا اندازہ کرنے لگی۔

”تمہارا کمرہ تمہاری پسند..... ہوش میں تو ہو تم۔“ اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا اور پھر ایک زور کا طمانچہ منہ پر دے مارا۔

”اپنی اوقات میں رہا کرو۔ یہ گھر میرا ہے اور یہاں مرضی بھی میری چلے گی اور پسند بھی میری ہو گی۔ بھول کر بھی میری اجازت کے بغیر آئندہ کچھ نہ کرنا ورنہ.....“ وہ حاکمیت پسند تھا۔ بیوی کو پھر کی جوتی سمجھنے والا اسے بیوی کی مرضی چلانا پسند نہ آیا وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ مدیحہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

”میرے آنے سے پہلے کمرے کی حالت بدل دینا، میں سب کچھ پہلے جیسا دیکھنا چاہتا ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تاں تو تم صرف تین لفظوں کی مار ہو صرف تین۔“ اسے دھکا دے کر خود سے دور کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ کمرے سے نکل گیا۔

☆.....☆

”ارے! یہ کیا ہو رہا ہے بھابی!“ وہ جیسے ہی اپنے میکے آئی اور گھر کے اندر قدم رکھا تو اسے صحن میں ڈھیر سارا سامان پڑا نظر آیا، کچھ سامان اس کے کمرے کا تھا جہاں وہ شادی سے پہلے رہتی تھی اور کچھ چیزیں اماں کے کمرے کی وہاں پڑی تھیں، اس نے صحن میں کھڑی اپنی بھابی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ارے مدیحہ تم..... آؤ آؤ وہاں کمرے میں چل کر بیٹھو یہاں صحن میں بہت پھیلاوا ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہم۔ انہوں نے بھی تنگ کر جواب دیا۔

”وہ ڈر بہ..... وہ..... اف میرے خدا..... بھائی کو آنے دیں اماں میں بات کرتی ہوں ان سے۔“ اس نے افسوس سے بھابی کو دیکھا اور اماں کو امید دلائی۔

”بھائی سے کیا بات کر دو گی یہ سب اسی کی ہدایت و مشورے پر ہو رہا ہے۔“ انہوں نے مسخر اڑایا اور اکڑ کر کہا مدیحہ نے حیرت سے اماں کو دیکھا تو وہ اپنے آنسو چھپاتے ہوئے اقرار میں گردن ہلا گئیں وہ سن رہی تھی۔

”اماں! بھائی اتنا کیسے بدل سکتے ہیں؟ انہوں نے ایک لمحے کو بھی آپ کے بارے میں نہیں سوچا آپ کی عمر بھر کی صحت آپ کی ساری ریاضتیں سب بھول گئے آپ نے اور ابانے کیسے پائی پائی جوڑ کر اسے اس قابل بنایا ہے سب بھول گئے کچھ یاد نہیں کیا انہیں۔ میں بھی دیکھتی ہوں کیسے وہ اپنی من مانی کر سکتے ہیں یہ میرے باپ کا گھر ہے کوئی کچھ کر کے تو دکھائے۔“ اسے تاسف ہوا اور آخر میں شدید غصہ آ گیا۔

”بس چپ کر جا مدیحہ! بہت دیر سے تیری بکواس سن رہی ہوں اب تو کچھ نہیں بولے گی کبھی۔ جو ہو رہا ہے ہونے دے یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ بہت دیر سے اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر جب مدیحہ نے ان کی ایک نہ سنی تو انہوں نے بھی درشت لہجہ اپنایا۔

”پر اماں.....“

”کہاناں چپ ایک لفظ اور نہیں۔“ انہوں نے اسے بولنے نہیں دیا۔

”مگر اماں! یہ گھر میرے ابا کا ہے۔ آپ کا ہے تو کیسے اس طرح۔“ وہ اماں کے گھر کٹنے پر چلا آئی۔

”تیرا ابا کا تھا۔ اب یہ گھر ساجد کا ہے اس

”پر بھابی! یہ سب ہو کیا رہا ہے؟“ وہ ابھی تک حیران وہیں گھڑی تھی۔

”بچے بڑے ہو رہے ہیں ناں تو ان کے لیے الگ کمرہ تیار کر رہے ہیں ہم یہ سب اپنی سلیسے کا حصہ ہے۔“ انہوں نے پھر سے سامان کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تو اچھی بات ہے مگر یہ اماں کا سامان میری چیزیں یہ کیوں ہمارے کمرے سے باہر پڑی ہیں؟“ وہ اپنی بے ترتیب پڑی چیزوں کو اٹھا کر ایک جگہ جمع کر رہی تھی۔

”تمہارا اور اماں کا کمرہ بڑا ہے اور ایک طرح سے خالی ہی پڑا ہے بس فالتو سامان سے گھرا ہوا ہے۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔

”تو.....“ مدیحہ نے سوالیہ نظروں سے استفسار کیا۔

”تو کیا بھئی بچوں کا سامان وہاں سیٹ کروں گی۔ اب وہ بڑے ہو رہے ہیں۔ اس لیے یہ کٹ کھاڑ باہر نکال کر پھینک دیا۔“ اب کے انہوں نے بالکل مردت نہ برتی اور جتا دیا۔

”بھابی!“ حیرت سے اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

”آپ نے سوچا بھی کیسے یہ بچوں کے لیے کمرہ ہی چاہیے تھا تو یہ اتنا بڑا کمرہ پڑا ہے۔ نیا کمرہ ہونا لپٹیں آپ یہاں میرے کمرے پر قبضہ کرنے کا سوچا بھی کیسے؟ اور مجھے تو خیر رہنے دیں اماں تو یہیں رہتی ہیں پھر بھی آپ نے ان سے ان کا کمرہ چھین لیا۔ آپ کو ذرا شرم نہ آئی آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اماں کہاں جائیں گی۔“ وہ چیخ پڑی۔

”تم سے زیادہ ہے ہمیں اماں کا خیال بلا وجہ اماں سے ہمدردی مت جتاؤ تم، اسٹور روم خالی کرو دیا ہے اماں کا سامان وہاں شفٹ کر دیں گے

”اماں..... اماں آپ کی طرح میں بھی بے
امان ہو گئی۔ اماں میرا بھی کوئی نہیں رہا۔“ وہ بے
تجاشار دتے ہوئے دکھ سے بولی۔

”ہوا کیا ہے؟“ وہ پریشان ہو گئیں۔
”اماں! انور کہتا ہے میں اپنا یہ کمرہ چھوڑ دوں،
وہ کہتا ہے اتنے بڑے کمرے کی مجھے ضرورت نہیں
ہے۔ وہ اپنے استعمال میں رکھے گا میرا کمرہ۔
اماں اس کمرے سے مجھے اس کے باپ کی خوشبو
آتی ہے۔ میں اس کمرے میں بیاہ کر آئی تھی اور وہ
کہتا ہے میں یہ کمرہ خالی کروں۔“ وہ بولتے
بولتے اچانک سر اٹھا کر ماں کی آنکھوں میں دیکھنے
لگی جیسے وہ اسے تسلی دیں گی مگر انہوں نے نظریں
چرا کر رخ پھیر لیا۔

”اماں!“ وہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی۔
”ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے وہ تو بھلا اتنے بڑے
کمرے کا کرے گی کیا؟“ انہوں نے اس کی
سوچوں کے متضاد جواب دیا۔

”اماں! یہ گھر میرا ہے۔ میرا..... وہ کیسے مجھے
بے دخل کر سکتا ہے۔“ وہ چیخی۔

”عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔“ انہوں نے
اس کے غمزہ چہرے کو دیکھا اور عقل کی بات
بتائی۔

یہ سنتا تھا کہ وہ ہتھے سے اکھڑ گئی اور بے قابو
ہوئی چلائی۔

”بس اماں..... بس..... بچپن سے سنتی آرہی
ہوں آپ کا یہ فلسفہ آج نہیں اماں میں نے اس
اینٹ گارے کے مکان کو گھر بنایا ہے۔ ایک
عورت نے اپنی جوانی گزار کر اس چار دیواری کو
مستقبل کا گہوارہ بنایا ہے اپنے دن رات ایک
کردیے میں نے اس گھر کے لیے اور تم کہتی ہو یہ
گھر میرا نہیں۔ تو پھر تم بتاؤ کہاں ہے میرا گھر،
کس جگہ کو میں اپنا گھر کہوں۔ بولو ناں اب

کے بیوی بچوں کا ہے۔ جب تک تیرا باپ زندہ
تھا، تب میں بھی اسے اپنا گھر ہی سمجھتی تھی مگر
اب..... یہ گھر نہ تیرا ہے اور نہ میرا یہ صرف تیرے
بھائی کا گھر ہے، تجھے حق جتانے کی ضرورت نہیں
ہے، میرے ساجد نے مجھے اس گھر میں ہی رکھا
ہے ناں..... بس میرے لیے یہی کافی ہے تو اس
سے آکر مل اور اپنے گھر جا اور اگر تو یہ سب نہیں
کر سکتی تو یہاں آنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔“
انہوں نے تیز مگر رندھی ہوئی آواز میں اسے اپنا
فیصلہ سنا دیا اور وہ گنگ سی کھڑی اماں کو دیکھے گئی۔
جیسے کوئی بے جان بت ہو۔

☆.....☆

”مدیحہ! میری بچی۔“ وہ جیسے ہی اس کے گھر میں
داخل ہوئیں اندر کے منظر نے انہیں ساکت
کر دیا۔ وہ کمرے کی چوکھٹ پر بیٹھی کسی سوچ میں
گم تھی۔ چہرے پر آنسوؤں کی لڑیاں بہت واضح
تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر ہول گئیں اور بے اختیار
اس کی جانب بڑھیں۔

”مدیحہ! مدیحہ کیا ہوا ہے تو ایسے کیوں بیٹھی
ہے؟“ انہوں نے اسے سینے سے لگایا۔ وہ چیپ
رہی۔ جیسے حواس میں نہ ہو۔

”بول میری بچی، بتا نہ کیا ہوا ہے؟“ اس کی
حالت دیکھ کر ان کی آواز میں کمی کھل گئی۔

”سب لوگ کہاں ہیں۔“ انہوں نے ادھر
ادھر نظر دوڑائی مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔

”انور، انور..... شمینہ کہاں ہو تم سب؟“
انہوں نے مدیحہ کو پیار سے پچھارتے ہوئے اس
کے بہو اور بیٹے کو آواز لگائی۔

”مدیحہ! دیکھ میری بوڑھی جان پر کچھ رحم کر کچھ
تو بول میرا دل سہا جا رہا ہے۔“ انہوں نے اسے
جھنجھوڑ دیا وہ ایک دم ہوش میں آئی اور سسکتے
ہوئے ماں سے لپٹ گئی۔

رواڈ انجسٹ میں شائع ہونے والے سب سے ناول
کتابی شکل میں شائع ہو کے ہیں

تم میرے ہو کے رہو

صالح محمود

600/-

کچی کلیاں آنکھن کی

صالح محمود

600/-

کبھی عشق ہو تو پتہ چلے

مصطفیٰ عمران

550/-

کچھ عشق میں رنگ جنوں بھی تھا

نانکہ طارق

500/-

انٹرنیشنل پبلسنگ ہاؤس

سٹرکٹ روڈ چوکے اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

ولیم بک پورٹ اردو بازار کراچی

فون: 021-32633151

خاموش کیوں ہیں؟ جواب دیں مجھے۔“ وہ یاگلوں
کی طرح چیخنے لگی اور پھر اپنی اماں کو ہی پکڑ کر
شدت سے ہلا ڈالا جیسے کہ سارا تصور ان کا ہودہ
اس کی بات کا کیا جواب دیتیں۔ دبی دبی آواز
میں رونے لگیں۔

”جہاں میں پیدا ہوئی وہ گھر میرے باپ کا
تھا، یہی کہا تھا ناں آپ نے، جہاں بیاہ کر گئی وہ
گھر بھی میرا نہیں تھا۔ وہ میرے شوہر کا تھا، باپ
کے مرنے کے بعد وہ گھر بھائی کا ہو گیا۔ شوہر مرا تو
گھر بیٹے کا ہو گیا۔ اماں میں کہاں گئی ان سب
کے سچ۔ کیا میرا کوئی گھر نہیں اماں؟ کیوں نہیں
ہے میرا گھر کیوں؟“ وہ ہذیبانی انداز میں چلانے
لگی اور پھر یک دم ساکت ہو کر اپنی ماں کی گود
میں ایک طرف کو لڑھک گئی۔ شاید صدمہ بہت تھا
جسے وہ سہار نہ سکی اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☆.....☆

”آہ! کتنا سکون ہے یہاں ایک طمانیت کا
احساس ہو رہا ہے مجھے۔ شکر ہے مجھے میرا گھر تو
ملا، کوئی نکال کر تو دکھائے مجھے یہاں سے اور کوئی
نکالے گا بھی کیوں؟ میرا بیٹا مجھے خود یہاں چھوڑ کر
گیا ہے۔ یہ گھر اس نے اپنی پوری رضا مندی
سے مجھے دے دیا۔ اب میں بہت پرسکون ہوں
کہ میرا بیٹا اب مجھ سے لڑے گا نہیں بلکہ دو چار
دن میں تو وہ میرے نام کی پلیٹ بھی میرے گھر پر
لگا دے گا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ میرا
گھر ہے۔ بس چند دن اور پھر نام کی پلیٹ میرے
گھر پر واضح لگی نظر آئے گی۔“ مرحومہ مدیحہ
باسطہ“ منوں مٹی کا بنا چھوٹا سا گھر جہاں میں
اطمینان و سکون سے موجود ہوں یہ میرا گھر ہے
صرف میرا۔“

☆.....☆

رواڈ انجسٹ 197 فروری 2016ء

READING
Section

منزلِ رونا

کاشیبل کی آواز جہاں رانی کے لیے اتنی فرحت بخش تھی کہ وہ بھاگ کر اپنی منزلِ مقصود تک اپنے گوہر نایاب سے ملنے لگی تھی۔ جو کہ اس کا 13 سالہ بیٹا تھا

”رانی! تیری ملاقات آئی ہے، چل جلدی۔“ اس جس زوہ کمرے کے ماحول میں جہاں کھڑکیاں تو بہت تھیں مگر روشنی آنے کا سوال نہیں تھا۔ لیڈی

Downloaded From
Paksociety.com

بونس ملنا چاہیے تھا۔ کیوں آخر شہر کا اتنا بڑا رئیس اور شریف انسان اس کا مہمان تھا، ہے ناں۔“ ششی کی بات سن کر زیبالی بی سمیت موجود تمام خواتین نگاہیں چراتی خاموش ہو گئی تھیں۔

☆.....☆

مظاہر تو چل رہا ہے یا نہیں، کب سے منتیں کروا رہا ہے۔ ایک فلم کے لیے سب کزنز جمع ہیں مگر آپ بڑی بہت ہیں، میں تو آئندہ آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔“ غصے سے کرسی چھوڑتا باہر نکلنے کو تھا کہ مظاہر نے اسے روک لیا تھا۔

”مسٹر علی مرزا! اتنا غصہ میری بھی سن لیں تم

پورے سہل کی عورتوں نے گردن گھما کر اسے دیکھا تھا اور اپنے دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتیں پھر سے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئیں تھیں۔

”اے ششی! کتنی خوش قسمت ہے رانی اس کا بیٹا ہر ہفتے ملنے آتا ہے اس سے۔“

35 سالہ زیبالی بی نے اس کا کندھا بلایا تھا جسے رانی کے بلاوے سے نہ کوئی ملال ہوا تھا، نہ کسی اپنے کے آنے کا انتظار بڑھا تھا نہ کوئی اس ٹوٹی تھی مگر زیبالی بی کا رانی کو خوش قسمت کہنا اسے چونکا گیا تھا۔

”ہاں بی بی! خوش قسمتی تو برستی ہے یہاں کی عورتوں پر اور کل رات کی میزبانی کے بعد تو رانی کو یہ

Downloaded From
Paksociety.com

READING
ACTION

جانے ہوز ہر لگتی ہیں مجھے یہ انڈین موویز اور میری میٹنگ بھی ہے مگر آپ تو آپ ہیں۔ چلیں چلتے ہیں مگر پہلے اپنا موڈ ٹھیک کرو۔“ پانی کا گلاس علی کو دیا تھا۔ اب بھی اسے گھور رہا تھا۔

”مظاہر! یہ لاسٹ نام ہے ہم بھی کام کرتے ہیں مگر تمہاری طرح پاگل نہیں ہوتے۔“ علی نے پھر کلاس نی تھی۔

”اجھا بس چل رہا ہوں تمہارے سو کالڈ سپر ہیرو کی فلم دیکھنے پانسپر کسی تو ختم ہے ان لوگوں پر۔“

”کیونکر نہیں جانتا ہوں بہت محبت وطن ہو تم۔“ دونوں چلتے ہوئے پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں تک آئے تھے کہ مظاہر نے ٹون آنے پر کال انڈیکس کی تھی۔

”جی ملک صاحب کیسے یاد فرمایا؟“ بات کرتے ہوئے اشارے سے علی کو ڈرائیونگ کی دعوت دی تھی۔

”جی جی! کب اوکے کوشش کروں گا پوری چلیں کوشش نہیں وعدہ میں آ جاؤں گا اوکے کھینکس۔“

”اب کیا ہوا ہے ملک صاحب کو؟“ علی نے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں ایک آرگنائزیشن ہے جیل کی خواتین کے لیے ڈونیشن چاہیے انہیں کل ملک کی طرف ڈنر ہے تو میں مل لوں گا ان سے جھی۔“ مظاہر نے تفصیل بتائی تھی۔

”یاری کن چکروں میں پڑے ہو۔ تم سب جھوٹ بولتے ہیں کوئی یہاں اتنا ہرزاد نہیں ہے اور نہ تم جیسا بے وقوف۔“

”علی! جو تم کہہ رہے ہو وہ میں بھی جانتا ہوں ہر روز بننے والی یہ نظریں فقط میڈیا کورٹج اور اپنی پی آر سے مطلب رکھتی ہیں۔ میں جتنے چیکس دیتا ہوں وہ سارے نہ سہی آدھے تو ضرورت مندوں کو ملتے ہوں گے، یہ بھی بہت ہے۔“

”میں جانتا ہوں تمہاری نیت مظاہر! مگر مجھے لگتا ہے کہ ان کی بجائے تم خود جا کر یہ رقم مستحقین کو دویہ بہتر ہے۔“ علی کا مشورہ سن کر وہ خاموش رہا تھا۔ سینما ہال کے باہر سارے کزنز موجود تھے۔

”یہ علی کا موڈ کیوں آف ہے؟“ زارا نے استفسار کیا تھا مظاہر کے تفصیل بتانے پر وہ خوش ہو گئی تھی۔

”مظاہر بھائی! میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔“ انہیں زارا! تم جرنلسٹ ہو اور میں کوئی میڈیا کورٹج نہیں چاہتا۔“ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”بھائی! جو کا ز آپ کا ہے وہ علی میرا بھی ہے۔ میں ان خواتین سے مل سکوں گی اور کچھ شرفا کے چہرے سامنے لاسکوں گی۔ جو ہماری بنیادوں میں ایک ناسور کی مانند ہیں۔“

”مگر اس سب میں بھی نام میرا آ جائے گا جو میں نہیں چاہتا۔“

”نہیں آئے گا نا پلیز مجھے لے جائیں۔“ زارا کے بچوں کی طرح ضد کرنے پر وہ مسکرا اٹھا تھا۔

☆.....☆

”یہ ہاجرہ آج بڑی خاموش ہے، کھانا کھانے بھی نہیں گئی کیا ہوا ہے اسے؟“ رانی نے زیبابی بی سے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اب اس کا غم منار علی ہے۔“

”کیوں اس نے بھی تو اس کی ماں کو قتل کیا تھا۔ کیا اب بھی اس جی کہ ساتھ رہتا وہ اس کے۔“ رانی نے تعجب ظاہر کیا تھا۔

”اری کم بخت اس کی ماں نے بھی تو بیٹا نہ ہونے کی سزا میں ہاجرہ کی دو بیٹیاں زہر دے کر مار دی تھیں وہ تو کسی کو نہ بتایا۔ وڈیرے کا آوی تھا نا شوہر اس کا، سبھی ماں کو بچا لیا اور بیٹے کے لالچ میں بیوی کو سولی چڑھا دیا کہ دوسری عورت بھی مل جائے گی۔“

ز زیبابی بی کے انکشاف پر رانی سوائے افسوس کے کچھ نہ کر سکی کہ ایک وقت وہ بھی ہوتا ہے جب انسان بے بسی کی ایسی انتہا پر ہوتا ہے کہ خودکشی کر کے اپنی وہ جان ختم کرنا چاہتا ہے۔ جس کے لیے جس زندگی کے لیے وہ انسان کا گوشت بھی کھانے کو تیار رہتا ہے مگر

رواڈ انجنٹ 200 فروری 2016ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

READING Section

ایک سالہ بیٹا اس کے ساتھ قید ہے، فقط زمیندار کے کتے کو پتھر مارنے کے جرم میں کیا قصور ہے اس ماں کا؟ اور اس بچے کا ذہن تباہ اور مستقبل تاریک ہو رہا ہے۔ اگر آپ کی سپورٹ ہوگی، تو میرا کام تھوڑا آسان ہو گا۔“ اگر آپ نہیں جانا چاہتے کوئی بات نہیں، میں اپنے چینل کے تھرد چلی جاؤں گی۔“ مطاہر نے کپ اٹھا کر جانی زارا کو روکا تھا۔

”میں چلوں گا تمہارے ساتھ تیار رہتا ہوں۔“ اس کا سر تھپک کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ ناصر صاحب اسے روک نہیں سکے تھے۔ نہ زارا کو بتا سکے تھے کہ وہ کیوں نہیں جانا چاہتا شہر کا مشہور بزنس مین جس کی اپروچ ہر طبقے میں بہت اندر تک ہو اس کا استقبال بہت شاندار کیا گیا تھا۔

”مطاہر صاحب! کیا خدمت کی جائے آپ کی۔“ جیل سپرنٹنڈنٹ نے ڈیوٹی نبھائی تھی۔

”شکریہ رحمت نہ کریں یہ میرے کزن علی اور زارا مرزا ہیں، میں جلد از جلد اپنا کام کرنا چاہتا ہوں۔“ پورے راستے وہ سنجیدہ رہا تھا اب تاثرات سرد ہو چکے تھے۔

”جی ضرور میڈم فرزانہ اس سبل کی انچارج ہیں۔ یہ آپ کو گائیڈ کریں گی۔“ آفسر نے لیڈی کا ٹیبل کو اشارہ کیا تھا۔

”زارا! تم دے دینا میں جا رہا ہوں۔“ سبل میں قدم رکھنے سے پہلے ہی وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”پلیز بھائی! چلیں میرے ساتھ۔“ زارا کے اصرار پر وہ اندر بڑھا تھا۔ فردا فردا سب کے تعارف، سزائیں اور جرم کی تفصیلات سن رہے تھے جس سے علی اور زارا کو قدرے دلچسپی تھی مگر اسے نہیں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کتنے کیس سچے ہیں اور کتنے ہی آزاد ملک کی آزاد عدلیہ کے تھے۔ زارا نے میڈم فرزانہ سے کہہ کر کونے میں بیٹھی لڑکی کو پاس بلا یا تھا جو سفید چادر میں بظاہر اعتماد سے آگے بڑھی تھی مگر آنکھوں میں خوف واضح تھا۔

بے بسی کی ابتداء بھی مایوسی سے ہوتی ہے اگر اللہ پر توکل مکمل ہے تو کچھ نہ کر سکتے ہوئے بھی ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ جاؤ، نیا راستہ وہ دکھانے والا موجود ہے۔ فقط امید و یقین کا ساتھ ہو۔

”تو اچھی ہے زیبائی بی! نہ خوب صورت نہ جوان میری ماں نے صورت دیکھ کر نام رانی رکھ دیا تھا مگر قسمت رانی جیسی نہ ہوئی۔“

”قسمت تو تیری بھی ابھی تک اچھی ہے۔ شہی کسی کی نظر نہیں پڑی تجھے پروگرام منزل تو سب کی ایک ہے۔“

”اللہ نہ کرے۔“ رانی کی بات پر وہ ہل گئی تھی۔

”بدو عائد مجھے خدا را۔“ تڑپ کر رانی کی بات کاٹی تھی۔ یک دم اس قدرے خاموش و افسردہ ماحول میں اپچل ہوئی تھی۔ لیڈی انسپکٹورزٹ پر آگئی تھی۔ سب اپنی جگہ خاموشی سے دبک گئی تھیں۔

☆.....☆

”کیسی رہی ملک صاحب سے ملاقات؟“ ناصر مرزا نے مطاہر سے پوچھا تھا۔

”اچھی تھی مگر آپ کی صاحبزادی نے کام بگاڑ دیا۔ اب کل ان کی وجہ سے مجھے خود سینٹرل جیل جانا پڑے گا۔“ صوفی پر بیٹھتے زارا کو گھورا تھا جو ناصر مرزا کی سوالیہ نظروں کی زد میں تھی۔

”تایا خانی! اس جیل میں، میں خواتین سے پہلے بھی مل چکی ہوں جو چیز مجھے چونکا گئی مجبور کر گئی کہ معلوم کروں وہ کیا بات ہے جو اس ملک کی عورت کو اتنا بہادر بنا گئی، بے بس کر گئی کہ اتنے بڑے بڑے جرم آرام سے کر کے ان جیلوں کو باکثرت آباد کر رہی ہیں، جانتے ہیں مطاہر بھائی کتنے جھوٹے کیسز میں وہاں اگر عورت کی حالت بد سے بدتر ہے تو وہ کیا ریزن ہے جو ایک خوب صورت لڑکی شاندار لباس میں ملزم ہونے کے باوجود اپ ٹو ڈیٹ ہے۔ کیوں اسے وہاں یہ ضرورت ہے اور کس کے کہنے پر ہو رہا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب میں جانا چاہتی ہوں جس عورت کا

”جی شفی نام ہے اس کا۔“ لیڈی آفیسر نے سختی سے ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے کیا تھا۔

”میڈم! آپ جاسکتی ہیں۔ شکر یہ ضرورت ہوئی تو آپ کو بلا لیں گے۔“ مطاہر نے سپاٹ لہجے میں آفیسر کو باہر کا راستہ دکھا دیا تھا۔

”میرا نام شمیمہ نور ہے۔ یہاں آکر شفی ہو گیا ہے۔“ زارا کی مسکراہٹ سے اسے حوصلہ ملا تھا مگر پھر بھی علی اور مطاہر سے کافی دور کھڑی تھی۔

”اتنا پیارا نام کس نے رکھا۔ یہاں کیسے ہو آپ؟“ علی نے ذہن میں مچلتا سوال کیا تھا۔

”اندرون سندھ گاؤں تھا ہمارا بابا میرے ریٹائرڈ ٹیچر تھے۔ گاؤں میں اسکول کھولنا چاہتے تھے جو

زمیندار کو منظور نہ تھا کہ کسی کسان، مزدور کا بچہ بڑھ لکھ گیا تو اس کا کمی نہیں بنے گا۔ وہ اس کی پشتوں کو

غلام نہ کر سکے گا۔ بابا کوئل کر دیا گیا میں کسی طرح پولیس اسٹیشن پہنچ گئی تو میں آج خود مجرم کے روپ میں

یہاں موجود ہوں۔ وہ تھانیدار بھی زمیندار کا نمک خوار تھا۔ بغیر کسی کورٹ اور قانون کے میں یہاں ایک ماہ

سے ہوں۔ کیوں کہ وہ زمیندار ایک وزیر بھی ہے (اسے کہتے ہیں آزادی اور جمہوریت)۔

بادجو ضبط کے شمیمہ کی آنکھوں سے آنسو چھٹک گئے تھے۔

”تم ایجوکیٹڈ ہو؟“ زارا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”گر بکریٹ ہوں آگے پڑھنا نصیب میں نہ تھا۔“

”مطاہر کہاں جا رہے ہو۔“ سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ اس قدر تیزی سے باہر نکلا تھا کہ علی روک بھی نہ سکا تھا۔

”تم دونوں گھر جاؤ مجھے ایک کام ہے شام تک آنا ہوں۔“ علی، زارا خاموشی سے گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔

☆.....☆

دو گھنٹوں کی کوشش کے بعد ایک بھاری چیک کے ساتھ وہ سیرٹیفنڈنٹ کے آفس میں شمیمہ نور کا انتظار

کر رہا تھا۔

”مطاہر صاحب بے جا زحمت کی آپ نے یہ کام بغیر رقم کے بھی ہو جانا۔ ایک لڑکی کی تو بات تھی جب

تک آپ چاہتے.....“

”انیف۔“ ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروایا تھا۔

”وقت نہیں ہے میرے پاس برباد کرنے کو، فضول گوئی سے پرہیز کریں آپ۔“ خود پر ضبط کر کے

باہر نکل گیا تھا۔ مرزا ہاؤس تک کا سفر شمیمہ کے ساتھ بہت خاموشی سے گزرا تھا۔ اس قدر کے مطاہر نے

ایک بار باقاعدہ اس کا جائزہ لیا تھا۔ آیا سانس بھی لے رہی ہے یا نہیں مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا مگر

والوں سے اس کی حقیقت کے ساتھ متعارف کروایا تھا۔ زرینہ، شازمین بیگم علی اور زارا کی والدہ سگی بہنیں

اور دیورانی جیٹھانی تھیں۔ مطاہر سے شمیمہ کا حوالہ انسانیت کا تھا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ کچھ دنوں

میں سب کی محبت کے ساتھ وہ ایڈجسٹ کر گئی تھی۔

آج ایک ہفتے بعد مطاہر سے اس کا سامنا ہوا تھا۔ نہ جانے کس احساس کے تحت وہ اس کے کمرے میں گئی

تھی۔ اسے اپنے کمرے میں پا کر حقیقتاً شاک لگا تھا۔

”آپ یہاں..... خیریت.....؟“ شمیمہ نے دردازہ بند کر کے اسے خاموش ہونے پر مجبور کیا تھا۔

”ہر چیز جو آپ خریدتے ہیں استعمال تو کرتے ہوں گے ان کی تو قیمت بھی کم ہوگی۔ میں تو پھر بہت

مہنگا سودا ہوں، مجھے کیوں نہیں استعمال کیا اب تک۔“ بہت بڑا انداز میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”یہ غلط ہے آپ میری بات.....“ مطاہر کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔

”بھی میں نے اپنی اوقات جاننے کی چاہ نہیں کی، حیثیت جانتی تھی اپنی۔ بابا کہتے تھے کہ شمیمہ تو انمول ہے مگر شکر یہ آپ کا میرا مول لگا کر میری اوقات واضح کی۔ پھانسی سے زیادہ یہ اذیت ہے کہ میں بک چکی ہوں ایک معمولی چیز کی طرح، کیوں کیا

آپ نے ایسا، کیسے بھروں گی میں یہ تاوان روح تو قابل نہیں مگر جس.....“

”شٹ اپ ناؤ انیف از انیف۔“ جھٹکے سے کھینچ کر کمرے سے پورج میں لایا تھا۔ گاڑی میں اس قدر زور سے دھکیلا کہ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ خوف کے باعث چند قطرے مین کٹوروں سے چھٹک گئے تھے۔ رش ڈرائیونگ کے ساتھ وہ فرنشڈ گھر میں داخل ہوا تھا اور کھینچ کر اسے بھی لایا تھا۔

”یہ رہا آپ کا گھر مس شیبہ! ہر ماہ ایک چیک آپ کو مل جائے گا، کسی جاب کی کوشش مت کرنا۔ سوئٹل ورک بہت کرنا ہوں میں۔ ایک یہ بھی سہی۔ تمہیں وہاں سے نکالنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ جو تم سوچ رہی ہو۔ اس کے لیے مجھے میسے بھی خرچ نہ کرنے پڑتے، مگر سے نہیں نکل سکتی تم چیٹ مت کرنا مجھے، ورنہ کیا ہو گا تمہارے ساتھ سوچ ہے تمہاری۔“ براؤن آنکھوں میں غصے کی لہریں تھیں، سرد لہجے میں وارن کرنا گھر سے چلا گیا تھا۔

☆.....☆

”مظاہر! میری بات سنو۔“ وہ جو کئی دنوں سے سب سے بچ رہا تھا آج ناصر صاحب کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ ”کیا بات ہے اتنے دن ہو گئے ہیں، شیبہ کہاں ہے؟ اس کے تو گھر والے بھی نہیں ہیں اور ایک بڑی کی کو اس طرح اپنے ساتھ بغیر رشتے کے رکھنا کیا معنی رکھتا ہے پتا ہے تمہیں!“ ناصر مرزا اس پر برہم ہوئے تھے۔ جو حیرانگی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”بابا آپ سے کس نے کہا وہ میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ میں ایسا لگتا ہوں آپ کو؟“ تاسف سے پوچھا تھا اور تمام تفصیل انہیں بتا دی تھی۔ ”ہم م م کہتی تو وہ ٹھیک ہے مظاہر! آخر کیا حوالہ ہے اس کا ہم سے۔“

”بابا! کیا انسانیت کا حوالہ کافی نہیں ہے۔“ مظاہر نے ان کی بات کاٹی تھی۔

”یے بیٹا! بہت ہے مگر وہ لڑکی ہے ہمیشہ میری بات مانی ہے تم نے اب بھی سنو مظاہر وہ بے آسرا ہے۔ اسے آسرا دو تم جانتے ہو وہ جہاں بھی وہ اس کا مقام نہیں تھا اسے اپنا حوالہ دوا سے معتبر کرو۔ اس کی شکایت ختم ہو جائے گی۔“ ناصر مرزا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ جو گہری خاموشی کے ساتھ اپنی رضا مندی دے رہا تھا۔

”مگر جو کرنا ہے آپ کریں میں نہیں جاؤں گا اس بد تمیز لڑکی کے پاس۔ کسی کی سستی نہیں ہے۔“ وہ پھر ہتھے سے اکھڑا تھا۔

”جیسی بھی ہے تم سے کم ہوگی جاؤ اب تم۔“ انہوں نے اسے گھر کا تھا۔

☆.....☆

صبح سے بارش ہو رہی تھی جو شام تک شدید ہو گئی تھی۔ اس کی توجان جانی تھی بارش سے۔ سبھی جانتے تھے اس کا ڈر مگر اب اس اکیلے گھر میں اسے خوف آرہا تھا کہ ابی وقت دروازے کی قفل ہوئی تھی۔

”آج تو علی اور زارا بھی نہیں آسکتے۔“ وہ ہی دونوں تھے جو اسے اتنے دنوں سے کہنی دے رہے تھے۔ بدقت تمام بھاگ کر گیٹ کھولا تھا سامنے ناصر مرزا اور تمام گھر والے موجود تھے۔ انہیں لیے اندر بڑھی تھی کہ زرینہ بیگم کا کندھا ملا تو سارے جمع آنسو بہا دیئے۔

”شیبہ جو کچھ میں کہوں گا اسے غور سے سننا اور پھر فیصلہ کرنا۔“ ناصر مرزا اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

”یہ میرا اور مظاہر کا راز ہے جو آج اب سب جانیں گے جسے صرف زرینہ اور شازمین جانتی ہیں۔ مظاہر میرا سگا بیٹا نہیں ہے اس کے والد کی وفات کے بعد اس کی ماں نے جس میڈیسن کہنی میں جاب کی تھی۔ وہ جعلی کاروبار میں ملوث تھے۔ پولیس ریٹ ہوا۔ مالک نے رشوت کے بل پر مظاہر کی والدہ کو اریسٹ کروایا کہ موقع پر وہ ہی موجود تھیں۔ ان کا کوئی ضمانتی نہیں تھا۔ جھوٹے کیس میں 10 سال کی

سزا سنائی گئی۔ مظاہر بھی ان کے ساتھ جیل گیا کہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس جیل میں ہونے والا گھناؤنا انسانیت سوز کاروبار بڑے ہونے کے ساتھ مظاہر نے تمام تر شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ قریب تھا کہ اپنا اخلاق معصوم سوچ وہ کھودیتا۔ اس کی ماں نے اسے میرا پتا دیا اور جیل سے نکال دیا اس کے والد میرے پیچھے تھے 7 سالہ بچہ میرے سامنے تھا میں چاہتا اسے یتیم خانے بھیج دیتا مگر میری زرینہ کی اولاد نہیں تھی تو ہم نے اسے اللہ کا انعام سمجھ لیا۔ پھر علی اور زارا ہمارے نصیب میں تھے۔ مظاہر ہمیں اور زیادہ عزیز ہوا کہ اس کی محبت علی اور زارا کے لیے ہم سب سے زیادہ تھی۔ تعلیم کے بعد مظاہر نے مجھ سے رقم ادھاری اور بزنس اشارت کیا جو آج دو گنا ہو چکا ہے اور وہ رقم نہ صرف پیسوں کی صورت بلکہ ہر طرح سے مجھے ادھار لوٹایا اور اس قدر کہ آج میں اس کا مقروض ہوں۔ آج میرے سب میں صرف تم دونوں کو خاص طور پر بتا رہا ہوں کہ کبھی تم اس پر انگلی نہ اٹھا سکو مجھے۔ ناصر مرزا نے علی زارا کو مخاطب کیا تھا۔

”ایسا لگتا ہوں آپ کو میں بابا جانی! مظاہر جان ہے میری اور آپ.....“ علی سے آگے بولنا محال تھا۔ ”جذباتی نہ ہو زیادہ، اگر ہوئے کبھی تو جانتے ہو مظاہر بھائی کو تم، میں تو ہوں ہی معصوم۔“ زارا کی شرارت پر سب ہنس دیے تھے اور علی نے اسے گھورا تھا۔

”شہیبہ! تمہاری صورت میں اسے اپنا آپ نظر آیا تھا۔ اپنی ماں کو نہیں بچا سکا، اسی قید میں خاموشی سے ان کی مرقد بن گئی مگر اس نے تمہیں بچایا ہے کیا غلط کیا اس نے؟ اب اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تمہیں منظور ہے تو ہم تمہیں مظاہر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی وبا نہیں ہے اپنا فیصلہ بناؤ تم ہمیشہ ہماری بیٹی رہو گی۔“ ناصر مرزا نے اس کا سر تھپکا تھا۔

”میرا فیصلہ آپ کی خوشی ہے۔“ شہیبہ نے ہتھیار

ڈال دیے تھے ان سب کی محبتوں کے آگے اسی وقت مظاہر کو بلایا گیا تھا وہ بھی ناصر مرزا کے حکم پر۔ نکاح کے فوراً بعد وہ چلا گیا تھا۔ شہیبہ سب لوگوں کے ساتھ گھر آگئی تھی۔ علی اور زارا کے ساتھ وہ مظاہر کے کمرے میں موجود تھی۔

”علی! اب تم شرافت سے چلے جاؤ، مجھے بھائی کو تیار کرنا ہے۔“

”تو کرو میں نے منع کیا ہے اتنا وقت ضائع کر کے ان محترمہ اور ان چنگیز خان کے کچھ لگتے مظاہر صاحب کے دل کے راز جانے ہیں، سنو گی نہیں۔“ علی نے رشوت دینا چاہی تھی۔

”نہیں سننا میں سب جانتی ہوں۔“ زارا نے اسے باہر نکال کر اپنا خوب صورت گرے اینڈ سلور سوٹ اسے دیا تھا اور ہلکا سا میک اپ کر کے وہ باہر جا رہی تھی کہ شہیبہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”پلیز تم رک جاؤ۔ بہت ڈر لگ رہا ہے انہیں تو غصہ بھی بہت آتا ہے پلیز!“ اس کی فرمائش پر زارا اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

”بی بی مانا میں میڈیا کی لڑکی ہوں، ہر چیز سب سے پہلے کوریج کرنی ہوں مگر سوری آج رات میری چھٹی سے نہ میرا انٹرسٹ ہے کہ اپنی شامت مظاہر بھائی سے گرواؤں، آپ کی لائیو کوریج کر کے۔“ زارا کی جھاڑ پر اس کی پلکیں لرز کر سایہ فگن ہوئی تھیں۔ تقریباً دس منٹ بعد ہی مظاہر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ لائٹ آن کر کے اندھیرا دور کیا تھا۔ صوفے پر آج پھر وہ موجود تھی بہت جلد اپنے اعصاب کنٹرول کیے تھے اور ڈریسنگ روم کی طرف چل پڑا تھا۔ باہر آ کر اچھی خاصی ٹھنڈ میں روم ریفریجریٹر سے ٹھنڈا پانی نکال کے پیا تھا۔ وہ نظریں جھکائے پوری طرح اس کی حرکات محسوس کر رہی تھی۔

”کیا کر رہی ہیں آپ یہاں؟“ اس کے قریب کھڑا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے بابا جانی لائے ہیں اور یہ میرا بھی کرہ ہے۔“
 ”کس نے کہا آپ کا کرہ ہے؟“ دو قدم چل کے مزید اس کے قریب ہوا تھا۔

”چند گھنٹوں قبل آپ ہی نے تمام حقوق دیے ہیں۔ میں اپنا فیصلہ کر کے یہاں موجود ہوں آگے آپ بھی آزاد ہیں اپنے فیصلوں میں مگر آپ ہمیشہ میرے محسن رہیں گے، آپ کا احسان میں کبھی نہیں اتار سکتی۔“ اس نے بہت آرام سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

”اب احساس ہوا ہے کہ میں محسن ہوں۔ اس وقت تو بہت برا لگ رہا تھا میں آپ کو، ایک خریدار۔“
 ”پلیز آئی ایم سوری وہ میری غلطی تھی مظاہر! میں سب جانتی ہوں ہم دونوں اپنا ماضی کبھی نہیں بھولیں گے مگر ہمیشہ صرف اچھی یادیں اور مہکتے لمحے دہرائیں گے پلیز۔“ عشیہ نے التجا کی تھی۔

”مگر میں نے ابھی فیصلہ تو نہیں کیا کہ ہم ماضی دہرانے کو مستقبل میں ساتھ ہوں گے یا نہیں۔“
 مظاہر کی بات پر بیٹوں سے چند اشک ٹوٹ کر نکھرے تھے۔

”انہی آنسوؤں نے اس دن مجھ سے وہ قدم اٹھوایا تھا۔ بہت ظالم ہو تم ابھی مجھے فیصلے کا اختیار دیا تھا۔ اب مجبور کر رہی ہو کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہو۔“
 آپ نے تم کرتا درمیان کی خلیج ختم کرنا وہ اس تک بہت آرام سے آیا تھا۔

”عشیہ! اس دن جیل وزٹ پر مجھے ہر طرح کی آفر تھی۔ تم جانتی ہو ایک چیک پر تمہارا وہاں سے نکل جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں، جب بغیر کورٹ کے فیصلہ ہو سکتا ہے تو ضمانت بھی ہو سکتی ہے، اگر میں نہیں کرتا کچھ تو تم کسی ہیومن رائٹس تنظیم کا سہارا لیتیں۔ وہ تمہیں میڈیا کے ذریعے اتنا ہائی لائٹ کرتے کہ اس آزادی سے تم قید بہتر سمجھتیں۔ میں دن رات ان لوگوں میں رہتا ہوں۔ سب غلط نہیں ہیں، بہت سے

لوگ مخلص ہیں۔ سچی نیت سے کام کر رہے ہیں مگر تعداد بہت کم ہے۔ میں نے تمہیں بجایا کیا غلط کیا؟ ہم سب یہ ہی سوچتے اور کہتے ہیں۔ اکیلے کچھ نہیں کر سکتے مگر درحقیقت بہت کچھ نہ سہی کچھ نہ کچھ تو کر سکتے ہیں اگر ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے تو کیا ایک انسان کو بچانا انسانیت پر احسان نہیں۔ ضرورت صرف ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے جو اپنی ذات سے بالاتر ہو کر کی جائے۔“

”دھینکس مظاہر! اینڈ آئی ایم سوری۔“ جھلمل پلکوں کے ساتھ اس کے رد برد کھڑی تھی۔
 ”دھینکس کے بعد سوری نہیں کچھ اور بنتا تھا۔“
 مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تھا جو حیرانگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“
 ”سنز شیبہ مظاہر! آپ ہمیشہ کام غلط کرتی ہیں، غلط جگہ، غلط وقت، غلط ری ایکشن، غلط جملہ سمجھیں آپ۔“ اس کی جھاڑ پر شرمندگی سے اسے دیکھا تھا۔
 ”اجھا اب کیا غلط کیا ہے میں نے؟“ اعتماد بحال کر کے نظریں ملائیں تھیں۔

”پہلے کی چوڑ دیں۔ ابھی دیکھ لو اتنے حسین سوٹ کے ساتھ اس بیڈ کی سجاوٹ کے باوجود تم یہاں صوفے پر بیٹھی ہو۔ حالانکہ آئی تھنک یہ سب تمہارے روپ کے خراج کے لیے ہیں۔ تو میں بہت ناراض ہوں اگر مجھے منانا چاہتی ہیں محترمہ تو بیڈ پر تشریف لے جائیں میں بابا کو دھینکس کہہ کر آتا ہوں۔“ شدتوں سے پر لہجے میں اس کا ہاتھ دیا تا باہر نکل گیا تھا۔ وہ بمشکل دل سنبھالتی بیڈ تک آئی تھی۔
 اگر وہ باہر نہ جاتا تو شاید اس کا ہارٹ ٹپل ہو جاتا۔ بیڈ پر دھرے سرخ و سفید گلاب کو اس نے چھو کر دیکھا تھا اور رب کریم سے دعا کی تھی کہ ان پھولوں کی ٹھنڈک اور مہک کی مانند ان کی آئندہ زندگی بھی مہکتی رہے۔

☆.....

روشن مستقبل کی آرزو

گامی سٹنل پر رکی، حریم نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں،
آج ٹرائیک بہت زیادہ تھا۔ تبھی اس کی نظر سڑک کے
دوسرے کنارے بنے فٹ پاتھ پر کھڑے عجیب سے حلے
والے بچے پر پڑی، اور حریم کو اس کا چہرہ شناسا لگا۔

Downloaded From
Paksociety.com

مگر معصوم۔ خیالات کا تلاطم یک دم شانت ہوا سنگل
 کھل چکا تھا، حریم نے فٹ پاتھ پر دیکھا جہاں تھوڑی
 دیر پہلے حمزہ کھڑا تھا۔ مگر اب وہاں نہیں تھا، حریم جی بھر
 کر حیران ہوئی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔
 گھر آ کر امی سے ذکر کیا، تو وہ بولیں۔

”اس میں کون سی نئی بات ہے؟ اسی شہر میں ہی تو
 رہتے تھے شمیمہ لوگ آ گیا ہوگا تمہیں حمزہ نظر۔“
 ”مگر امی! وہ عجیب سے حلے میں تھا، میلے کپڑے
 سنجیدہ لگاؤ مجھے۔“ حریم کے دل کو چین کہاں تھا اب۔

”ارے ہاں یہ تو حمزہ ہے۔“ وہ بڑبڑائی پہچان گئی
 تھی وہ حمزہ کو بھولتی تھی کیسے ابھی دو سال ہی تو ہوئے
 تھے، دو سال پہلے کی بات تھی، جب حمزہ لوگ ان کے
 پڑوسی تھے، مگر جب حریم لوگوں نے اپنا گھر تبدیل کیا تو
 اپنی زندگی کی مصروفیت میں اس قدر ڈوبے کے پچھلا
 سب بھول گئے۔

آج حمزہ کو یہاں دیکھ کر اسے سب یاد آ گیا تھا،
 عارف انکل، شمیمہ آنٹی، اور ان کا پانچ سالہ بیٹا حمزہ، مگر
 اب تو وہ بڑا ہو گیا تھا، آج بھی اس کا چہرہ وہی تھا سنجیدہ



Downloaded From
Paksociety.com

READING
 Section

”چھوڑو بھی تم جا کر کھانا کھا لو پکن میں رکھا ہے۔“
 حریم اٹھ کر پکن میں آگئی اور سارہ وقت حزمہ کے بارے
 میں سوچتی رہی۔

☆.....

ابھی اس بات کو دو دن ہی گزرے تھے، حزمہ پھر سے
 حریم کو ای فٹ پاتھ پر نظر آ گیا، مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا،
 کچھ قدرے بڑی عمر کے لڑکے کے حزمہ پر جھپٹ پڑے
 تھے۔ حزمہ کے ہاتھ میں شاید کچھ کھانے کو تھا۔ جو وہ
 لڑکے اس سے چھین کر بھاگ چکے تھے۔ تاہم ان
 لڑکوں کا حلیہ بھی حزمہ جیسا ہی تھا سیلا کچھلا۔ حزمہ وہیں
 بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔ حریم کا نرم
 حساس دل یک دم پریشان ہو گیا۔ اس نے گاڑی ای
 فٹ پاتھ کے پاس لے جا کر روک دی۔

”حزمہ.....!“ گاڑی سے اتر کر حریم نے پکارا۔

مگر وہ ہنوز ایسے ہی بیٹھا تھا۔ ”حزمہ.....“ حریم نے
 اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”وہ میرا کھانا لے گئے۔“ حزمہ نے اپنی انگلی سے اس
 طرف اشارہ کیا جہاں وہ لڑکے بھاگے تھے۔

حریم نے حزمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھایا، اور
 ایک کینٹین کے پاس رک کر کھانے کا سامان لے کر حزمہ
 کو پکڑا دیا۔ حزمہ سامان دیکھ کر خوش ہو گیا، اب وہ بھوک
 کو با آسانی شکست دے سکتا تھا، حریم اسے لے کر پاس
 بنے بیچ پر بیٹھ گئی۔ حزمہ جلدی جلدی بسکٹ کا پیسٹ
 کھول کر کھانے لگا۔

”ای کہاں ہیں حزمہ؟“

”وہ گھر میں ہیں بیمار ہیں، تبھی آج میں کام پر آیا
 ہوں۔“ حزمہ نے معصومیت سے جواب دیا جیسے وہ بہت بڑا
 اور مذہب ہو گیا ہو۔ حریم کو حزمہ پر بہت پیمانہ پورا ترس بھی۔
 ”اور ابو؟“

”وہ تو اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہمیں چھوڑ کر۔“

حزمہ اپنی عمر سے کئی گناہ زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس کی معصوم
 پنوں میں بچپن کی شرارتیں دم توڑ چکی تھیں۔

”مجھائی کے پاس لے چلو۔ وہ بے قراری سے بولی۔
 اگر حزمہ کی جگہ کوئی اور بچہ ہوتا تو تب بھی حریم اسے
 کھانا کھلائی مگر اس کی فیملی کے بارے میں استفسار نہ
 کرتی، مگر حزمہ انجان نہیں تھا، شہینہ آئی بھی حریم کو یاد
 تھیں، ہاں اپنی پڑھائی اور جواب میں وہ کچھ عرصہ
 فراموش کر بیٹھی تھی۔“

شہینہ آئی کی پیار بھری نچیر آج بھی اسے یاد تھی، کتنا لگاؤ
 تھا انہیں حریم سے جب بھی حریم کو ایمر جنسی میں کسی چیز کی
 ضرورت ہوتی تو آئی اپنا سارا ضروری کام ترک کر کے حریم
 کے ساتھ مارکیٹ چل پڑتیں، اور جب اس کے امتحان
 ہوتے صبح صبح آئی آ کر حریم کی ای کے ساتھ گھر کے تمام
 کاموں میں مدد کروا جاتیں، تاکہ حریم کی پڑھائی ڈسٹرب نہ
 ہو۔ دو سالہ حزمہ سے حریم کو بہت لگاؤ تھا۔

وہ سیکنڈ ایئر میں تھی جب عارف انکل، شہینہ آئی اور
 ان کا گول مشول سا حزمہ ان کے پڑوس میں رہنے آیا تھا،
 اور عارف انکل کی حریم کے ابو سے خاصی دوستی بھی ہوئی
 تھی، دیکھتے ہی دیکھتے تین سال گزر گئے۔

فیاض احمد (حریم کے ابو) نے نیا کاروبار شروع کیا
 اور ان کا کاروبار کامیاب رہا بھی حریم لوگ اس علاقے
 کو خیر آباد کہہ کر ایک خوبصورت پوش ایریا میں شفٹ
 ہو گئے، حریم نے جانے سے پہلے شہینہ آئی سے ملنا چاہا
 مگر وہ لوگ اسی روز صبح گاؤں جا چکے تھے بغیر اطلاع
 کے، حریم کافی اداں ہوئی تھی جاتے وقت، آج اچانک
 حزمہ سے مل کر شدت سے حریم کا دل چاہا شہینہ آئی سے
 ملنے کا، وہ حزمہ کو ای فٹ پاتھ کے پاس لے آئی گاڑی
 لاک کی اور حزمہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تھوڑی دور ایک خستہ
 حال علاقے میں لے آیا۔ چھوٹی تنگ، بدبودار گلیوں
 سے گزرتے وقت حریم کا دل گھبرانے لگا، حزمہ اسے لئے
 ایک پرانے گھر کے سامنے لے آیا۔

وہ گھر تو نہیں تھا کھنڈر تھا، یہ وہ علاقہ ہرگز نہیں تھا
 جہاں پہلے حزمہ لوگ رہائش پذیر تھے، حریم نے حیرانی
 سے گھر کے اندر قدم رکھا، اندر جاتے ہی حریم کو لگا جیسے

درود یوار سے ویرانی ٹپک رہی ہو۔ حمزہ چلتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا حریم بھی اس کے پیچھے تھی۔
 ”ای! آئی آئی ہیں۔“ حمزہ کی آنکھوں اور لہجے میں خوشی عیاں تھے۔

”کون؟“ ثمنینہ بمشکل چار پائی کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی، اور سامنے چار پائی پر بیٹھی، سستی کو دیکھ کر حریم سکتے میں آگئی۔ یہ تو وہ ثمنینہ آئی نہیں تھیں، زرد رنگت، ہڈیوں کا پتھر سیاہ حلقے، ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی کی تمام تر تمنیوں نے اپنا سارا زور خوب آزمایا ہوا ان پر۔
 ثمنینہ کی حالت دیکھ کر حریم کی آنکھیں بھرا آئیں حمزہ ساتھ پڑا اسٹول حریم کے پاس لے آیا اور اسے بیٹھنے کا کہا، وہ بیٹھ گئی..... اور خالی خالی آنکھوں سے ثمنینہ آئی کو دیکھتی رہی، بڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی۔

”آئی؟ آپ یہاں اس حال میں؟“ دکھ کی شدت سے سوال بھی ٹھیک سے نہ کر پارہی تھی۔

”حالات اور تقدیر کی نار نے مجھے اس حال میں پہنچا دیا ہے۔“ عجیب سناٹے دار آواز تھی حریم کو ایسا ہی لگا۔ وہ حریم کو بھولی نہ تھیں، آج اتنے عرصے بعد حریم کو یوں اپنے لئے فکر مند دیکھ کر انہیں اپنے پن کا احساس ہوا تھا۔ جب سے عارف ثمنینہ اور حمزہ کو چھوڑ کر گئے تھے۔ ثمنینہ نے تو اپنے اندر دکھ پالنا شروع کر دیے تھے۔ کسے کہتی، کون تھا اپنا؟ حریم کو دیکھ کر آج ثمنینہ پھٹنے کو تیار تھی۔ بھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی کب سے خشک آنکھیں آج سیراب ہوئی تھیں۔ حریم نے بمشکل انہیں چپ کر دیا۔

”آئی بتائیں، آپ کا نمبر بھی بند ہو گیا تھا، اچانک گاؤں کیوں چلی گئی تھیں آپ، اور حمزہ اس حال میں فٹ پاتھ پر۔“ وہ واقعی فکر مند تھی۔

”حمزہ کے ابو کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اچانک ہمیں گاؤں جانا پڑا شاید آب و ہوا تبدیل ہونے سے اچھا اثر ہوا ان پر۔“ ثمنینہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔
 حریم کو ہلکی سی ہنسی ہوئی۔

”تو پھر عارف انکل کی وفات کب ہوئی اور آپ، حمزہ اس حال میں، ایسی زندگی کیسے گزار رہے ہیں؟“ حریم انجانے میں ثمنینہ کے گہرے زخم کو یاد کرنے لگی بار بار سوال کر کے۔

بہت نالنے کے بعد بھی جب حریم نہ سانی، تو ثمنینہ پھٹ پڑیں۔
 ”کیا سننا چاہتی ہو، کیا بتاؤں میں تمہیں، یہی کہ آج زندگی کے اس بھیا تک موڑ پر ہم تمہارے باپ کی وجہ سے پہنچے، وہی تھے عارف کی امیدیں توڑنے والے میرے خوشحال گھرانے کو بلندی کے خواب دکھا کے زمین پر گرانے والے۔ حمزہ کے روشن مستقبل کو تاریکی کی نظر کرنے والے۔“

ثمنینہ بلک بلک کر رو دیں، وہ حریم کو اس کے باپ کی حقیقت ہرگز نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ ان کے ساتھ تو جو ہوا وہ ہو کر گزر چکا تھا مگر ثمنینہ اس نرم دل حساس لڑکی کو دکھ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ مگر حریم کی ضد پر ان کے دل کے تہہ خانے میں دبے دکھوں کو زبان مل گئی آج۔

”ہو.....“ وہ کہنے حریم کو اپنے باپ کا نام سن کر کزنٹ لگا۔
 ”ہاں تمہارے ابو (فیاض احمد) نے حمزہ کے ابو کو کاروبار کا مشورہ دیا تھا، مگر ہمارے مالی حالات ہمیں اس بات کی اجازت نہ دیتے تھے۔ عارف کے پاس کاروبار میں الویسٹ کرنے کے لئے بڑی رقم نہ تھی مگر تمہارے ابو نے عارف کو بہترین مستقبل کے خواب دکھا کر حمزہ کی اعلیٰ تعلیم اور بڑے گھر کی خوبصورت کہانی سنا کر آ خر منا ہی لیا، اور عارف نے تمہارے ابو کی مانگی گئی رقم کا انتظام کرنے کے لئے مجھے بغیر پتائے گاؤں کی زمین گھانٹے میں بیچ دی، مگر پھر بھی وہ رقم تمہارے ابو کی مانگی رقم سے خاصی کم تھی۔“ ثمنینہ کا سانس پھولنے لگا حمزہ بھاگ کر پانی لے آیا۔ ثمنینہ جلدی جلدی پانی چڑھا گئی جیسے بہت لمبی مسافت طے کر آئی ہو۔

”عارف کو تمہارے ابو پر اعتماد تھا، اور وہ کسی صورت تمہارے باپ کی آفر ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا، اور جلد بازی میں عارف نے ہمارے گھر کی چھت بھی

چھین لی۔ ہمارا گھر جہاں ہم رہتے تھے وہ بھی بیچ دیا، رقم پھر بھی کم تھی البتہ عارف نے سوچا جتنی بھی پیسے کاروبار میں انویسٹ کر کے جو حصہ ہوگا وہ ہماری چھوٹی سی فیملی پر کافی ہوگا۔“ شمینہ کے لہجے میں شدید افسوس نمایاں تھا کہ کاش یہ سب نہ ہوتا۔

حریم دم ساوھے سن رہی تھی۔

”پھر وہ ہوا جس نے ہماری دنیا کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا، تمہارے باپ نے ایک پل نہ لگایا عارف کی امید کا خون کرنے میں۔“

”اتنے کم پیسوں میں کاروبار نہیں ہوتے عارف میاں۔“ فیاض احمد کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

”مگر یار میرے پاس تو میری زندگی کا کل سرمایہ اتنا ہی ہے، میں نے اپنی زمینیں بھی بیچ دی ہیں۔ تم انہیں کاروبار میں لگا لو جتنا حصہ ہو میں راضی ہوں، عارف لجاجت سے بولا۔

”میں نے کہا تھا زمین بیچ دو، اتنی جلدی کیا تھی صرف کہہ دیتے تمہارے پاس نہیں ہیں پیسے، میں نے گھر نہیں بیچا، بارہ معذرت کے ساتھ میں تمہیں اس کاروبار میں شامل نہیں کر سکتا۔“ الفاظ تھے یا تیز و حار چاقو؟ عارف کو لگا اسے فوج کر دیا گیا ہو۔

”پھر ہزار منتیں کیں عارف نے بگر بے سو، فیاض احمد راضی ہونا ہی نہیں چاہتے تھے کسی صورت، کیونکہ انہیں کوئی اور پارٹنر مل چکا تھا تب عارف کو فیاض احمد کا گریز سمجھ آ گیا۔ اور وہ بری طرح ٹوٹ چکے تھے سب لٹا کر بھی خالی ہاتھ رہے۔“ کرب سے شمینہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ حریم کو ان کی آنکھوں میں اپنے ابو کے لئے نفرت واضح نظر آ گئی تھی۔

”بھی تمہارے باپ کا کاروبار چل نکلا، عارف جب فیاض احمد کو دیکھتے۔ ان کا درد اور بڑھ جاتا وہ اذیت کی چکی میں دن رات پستے پستے رہتے تھے، مجھ سے بھی شرمندہ شرمندہ رہتے، پھر ہم نے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا، اور وہاں جا کر ہم نے اپنوں کے بھیا تک اذیت ناک

روئے دیکھے تو ہمیں تمہارے باپ کاویا ہوا دھوکا بہت کم لگا۔ عارف اپنے بھائیوں سے لڑ، جھگڑ کر واپس لے آئے مجھے اور حزنہ کو، اور یہاں فیکٹری میں ملازمت کرنی۔“

”مگر قسمت کو شاید ہمارا سکھ منظور نہ تھا، گاڑی کے چار پیسے مکمل ہوں تو زندگی کی گاڑی آسانی سے سفر کرتی ہے، مگر میری زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ نقدیر نے مجھ سے چھین لیا۔ عارف جس فیکٹری میں کام کرتے تھے وہاں آگ لگ گئی، اور عارف بری طرح جھلس گئے، مگر سائیس باقی تھیں، اور وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ پرائیویٹ ہسپتال کا خرچ برداشت کرتے کرتے میں نے نیچی گئی زمینوں کی رقم عارف کے علاج میں لگا دی، مگر شاید عارف بہت ٹوٹ چکا تھا۔ وہ جینا نہیں چاہتا تھا اور اس بے رحم دنیا میں مجھے اور ننھے حزنہ کو بے آسرا کر گیا،“ شمینہ کی آواز رندھ گئی۔

حریم کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

”حالات کی تیز تبدیلیوں نے میری زندگی کو بے جاں شے کی طرح پھٹروں کے حوالے کر دیا۔ اندر ہی اندر گھٹ کر مر رہی ہوں، کیا تھا اگر ان برے حالاتوں میں تمہارا باپ عارف کا ہاتھ تھام لیتا، تو شاید آج ہم یہاں نہ ہوتے۔ خیر میں تمہیں کیوں قصور وار ٹھہراؤں میری نقدیر میں یہ مذاق لکھا تھا میرے ساتھ۔“ یکدم سناٹا چھا گیا جیسے میدان جنگ میں شکست کے بعد میدان میں خاموش بڑی لاشوں کا ڈھیر ہو۔

حریم کو سخت شرمندگی محسوس ہوئی کہ اس کا باپ کسی کی زندگی کے ساتھ دھوکا کر کے آج اسی کاروبار سے اپنی قسمت چکار رہا ہے۔ اچانک حریم نے شمینہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے، اور بے آواز رونے لگی۔

”تم کیوں معافی مانگتی ہو حریم! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں بس تمہیں اپنا جھٹکتی ہوں، بھی ان ہولنا کیوں کو اپنے اندر نہ سما سکی اور تمہارے سامنے انڈیل دیں۔“ وہ کرب سے مسکرائیں۔

حریم وہاں سے اٹھ کر بھاگ آئی۔ اس کی برداشت

کی طنائیں ٹوٹنے والی تھیں، کافی دیر سڑکوں پر بلاوجہ پھرنے کے بعد وہ گھر آگئی ابھی لمحے اس کے دل نے شدت سے دعا کی اس کا باپ گھر نہ ہو اور حریم سے ان کا سامنا نہ ہو، اور ایسا ہی ہوا۔

☆.....

دو دن حریم کمرے میں بند رہی، نانکہ بیگم (حریم کی امی) پوچھ گچھ کر کے تھک گئیں، مگر وہ ہنوز خاموش تھی۔ اسے رہ رہ کر معصوم حمزہ اور شمینا انٹی کا شکستہ چہرہ یاد آتا رہا۔ ان کا دکھ اسے اپنا لگا۔ کچھ دن دماغ کو کافی حد تک سنبھالنے کے بعد وہ پھر شمینا انٹی کی طرف آگئی، گھر میں قدم رکھتے ہی اسے کافی لوگ نظر آئے جو شاید شمینا انٹی کی مجبوری کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سب کے سب سے بمشکل گزر کر وہ شمینا انٹی کی طرف بڑھی۔ مگر شمینا تو شاید زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھیں۔ حریم کو دیکھ کر ان کے چہرے پر امید کا رنگ آ کر لوٹ گیا۔

”آئی! کیا ہوا چلیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس“..... اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے شمینا نے سر تلی میں ہلایا۔

”نہیں حریم! میرا آخری وقت آ گیا ہے شاید، میرے بعد میرے حمزہ کا کیا ہوگا، وہ تمہارا جائے گا..... تم مجھ سے وعدہ کرو حمزہ کو تمہارا زمانے کی ٹھوکروں کی زد میں نہیں چھوڑو گی، اپنے باپ کی غلطی کا ازالہ کرو گی، میں نے آج پورے دل سے تمہارے ابو کو معاف کر دیا ہے، خدا ما اس کی حفاظت کرنا۔ بڑی محبت بھری نظروں سے شمینا نے ساتھ کھڑے روتے ہوئے حمزہ کو دیکھا۔

”آپ فکر نہ کریں میں وعدہ کرتی ہوں حمزہ میرے ساتھ رہے گا میں رکھوں گی اس کا خیال“۔ بس حریم کا اتنا کہنا تھا، اور شمینا نے نکلے طیبہ پڑھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

حریم حمزہ کو گلے لگانے کے بری طرح ربدی۔

☆.....

مچلے والوں کے ساتھ مل کر حریم نے شمینا انٹی کا کفن کر دیا اور ایک عہد کے ساتھ حمزہ کا ہاتھ تمام کر گھر کی

Section

طرف آگئی۔ آج کی تمام تر تلخیوں سمیت سورج غروب ہو چکا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی، لاؤنج میں بیٹھے فیاض احمد نے اسے پکارا۔

”حریم! وہ رک گئی۔“

”کہاں تھیں تم صبح سے، تمہارے آفس بھی فون کیا مگر تم وہاں بھی نہیں تھیں، اور یہ کون ہے؟ کہاں سے اٹھا لائی ہو اسے“۔ حمزہ پر نظر پڑتے ہی وہ پریشان ہوئے۔

”یہ وہ ہے جس کی زندگی آپ کے دھوکے کی نظر ہوگئی، یہ وہ ہے جس کے باپ کی امیدوں کا چراغ آپ ہی نے جلا کر پھر خود ہی بجھا بھی دیا“۔ وہ یک دم آپے سے باہر ہوگئی۔

”کیا بلکواس ہے صاف صاف کہو“۔ فیاض احمد بھی غصے میں آ چکے تھے۔

”عارف انکل تو یاد ہوں گے آپ کو، انہی کا بیٹا حمزہ ہے یہ“۔ اور پھر حریم نے تمام بات ان کے عارف انکل سے کہنے لگی، سلوک، ان کے گوش گزار کر دیئے۔ حریم کی بات پر شرمندہ ہونے کے بجائے فیاض احمد سچ پا ہو گئے۔

”تو کیا کرتا میں، عارف کے چند پیسے اپنے کاروبار میں شامل کر کے اسے آدھا حصہ دے دیتا، تاکہ آگے چل کر وہ مفت میں آدھے کاروبار کا مالک بن بیٹھتا، اور میں نے تو زمین اور گھر نہیں بیچا تھا اس کا وہ خود عقل سے پیدل تھا اپنے پیر پر کلہاڑی خود ماری اس نے“۔

”عقل سے پیدل نہیں اعتماد کر بیٹھے تھے عارف انکل آپ پر جو آپ نے لالچ میں آ کر بری طرح توڑ دیا تھا“۔ حریم ترشی سے بولی۔

”بند کرو اپنی یہ بلکواس آج ان جیسے لوگوں کی خاطر تم اپنے باپ کے سامنے تن کر کھڑی ہو، اور یہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے جو تم اسے یہاں اٹھا لائیں نکالو اسے باہر“۔ وہ دھاڑے۔

”اگر حمزہ یہاں سے جائے گا تو میں بھی جاؤں گی یہاں سے۔ حمزہ تو یتیم ہے مگر میں اپنے ماں باپ کے

رواڈ انجسٹ 211 فروری 2016ء

ہوتے ہوئے تیسری کی زندگی گزاروں گی۔“ حزرہ کو لئے حریم اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، حریم کو شدید افسوس تھا اپنے باپ کی پست سوچ پر، دونوں باپ بیٹی میں سرد جنگ جاری تھی، فیاض احمد اپنی اکلوتی بیٹی کو گھر سے نکال نہیں سکتے تھے بھی وہ خاموش ہو گئے۔ نائلہ بیگم کو بھی اپنے شوہر سے شکایت تھی کہ انہوں نے غلط کیا تھا، عارف کے ساتھ۔

حریم نے حزرہ کو اسکول داخل کروایا، اس کے لئے نئے کپڑے، یونیفارم، کتابیں لے آئی، پہلی دفعہ بیگ اور کتابوں کو دیکھ کر حزرہ کے سنجیدہ چہرے پر چمک اور خوشی نظر آئی، حریم مطمئن ہو گئی۔ وہ حزرہ کو کسی حد تک نارل کر چکی تھی۔ جب سے شہینہ آنٹی گزریں تھیں وہ بہت سہا ہوا تھا۔

ایک روز صبح وہ حزرہ کو اسکول کے لئے تیار کئے ڈاننگ ٹیبل پر آئی کافی دنوں بعد آج فیاض احمد وہاں موجود تھے۔ حریم کو دیکھ کر وہ اٹھنے لگے بھی حریم نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر نہیں روکا۔

”پلیز ابو مجھے معاف کر دیں میں معافی چاہتی ہوں اس دن کے رویے پر۔“

”ابو پلیز! میری بات سن لیں۔ ایک بار آپ دل سے سوچیں آج حزرہ کو ہماری ضرورت ہے۔ وہ بے سہارا ہے سمینہ آنٹی کی دکھ بھری بچی نکلیں آج بھی مجھے یاد ہیں، میں نے ان سے وعدہ کیا ہے میں حزرہ کو تنہا نہیں کروں گی۔“ کچھ دیر ٹھہر کے حریم نے فیاض احمد کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں شرمندگی کے ہلکے سے آثار نظر آئے۔ بھی حریم کو ہمت ملی اور وہ بولی۔

”ابو! دنیا مکافات عمل ہے۔ یہاں ایک نہ ایک دن اپنے کئے کی سزا مل ہی جاتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سزا کے لئے نہیں چنا بلکہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کا موقع دیا ہے۔ حزرہ کی صورت۔“ وہ نرم پر اثر لہجے میں گویا ہوئی۔

”اگر اس وقت ہمیں بھی کاروبار میں نقصان ہو جاتا

تو، کیونکہ آپ نے بھی اپنی تمام جمع پونجی اسی کاروبار کی نذر کر دی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا اللہ تعالیٰ نے آپ کا ہاتھ تھاما۔ آپ کو بلندی عطا کی۔ ورنہ آج ہم بھی حزرہ کی جگہ ہوتے بے سرد سامان۔“ فیاض احمد نے چونک کر حریم کو دیکھا۔ جو آج انہیں حقیقت سے آشنا کروا رہی تھی۔

”آج آپ حزرہ کا ہاتھ تھام لیں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ حزرہ اور عارف انکل کی آہ ہمیں نہ لے ڈوبے۔ شہینہ آنٹی آخری وقت میں آپ کو پورے دل سے معاف کر چکی ہیں۔“ حریم کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور وہ بچی نظروں سے اپنے باپ کو دیکھنے لگی۔

کہتے ہیں ماں اللہ تعالیٰ اگر ایک در بند کرتا ہے، تو دوسرا در کھول دیتا ہے اللہ نے حزرہ کے لئے بھی دوسرا در کھول دیا تھا، حریم کی صورت میں اور اللہ نے فیاض احمد کا دل بھی پھیر دیا تھا، وہ کرسی دھکیل کر کھڑے ہو گئے اور چلتے ہوئے حزرہ کے پاس جا کر، حزرہ کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”میں جانتا ہوں میں نے آخری وقت پر عارف کو دھوکا دیا لالچ میں آ کر جبکہ میں جانتا تھا، وہ اپنے گھر کی چھت بھی فردخت کر چکا ہے۔ میں شرمندہ ہوں، بیٹا تم سے مگر آج مجھے میری بیٹی نے احساسِ ولادیا کہ جس حقیقت سے میں نظریں چرا رہا تھا، وہ بھی چھپ نہیں سکتی۔ بہر حال آج سے میرے دو بچے ہوں گے ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔“ وہ مسکرائے۔

”بچی ابو.....؟“ حریم کے لہجے سے سچی خوشی عیاں تھی آج اس نے اپنے وعدے کو نبھایا تھا، اور ایک مثال قائم کی تھی کہ اپنی غلطی کو ماننا اور اس کی تلافی کرنا بہت ضروری اور اہم ہے، وہ بھاگ کر فیاض احمد سے لپٹ گئی، اور حزرہ نے بھی اپنے چھوٹے چھوٹے بازو پھیلائے اور فیاض احمد سے لپٹ گیا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ پاس کھڑی نائلہ بیگم بھی مسکرائیں، آج حزرہ کے روشن مستقبل کی تاریکی چھٹ گئی تھی۔

☆.....

Downloaded From
Paksociety.com

عائشہ ذوالفقار

سلسلہ وار ناولٹ

اڑ جا رہی تیری باری

24 سال اس کے دل نے صرف ایک ہی کام کیا۔ بلڈ پمپ کرنے کا۔ 24 سال فزکس کی خشک ڈایا گرامز دیکھ دیکھ کے آنکھیں تنگ آ گئیں مگر اس نے کوئی اور کام نہیں سونپا۔ وہ تو پیار کے اسپینگ بھی PIAR لکھتا تھا۔ 25 سال کسی سیپ میں محفوظ موتی کی طرح گزارے تھے اس نے مگر اب ٹھوڑا تو حق بننا تھا نا اس کا۔ کم از کم اتنا تو بننا تھا کہ وہ پیار کے ٹھیک اسپینگ سیکھ سکے۔ دل کو کسی کے نام پر دھڑکنا سیکھا سکے۔ آنکھوں کو کسی اور کے خواب دیکھنا سکھا سکے۔ بننا تھا نا۔

☆.....☆

وہ پانی پینے نیچے آیا تو فیملی ابھی تک ٹی وی کے آگے بیٹھی ہوئی تھی۔
بقائی! آپ ابھی تک سوئے نہیں؟“ نمرہ نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

Downloaded From Paksociety.com

Junaid Ansari

”نیند نہیں آرہی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔
”مسئلہ کیا ہے، بھئی، پہلے تو آٹھ بجے ہی تمہاری آنکھیں بند ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔ اب دس بجے بھی نیند
غائب ہے۔ اماں یہ کئی دنوں سے ایسا ہے اسے کچھ ہوا ہے؟“ ناعمہ تو دیکھنے ہی اس کی دشمن تھی۔ محض اسے گھورتا
وہ اوپر آ گیا۔
”اسے کچھ ہوا ہے؟“

کیا ہوا تھا اسے، کچھ تو ہوا تھا جو وہ سونا بھول گیا تھا۔ شاید وہ تھک گیا تھا۔ اکیلا جیتے جیتے تنہا چلتے
چلتے..... شروع سے ہی عادت تھی اسے اکیلا رہنے کی۔ ماں، باپ اور دو بہنوں کے باوجود وہ اپنی اس عادت کو
چھوڑ نہ سکا۔ اپنے خول سے باہر نہ نکل سکا۔ اس کے بارے میں اگر کوئی تھوڑا بہت جانتا تھا تو وہ مسلمان تھا، بس
بڑی صفائی سے اس نے اپنا ظاہر اور باطن الگ کر رکھا تھا۔ نہ خود کسی کی خوشیوں میں شریک ہوتا۔ نہ دوسروں کو
اپنی خوشیوں میں شریک ہونے دیتا۔ زندگی کے 24 سال ایسے ہی گزار دیئے، تنہا، اکیلے مگر آخر کب تک۔ آخر
کب تک دل سینے میں بند رہتا۔ کب تک آنکھیں پلکوں میں چھپی رہتیں۔ قدم بھی اب شاید تھک گئے تھے۔
اسے کسی کا ہاتھ تمام لینے کو کہہ رہے تھے۔ کوئی ایسا جو ہمیشہ سنگ سنگ چلے، اس کے ہر دکھ، ہر سکھ کو سنگ سنگ

وسط نمبر 3

READING
Section

چکھے۔ جو اس کی مضبوط پناہوں میں ہمیشہ کے لیے قید ہو جائے، کبھی باہر نہ نکلنے کے لیے۔

☆.....☆

اس دن عمیر کی پریزینٹیشن تھی۔ سب نے کوئی نہ کوئی کمنٹ دیا۔ حائقہ کچھ نہ بولی۔ عمیر خود اس کی طرف مڑا۔
”میم آئی وٹس کہ آپ بھی کچھ کہیں؟“ حائقہ ہولے سے مسکرائی تھی۔
”میرا کہنا شاید آپ کو اچھا نہ لگے۔“ عمیر نے مسکراتے ہوئے اسے بولنے کا اشارہ کیا۔
”مسٹر عمیر! کسی کو کاپی کرنا بری بات نہیں ہے مگر فل کاپی کرنا بری بات ہے۔ میں بھی سر شوکت کو کاپی کرتی ہوں مگر صرف ان کی اچھائیاں، برائیاں نہیں۔ آپ ان کی برائیاں بھی کاپی کرتے ہیں۔“ عمیر نے ضبط کرتے ہوئے اپنی مٹھیاں پینچیں۔
”میں بھی پڑھانے کے بعد ٹاپک لکھتی ہوں۔ لیکن لکھ دیتی ہوں۔ بٹ سی آپ تو لکھ ہی نہیں پائے۔“ واقعی بورڈ پر عنوان نہیں تھا۔
”کہیں اور ہی پہنچ گئے آپ اور اس کی سب سے بڑی وجہ آپ کا اوور کانفیڈنس ہے۔“ عمیر کی آنکھوں سے جیسے شرارے نکلنے لگے تھے۔
”آپ کے پاس بہت مانع ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن آپ ایک ہی لیکچر میں سارا مانع ڈلیور نہیں کر سکتے۔“

عمیر ہولے سے مسکرایا تھا۔ ”تقید کرنا آسان ہے۔ سہنا مشکل۔“

حائقہ مسکرائی۔ ”آپ مجھے ڈرارے ہیں؟“

عمیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں میں آپ کو بتا رہا ہوں۔“

برداشت کی آخری حدوں کو چھوتا وہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس نے اپنی ہر بات کے جواب میں صرف ایک لفظ سنا تھا، ہاں۔ اپنی ہر خواہش کو پورا ہوتے دیکھا تھا۔ ہرزبان سے اپنے لیے صرف تعریف سنی تھی اور 24 سال بہت ہوتے ہیں تعریفوں کا عادی ہونے کے لیے۔ ہر بات کے جواب میں صرف ہاں سننے کا عادی ہونے کے لیے۔ وہ بھی عادی ہو چکا تھا بھی تو جب پہلی بار حارث نے اس کی بات کے جواب میں ”ناں“ کہا تو وہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اس کی کڑوی باتیں سہہ نہیں سکا تھا۔ اس کے جوابی لفظ سن نہیں سکا تھا اور ہوا یہ کہ بجائے وہ اپنی اس عادت کو چھوڑنے کے حارث کے خلاف ہوتا چلا گیا۔ اسے کسی نہ کسی صورت اپنے سامنے جھکانے کے درپے ہو گیا اور حارث..... وہ حمزہ نہیں تھا جو اسے برداشت کر لیتا۔ وہ تو خود من موجدی تھا۔ اپنے خول میں بند۔ اپنی مرضی سے جینے کا عادی۔ وہ کسی صورت اپنی لگا میں عمیر کے ہاتھ میں نہ دے سکا۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی اُدھر اُدھر نہ ہوسکا اور یہیں سے اس کے اور عمیر کے درمیان نفرت کی ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو گئی۔ جسے دونوں میں سے کسی نے بھی ختم کرنے کی کوشش نہ کی اور اب حارث کے بعد..... حائقہ ارشد۔ وہ انگلی اٹھا رہی تھی اس کے آگے۔ بول رہی تھی اس کے آگے تقید کر رہی تھی اس پر۔ وہ کیسے برداشت کر لیتا۔ حائقہ کی پریزینٹیشن پر وہ خود ہی بغیر کسی دعوت کے اٹھ کھڑا ہوا۔
”آپ کی اسپید بہت تیز ہے؟“ پہلا کمنٹ۔

”بالکل، کیونکہ میرا کام بچوں کو سمجھانا ہے۔ سلا نا نہیں۔ یہ کام ان کی مدد زیادہ بہتر طریقے سے کر لیتی

ہیں۔“

“آپ مشکل چیز کو آسان نہیں کرتیں۔“ دوسرا کمنٹ۔

“کیونکہ مشکل چیز کسی صورت آسان نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس کے کہ وہ ہمیں آجائے اور مشکل چیز آسانی سے تو سمجھ میں نہیں آتی۔ مشکل سے ہی آتی ہے۔ اگر وہ آسان ہو سکتی تو مشکل طریقے سے نہ دی جاتی۔“

“آپ کی آواز تھوڑی آہستہ ہے۔“ تیسرا کمنٹ۔

“میرے ڈسپلن کے حساب سے میری آواز ٹھیک ہے۔ تیز آواز کانوں میں لگتی ہے۔“ عمیر ہولے سے مسکرایا تھا۔

“دیے بھی آپ جہاں پڑھاتی ہیں وہاں ایک کلاس میں بمشکل 10, 12 بچے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے حساب سے ٹھیک ہے۔“ حائقہ اس کا مطلب سمجھ گئی۔

“جب میں 400 بچوں کی کلاس لیتی تھی۔ تب بھی میری آواز اتنی ہی ہوتی تھی۔ مسٹر عمیر راؤ۔“ عمیر مسکرا کے رہ گیا۔

“اور ویسے بھی مجھے وہ 10-12 بچے ہی کافی ہیں کیونکہ وہ خالصتا میرے ہیں۔ کسی کی پکی پکائی کھیر نہیں ہیں۔“ اب عمیر کو غصہ آیا۔

“پکی پکائی کھیر کھانا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے میم۔ بلکہ ایک دفعہ پکی پکائی مل جائے تو دوسری بار خود پکانے کا دل کر ہی جاتا ہے۔ پر آپ کیا جانیں۔ نہ تو یہ بھی آپ کو ملی اور نہ آپ کے پاس کو۔“ حائقہ کو پختے لگ گئے۔

“آپ کچھ نہیں جانتے مسٹر! نہ میرے بارے میں اور نہ میرے پاس کے بارے میں۔“ عمیر کی مسکراہٹ اسے آگ لگا گئی۔

“آپ کے بارے میں نہ سہی مگر آپ کے پاس کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں اتنا شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔“ حائقہ کے کچھ بولے۔ لہجے پہلے ہی سر عمران نے دونوں کو خاموش کر دیا۔ مگر بریک ٹائم میں عمیر اسے کہے بغیر رہ نہ سکا۔

“میم حائقہ! بے شک میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ آپ بھی میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ سو بنا جانے مجھے مت للکاریں، اچھا نہیں ہوگا۔“ حائقہ نے اس آنکھوں میں جھانکا تھا۔

“کتنا اچھا نہیں ہوگا؟“ وہ بولی تھی۔

“حارث سے پوچھیے گا۔ وہ زیادہ بہتر طریقے سے بتا دے گا آپ کو۔“ حائقہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆.....☆

گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی وہ بھاگتی ہوئی 10th کلاس کی طرف بڑھی تھی۔ جب ایک دم حارث سامنے آیا۔ اس نے بمشکل خود کو بریک لگائے تھے۔

”شکر ہے بچت ہو گئی۔ آج گلانز ہیں میرے، سوری۔“ مسکرا کے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی تو حارث نے پکار لیا۔

”آپ ہمیشہ اتنی جلدی میں کیوں ہوتی ہیں؟“ حائقہ مڑی تھی۔

”وہ ڈاٹسلاگ تو سنا ہوگا۔ آپ نے کہ لائف از آریس، تیز نہیں بھاگو گے تو کوئی تمہیں کچل دے گا، سو

ردا انجسٹ [217] فروری 2016ء

READING
Section

بھاگتا ہی ٹھیک ہے۔“ حارث ہولے سے ہنسا۔

”اور اگر اتنا تیز بھاگتے ہوئے گر گئیں تو.....“ اس نے پوچھا۔

”تو دوبارہ کھڑی ہو جاؤں گی۔“ اس نے فوراً جواب دیا تھا۔

”لیکن اگر زیادہ چوٹ لگ گئی تو فوراً سے تو نہیں کھڑا ہوا جائے گا۔ تب کچلے جانے کے چانسز بڑھ جائیں گے نا۔“ حارث کی بات شاید درست تھی۔

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پیچھے سے آنے والے آپ کی چوٹ دیکھ کر آپ پر ترس کھالیں اور کچلے بنا ہی آگے بڑھ جائیں۔“

حارث پھر مسکرایا۔ ”بڑی بھولی ہیں آپ۔ مز بھی رہے ہوں تو لوگ ترس نہیں کھاتے۔“

حائقہ جیسے ہار گئی۔ ”اچھا ٹھیک ہے لوگ نہ سہی، آپ تو کھالیں گے ناں مجھ پر ترس کہ نہیں؟“



حارث جو اب اچھوٹا سا لڑکا تھا۔

”ہائے آئی! ایم عمیر راؤ۔“ اس دن میری ٹریننگ کافر سٹ ڈے تھا جب اس نے آ کے اپنا تعارف کر دیا۔

جس شخص کے بارے میں آپ نے بہت کچھ سنا ہو اور وہ ایک دم سے یوں آپ کے سامنے آ جائے تو حیرانی بھی

ہوتی ہے۔ خوشی بھی ہوتی ہے اور اگر وہ شخص عمیر راؤ ہو تو عجیب سی چہن بھی ہوتی ہے۔ پہلی ملاقات میں کافی میچور

لگا وہ مجھے۔ شام تک ذہن سے نہ اتر سکا میں نے سوچا شاید پہلی بار ملی ہوں اس لیے ایسا ہو رہا ہے مگر دوسرا دن،

تیسرا دن..... وہ تو چھانے لگا دماغ پر۔ کتنی بھی کوشش کرتی پر وہ دور ہوتا ہی نہ تھا اور اس دن مجھے پہلی بار اس پر

غصہ آیا جس دن اس نے میرا پ بننے کی کوشش کی۔ میں لاکھ لکھ مزاج سہی مگر اس قدر تنقید کی عیاد کی نہیں تھی سو

غصہ آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ شاید میں کچھ زیادہ بول گئی تھی۔ دل نے کہا

کہ جا کے سوری کہوں، پھر دماغ نے اجازت نہ دی اور جس دن میری پریزنٹیشن تھی اس دن تو حد ہو گئی۔ تنقید پر

تنقید..... کمنٹ پر کمنٹ..... میں نے بھی سارے ادب آداب ایک طرف رکھ دئے۔ خوب بحث کی اور تب

اندازہ ہوا کہ مجھے اس سے بحث کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ حارث کے اس قدر خلاف کیوں تھا مگر

مجھے یہ بھی نہ پتا چلا کہ وہ میرے خلاف بھی ہونے لگا تھا اور میں..... مجھے تو سمجھ ہی نہ آئی کہ ہوا کیا؟ پتا نہیں کب

وہ دروازہ دل پر دستک دینے لگا اور دل نے دروازہ کھول بھی دیا۔ مجھ سے پوچھے بغیر وہ اندر آ گیا۔ میرے دل پر

قبضہ کر لیا۔ اسے دیکھنا اچھا لگنے لگا۔ اسے سننا اچھا لگنے لگا، اس سے باتیں کرنا اچھا لگنے لگا۔ غبار کی طرح میرے

دماغ پر چھا گیا وہ، میں کسی سے کہہ بھی نہ سکی یہ ساری صورت حال بالکل نئی تھی میرے لیے ٹریننگ کے لاسٹ

دن تو جیسے خود پر قابو رکھنا دشوار ہو گیا۔ لاکھ میں نے آنکھوں پر پھرے، بٹھانے کی کوشش کی مگر بے سود..... ہال

میں داخل ہوتے ہی آنکھیں پانگلوں کی طرح اسے کھوجنا شروع ہو گئیں۔ وہ اپنے گروپ کے ساتھ کھڑا تھا،

گرے تھری پیس میں بلبوس قدم ضدی بچوں کی طرح اس کی طرف ہنکنے لگے میں اس سے چند قدم دور تھی جب

اس نے مجھے دیکھا، ہلکی سی سٹانس ابھری تھی اس کی آنکھوں میں (آنکھیں پڑھنا بھی آ گیا تھا مجھے) بٹھاتے

بٹھاتے بھی نظریں اس پر سے نہ نہیں، آخر تک آ کر میں نے آنکھیں زور سے بند کیں اور کرسی پر گر گئی۔ دل

میرے ساتھ ہی رو دیا تھا۔ مجھے اس دن کچھ اچھا نہ لگا۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہ کیا۔ بس وہ..... صرف

وہ..... میری آنکھیں جیسے میرے بس میں ہی نہ رہیں۔ جب موقع ملتا، اسے دیکھنے لگ جاتیں، فنکشن ختم ہوتے

ہوتے میری بس ہو گئی۔ دکھ کی انتہاؤں پر پہنچتے ہوئے میں بیگ اٹھا کے بیرونی دروازے کی طرف آئی تھی۔ ایک بار صرف ایک بار اور..... آنکھیں تڑپ تڑپ کے فریاد کرنے لگیں۔ میں جیسے ہی مڑی وہ ایکدم میرے سامنے آیا تھا۔

”آپ جا رہی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”جی.....!“ میں بمشکل کہہ پائی۔

”میم! آئی دش کے آسمندہ اگر ہماری ملاقات ہو تو اچھے موقع پر اچھے الفاظ کے ساتھ ہو۔ ورنہ نہ ہو۔“ اس نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ میں نے جیسے اسے آنکھوں میں قید کیا تھا۔ وہ واپس مڑ گیا۔ میں پلٹ گئی۔ خود پر رکھا سارا قابو ختم ہو گیا۔ برستی آنکھوں کے ساتھ میں بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔ چوبیس دنوں میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ میری دنیا بدل گئی تھی اور اسے پتا بھی نہ تھا۔

☆.....☆

عارش کا فرسٹ ایئر کارزلٹ بہت شاندار آیا۔ مجھے بے حد خوشی تھی۔ صرف عارش کی وجہ سے وزڈوم اکیڈمی کو پوزیشن ملی تھی۔ پہلی دفعہ ان کا کوئی ٹاپر سامنے آیا تھا۔ حمزہ خود اس کا گفٹ لے کر گھر آیا مگر میں اس سے نہ ملی۔ میرا دل ویسے بھی ان دنوں عجب دکھی دکھی سا تھا۔ فرسٹ ایئر کے بعد حارث نے زور لگایا کہ میں عارش کو وی اشار لے کر آؤں مگر عارش نہ مانا، وہ وہیں مطمئن تھا۔ چند دن بعد حمزہ کی والدہ پھر آئیں وہ منگنی پر اصرار کر رہی تھیں۔

”صرف منگنی کر لیتے ہیں اس کے بعد چاہے جتنا مرضی وقت لے لیں۔“ اماں نے سوچنے کے لیے وقت لیا اور شام کو مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ وہی لمبی سی تقریر اچھے رشتوں کی کمی کا رونا، پھر اپنے حالات کا رونا۔ پھر حمزہ کی اچھائیاں..... میں جب چاپ سکتی رہی۔

”کیا کہتی ہو پھر؟“ آخر میں رسمی طور پر مجھ سے پوچھا۔

”جیسے آپ بہتر سمجھیں مگر جب تک عارش کا ایڈیشن نہیں ہو جاتا۔ تب تک میں نے شادی نہیں کروانی۔“ کہہ کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ دل بہت ہی رو رہا تھا۔ ایسے تھوڑی نہ ہونا چاہیے۔ جب کوئی ہماری قسمت میں لکھا ہی نہیں ہوتا تو لائف میں کیوں آتا ہے؟ اتنا اچھا کیوں لگتا ہے۔ سیدھا دل میں کیوں اترتا ہے۔ کیوں؟ میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکلے تھے ابھی تو اصلی والا پیار کرنا شروع بھی نہیں کیا تھا ابھی تو بس پہلی نظر کا پیار ہوا تھا، وہ جس کے بعد بار بار دیکھنے کو دل کرتا ہے، ہر لمحہ سننے کو دل کرتا ہے، وہ جو سے تاب کر رہا ہے، ابھی تو دل نے ٹھیک سے دھڑکنہ بھی نہیں سیکھا تھا، ابھی تو آنکھوں نے سنے دیکھنے شروع بھی نہیں کیئے تھے کہ سب ختم بھی ہو گیا، ایسے ہوتا ہے کیا؟ ایسے تو نہیں ہونا چاہیے، اس رات شانندہ میں عمیر کے پیار میں آخری بار روئی اور اسے دل کے کسی خفی کو نے میں دن کروا۔

☆.....☆

”مبارک ہو حائقہ، آپ کی کلاس میں آج دو بچوں کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔“ وہ فرسٹ ایئر سے نکلی تو حارث سامنے سے آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بول پڑا۔

”پہلے تو کبھی مبارکباد نہیں دی آپ نے نئے بچوں کے آنے پر، یہ کوئی خاص بچے ہیں کیا؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”یونہی سمجھ لیں، کیونکہ یہ رائل سے آئے ہیں۔“ حائقہ ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔
 ”آج پہلی دفعہ رائل کا کوئی بچہ یہاں آیا ہے۔“ حائقہ کو حارث کی آنکھوں میں خوشی کے علاوہ بہت کچھ نظر آیا۔
 ”رائل سے کیا پرابلم ہے آپ کو حارث؟“ آج اس نے پوچھ ہی لیا۔
 ”مجھے رائل سے کوئی پرابلم نہیں ہے اور جس سے ہے اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا میں۔“ وہ کہہ کر آگے
 بڑھنے لگا تھا۔

”عمیراؤ سے ہے؟“ حارث ایک دم رک گیا۔
 ”آپ کو کس نے کہا؟“ حائقہ ہولے سے مسکرائی۔
 ”کسی نے نہیں اور کسی کے کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، لہجہ سمجھنے آتے ہیں مجھے۔“ حارث بول نہ سکا۔
 ”آپ کا نام لیتے ہوئے جو نفرت اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی، میں نے وہ آپ کی آنکھوں میں بھی نظر
 آ رہی ہے۔“ حائقہ بولی۔

”اس نے کچھ کہا ہے آپ سے؟“ حارث نے پوچھا تھا۔
 ”نی الحال تو اپنے رستے میں آنے سے منع کیا ہے۔“ حارث کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔
 ”اسے بس یہی کام تو ڈھنگ سے آتا ہے۔ کہنا اور منوانا، ماننا نہیں آتا۔“ حارث کہتے ہوئے آگے بڑھ
 گیا۔ حائقہ اس قدر نفرت کی وجہ سمجھ نہ سکی۔ وہاں سے نکل کے وہ سیدھا رائل اکیڈمی آیا تھا۔
 ”عمیرا کو بلا دیں۔“ اس نے اسٹاف روم میں بیٹھتے ہوئے چہرہ اسی سے کہا۔ چند منٹ بعد عمیرا کی آواز
 ”تم..... پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کب سے امت آگئی یہاں قدم رکھنے کی۔“ عمیرا آگے آیا تھا۔
 ”میں تو صرف تمہاری طبیعت پوچھنے آیا تھا۔“ ویش اس نے کہا۔ ”Get well soon نے حارث کی طرف بڑھایا۔

”تمہیں شاید ابھی خبر نہ ہو بس بتا دیتا ہوں تمہاری اکیڈمی سے دو اسٹوڈنٹس آج میرے پاس آئے ہیں، وجہ
 سر عمیرا کی سمجھ نہیں آتی۔“ حارث کی مسکراہٹ اور باتیں اسے سر تاپا سا لگیں۔
 ”تمہیں کیا لگتا ہے کہ دو اسٹوڈنٹس کے چلے جانے سے مجھے فرق پڑے گا۔“ حارث اس کے سامنے آیا۔
 ”بالکل پڑے گا کیونکہ جب ایک انگلی میں درد ہوتا ہے تو پورے جسم کو فرق پڑتا ہے۔“ عمیرا غصے کے مارے
 بول نہ سکا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس وقت تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے۔ کیونکہ تم نے تو یہ درد آج سہا ہے ناں میں پچھلے تین
 سال سے سہہ رہا ہوں۔ ایسے ہی کارڈ بیچتے تھے ناں تم جب ایک بھی اسٹوڈنٹ میری اکیڈمی چھوڑ کر تمہاری طرف آتا
 تھا۔ میری دراز بھری ہوئی ہے ان Get well soon کے کارڈز سے۔“ حارث کی آواز اونچی ہو گئی۔
 ”بٹ ڈونٹ وری، تمہارا وقت لگتا ہے مگر پھر عادت ہو جاتی ہے، تمہیں بھی ہو جائے گی۔“ حارث کہتے
 ہوئے اس کے پاس سے گزر کے باہر کی طرف مڑا تھا، جب عمیرا کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔
 ”بہتر ہو گا تم اسے سمجھا دو، ورنہ میرے سمجھانے کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔“ حارث نے مسکراتے ہوئے اس کی
 طرف دیکھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم کہو گے اور میں اسے سمجھا دوں گا، نو عمیراؤ! میں نے تمہاری باتیں ہی مانتی ہوتی تو

میرے اور تمہارے درمیان 24 سالوں کی دشمنی نہ ہوتی۔“ کہتے ہوئے وہ ذرا سار کا تھا۔
 ”اور ایک بات اور اسے سمجھانے جس بھی رستے سے آؤ گے ناں پہلے میں ہی ملوں گا۔“ حارث کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ غصے سے عمیر کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میز پر پڑا کارڈ اس نے پھاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔
 ”اچھا نہیں کر رہیں تم.....“ دونوں بازو میز پر ٹکاتے ہوئے وہ بولا تھا۔

☆.....☆

وہ اس دن کلاس لے کر اسٹاف روم میں آیا تو حائقہ پہلے سے بیٹھی چائے پی رہی تھی۔
 ”کیا پڑھاتے رہتے ہیں آپ اتنی دیر مجھ سے تو بمشکل 20 منٹ ہی پڑھایا جاتا ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر بولی۔
 ”بس جی آپ تو پھر آپ ہیں ناں اب میں آپ جیسا تو نہیں بن سکتا ناں۔“ حائقہ اس کی بات پر دل کھول کر ہنسی اور دو بارہ چائے کے سب لینے لگی۔ حارث نے یونہی اس کی طرف دیکھا اور پھر کافی دیر تک نظر س نہ ہٹا سکا۔ کیا تھا اس میں۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ یا شاید بہت کچھ سب کچھ بڑے حق سے اس کے دل میں اتری تھی وہ، اتراتے ہوئے مسکراتے ہوئے اور وہ بس حیرانی سے اس کے سینے میں مقید دل کو ایک لمحے میں چڑھایا تھا اس نے اور وہ بس حیرانی سے اسے تنکا رہ گیا تھا۔ اب بھی حائقہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس سے کچھ پوچھا مگر وہ اس قدر مگن تھا کہ سن نہ سکا۔ دوسری بار کہنے کے بعد حائقہ نے اس کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ ایک دم ہوش کی دنیا میں واپس آیا تھا۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔“ حائقہ تیز لہجے میں بولی تھی۔

”جی..... کیا.....؟“ حارث کے یوں پوچھنے پر وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”آپ کے ساتھ کوئی پرائیلم ہے کیا ان دنوں؟“ اس کے پوچھنے پر حارث گڑبڑا گیا۔

”نہیں تو..... کیوں؟“ حائقہ آگے کو ہونٹی اور بولی۔

”بڑے عجیب سے ہو گئے ہیں آپ ان دنوں، کھوئے کھوئے ایسا لگتا ہے جیسے بات کرتے کرتے کہیں اور پہنچ جاتے ہیں آپ، جیسے ابھی پہنچ گئے تھے۔“

حارث بول نہ سکا۔

”کوئی پرائیلم ہے تو شیئر کر لیں، مجھ سے نہ سبھی مسلمان صاحب سے ہی کر لیں، وہ تو دوست ہیں آپ کے۔“ اسے کہتے ہوئے وہ پوائنٹر اٹھا کے باہر نکل گئی۔ حارث نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور لمبا سانس لیا۔

”تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا۔ حارث جاوید.....!“ اس نے جیسے خود سے کہا۔

”اب تو ملکہ دل بھی حال دل جاننے لگی ہے۔ کنٹرول حارث کنٹرول.....“ لیکن خود کو تو شاید وہ کنٹرول کر ہی لیتا مگر دل اور آنکھوں کو کیسے کنٹرول کرنا جو اسے دیکھتے ہی پاگل ہو جاتے تھے۔ اس کی یہ حالت مسلمان سے بھی چھپی نہ رہ سکی اور ایک دن اس نے حارث کو گھیر ہی لیا۔

”جو کرنا ہے ناں کھل کے کر لے، یوں چھپ چھپ کر کرنا زیادہ برا لگتا ہے تو۔“ حارث جھینپ گیا۔

”میں نے کیا کیا۔“ بولا تو آواز وہی تھی۔

”نہیں کیا تو کرے گا تو نے کون سا رک جانا ہے۔“ مسلمان ہنسا تھا۔ حارث بھی مسکرا دیا۔

”یہ ہی ہے ناں؟“ مسلمان نے برآمدے میں ٹیٹ لیتی حائقہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”ٹھیک ہے ناں۔“ حارث نے جواباً پوچھا۔

”یہ تو ٹھیک ہے پر تو خود کو بھی ٹھیک رکھ، جہاں دیکھتا ہے آنکھیں پھاڑ کے کھڑا ہو جاتا ہے، بیٹے ایسے ہی رہا ناں تو چند دن لحاظ کرنے کے بعد تجھے خود ٹھیک کر دے گی۔“ حارث نے ہنستے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

”کیا کروں میں یا ر؟ اب عادت تھوڑی ناں ہے روز روز پیار کرنے کی جو پتا ہو کہ کیسے کرتے ہیں، پہلی بار ہے ہوتے ہوتے ہی آئے گا۔“ سلمان آگے کو ہوا تھا۔

”پہلی بار..... تو علیزہ سے کیا ہوا تھا۔“ حارث چند لمحے بول نہ سکا۔ پھر ایک لمبا سانس بھر کے سلمان کی طرف مڑا۔

”سلمان اس رات بالکل ٹھیک کہا تھا اس نے، میں اس کے پیار میں عمیر سے نہیں لڑا تھا۔ اپنی نفرت میں لڑا تھا۔ صرف عمیر کو سبق سکھانے کے لیے میں اس کے قریب گیا تھا مجھے اگر اس سے پیار ہوتا تو آج وہ میرے دل میں زندہ ہوتی۔“ وہ کہتے ہوئے ذرا سا رکا۔

”اب کہاں جا رہا ہے۔“ سلمان بولا تھا۔ ”وہ گھورنا شروع ہو گئی ہے۔ چند لمحے اور یہاں رکا تو بہت کچھ سنا دے گی۔“ حارث ہنستے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

☆.....☆

اس دن رائل اکیڈمی میں پوزیشن ہولڈرز کے لیے فنکشن تھا۔ حارث نے تو جانا ہی نہ تھا سو سلمان اکیلا ہی گیا۔ حمزہ بھی آیا ہوا تھا۔ عمیر کچھ نہ کہتے کہتے بھی سلمان سے کہہ ہی گیا۔

”اور سناؤ تمہاری وہ فزکس جیٹ کیسی ہے؟“ بہت کچھ تھا اس کے لہجے میں جو سلمان جیسا بندہ بھی محسوس کر گیا۔

”تمہاری دعاؤں سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔“ عمیر مسکرایا تھا۔

”ایک مشورہ دوں؟“ سلمان نے اس سے کہا۔ عمیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”شادی کر لو شاید تمہاری باتوں میں ذرا نرمی آجائے۔“ عمیر نے ہولے سے مسکرا کے اسے دیکھا۔

”یہ مشورہ تم اپنے دوست کو بھی دینا، اس کی باتیں بھی کوئی ریشم کے دھاگے نہیں ہوتیں۔“ عمیر کا لہجہ نرم نہ ہو سکا۔

”اس کی شادی کا کارڈ تو بہت جلد مل جائے گا تمہیں موصوف آج کل پیار کے مزے لے رہے ہیں۔“ حارث کا ذکر ہی عمیر کو تلخ کر دیتا تھا۔

”ظاہر ہے علیزہ سے پیار اس نے تھوڑی کیا تھا، میں نے کیا تھا، میرا پیار برباد کرنے کے بعد اب اس نے مزے ہی اڑانے ہیں اور آتا ہی کیا ہے اسے سوائے گھٹیا پن کے۔“ عمیر کی آنکھیں چنگاریاں برسا رہی تھیں۔

”ویسے کس کی قسمت پھوڑ رہا ہے۔“ سلمان اس کے لہجے پر ہنس دیا۔

”اپنی فزکس جیٹ کی۔“ سلمان کی بات پر وہ کافی دیر تک بول نہ سکا۔ انتہائی برا لگا تھا اسے یہ خبر سن کر۔

”کیا حال ہے سلمان؟“ حمزہ آیا تو سلمان اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عمیر کا دل یکدم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ دھیرے سے اس کے لبوں سے سرگوشی نکل گئی۔

”حارث جاوید.....“ اس کا بدترین دشمن اس کے لیے نفرت کا دوسرا نام اس کے پیار کا غاصب، وہ حارث

کے لیے اپنی پوری زندگی نہ تو اچھا سوچ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کے حق میں اچھا ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ علیزہ کے جانے کے بعد تو وہ اسے زہر کی طرح برا لگنے لگا تھا اور دوسری طرف.....“

”حائقہ.....!“ اس کے لبوں سے دوسری سرگوشی نکلی۔
 ”حائقہ ارشد۔“ وہ پہلے دن سے اسے تکلیف دے رہی تھی۔ اس کی راہ کی رکاوٹ بن رہی تھی۔ اس کی بادشاہت میں آہستہ آہستہ داخل ہو رہی تھی۔ اس سے اس کی شہرت چھین رہی تھی۔

”اگر یہ دونوں ایک ہو گئے تو.....؟“ اس کے ذہن نے سوال اٹھایا تھا۔
 ”تو جو ہوگا اچھا نہیں ہوگا، ابھی تو صرف دو اسٹوڈنٹس حارث کی طرف گئے ہیں پھر مزید جانا شروع ہو جائیں گے۔ ابھی تو صرف ایک کارڈ آیا تھا گیٹ ویل سون کا، پھر رفتہ رفتہ اس کی دروازہ بھی بھرنے لگی۔ آہستہ آہستہ سب کچھ چھین لے گی وہ.....“ آنے والا وقت اسے خوب ڈرا رہا تھا۔

”نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ عمیر کے ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔
 ”میں اس بار حارث کو کچھ چھیننے نہیں دوں گا بلکہ.....“ علیزہ کا چہرہ اس کی نظروں میں آ گیا۔
 ”بلکہ اس بار میں اس کا پیار چھینوں گا۔ جو در دو تین سال پہلے اس نے مجھے دیا تھا اس بار میں اسے دوں گا اور حائقہ۔“ اس کی آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔

”بس بہت ہو گیا۔ اس سے زیادہ برداشت نہیں ہے مجھ میں سوری۔“ کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرا دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرنا کچھ اور ہی ہو گیا۔

☆.....☆

بانیک ایک طرف کھڑی کر کے وہ اندر داخل ہوا۔ ہر کلاس سے پڑھانے کی آوازیں باہر آرہی تھیں۔ کچھ سوچ کر اس نے حارث کا نمبر ملایا اور سیل کان سے لگا تا دروازے کی طرف آ گیا۔ ابھی پہلی بیل ہی گئی تھی کہ کوئی پیچھے سے اس سے ٹکرا گیا۔ ٹال ڈس کنیکٹ کرتا وہ ہڑبڑا کے پیچھے مڑا تھا۔
 ”ادو، یہ کوئی جگہ ہے کھڑے ہو کے فون کرنے کی۔“ پھسل گئے ناک پر آیا چشمہ دوبارہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے حائقہ نے اسے لٹاڑا۔

”سوری..... سوری.....“ وہ کہہ نہ سکا کہ پیچھے سے تو آپ آئی ہیں۔ وہ گزر کے آگے جانے لگی تو پھر بول پڑا۔

”آپ حائقہ ارشد ہیں؟“ حائقہ یکدم مڑی تھی۔

”جی ہاں۔“ وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔ وہ بھی ہولے سے مسکرا دیا اور بولا۔

”حزہ مغل۔“ شرم اور شرمندگی نے ایک ساتھ حملہ آور ہو کے اسے کچھ بولنے نہ دیا حزہ نے یہ منظر کھل کے انجوائے کیا تھا۔

”تو دیکھ لیا؟“ اس نے پوچھا۔

”مطلب؟“ حزہ حیران ہوا۔

”مطلب مجھے ہی دیکھنے آئے تھے نا تو دیکھ لیا۔“ اب کے حزہ کھل کے ہنسا تھا۔ حائقہ بھی مسکرا دی۔ تبھی حارث اندر داخل ہوا۔ حائقہ بوٹی مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”تم یہاں..... خیریت!“ حارث نے اس سے گلے ملتے ہوئے پوچھا تھا۔

رواؤ انجسٹ 225 فروری 2016ء

READING
Section

”ہاں کچھ دیکھنے آیا تھا۔“ وہ بولا حارث اسے اسٹاف روم میں لے آیا۔ سلمان بھی وہیں تھا۔
 ”کیا دیکھنے آئے تھے؟“ حارث کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔
 ”تم لوگوں کی ملکہ فزکس کو۔“ حارث ایک دم آگے کو ہوا۔
 ”کیوں خیریت؟“ حمزہ مسکرایا۔

”آئی ایم گونگ ٹو بی ایلٹیوڈ ہر (میری اس سے منگنی ہونے والی ہے)“ حارث کا چہرہ یکدم دھواں دھواں ہوا تھا۔ سلمان بھی چپ رہ گیا۔

”تصور دیکھنے سے بہتر یہ لگا کہ ڈائریکٹ ہی دیکھ آؤں سو.....“ حمزہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ حارث اسے دوبارہ دیکھ بھی نہ سکا۔

”میں آتا ہوں ابھی۔“ چند لمحوں بعد وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ حمزہ کچھ دیر سلمان سے باتیں کرتا رہا پھر چلا گیا۔ سلمان اوپر آیا تو وہ ریٹنگ پر دونوں بازو لگائے کھڑا تھا۔ سلمان اس کے برابر آ کے کھڑا ہو گیا۔
 ”میں ٹھیک کہتا تھا ناں سلمان کہ میری قسمت میں صرف کوشش کرنا لکھا ہے۔ کسی بھی چیز کا حاصل ہونا نہیں لکھا۔ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود بابا کا پیار نہیں مل سکا۔ آج تک ان کے گلے لگنے کے لیے ترستا ہوں میں، کوشش کے باوجود اپنی پوری اکیڈمک لائف میں ایک بار بھی پوزیشن نہ لے سکا، تین سال سے بھرپور کوشش کے باوجود اپنی اکیڈمی میں 100 سے بھی پورے نہیں کر سکا، تین سالوں میں اسے ایک بھی پوزیشن نہیں دلو اسکا اور اب.....“ سلمان کو لگا اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

”اور اب حائقہ پیار کرنے کی کوشش تو بہت کی مگر.....“ اس سے آگے اس سے بولا نہ گیا۔
 ”پہلی بار کوئی اتنا اچھا لگا تھا یا را وہ پاس نہیں بھی ہوتی تھی تو پاس ہی لگتی تھی، پتا نہیں میرے اندر کہاں کہاں اتر گئی ہے وہ۔“ سلمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”حارث یار! حمزہ سے بات کر لیتے ہیں۔ اسے کون سا تیری طرح پیار ہوا ہے بھلا۔“ حارث نے ایک دم اس کی بات کاٹی۔

”پاگل ہو گیا ہے کیا.....“ نہ نکھیں دیکھی تھیں اس کی جب بتا رہا تھا ستیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ رنگ برنگ ہوا پڑا تھا اس کا چہرہ، لبوں پہ مسکراہٹ دیکھی تھی اس کے ایویں نہیں تھی وہ یہاں کا موسم بدلنا ہے تو ہی ایسی مسکراہٹ پھیلتی ہے ہونٹوں پر، سارا پتا ہے مجھے۔“ حارث ول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
 ”تو پھر اب کیا کرے گا۔“ سلمان نے پوچھا۔

”وہی جو ہمیشہ کرتا آیا ہوں۔ جو ہر کوشش کے باوجود میری قسمت میں لکھا ہے صبر.....“ حارث آنکھوں کے گوشوں میں آیا پانی انگلی کی پور سے جھٹکتے ہوئے بولا تھا۔ ”اور ویسے بھی تنگ آ گیا ہوں میں یہ زبردستی چھیننے کا کام کر کے پہلے عمیر سے چھینا اب حمزہ سے چھین لوں، نو نیور۔“ وہ کہتے ہوئے نیچے جانے کی طرف بڑھا۔ آج شاید پہلی بار اس نے تسلیم کیا تھا کہ واقعی اس نے عمیر سے علیزہ کو چھینا تھا زبردستی وہ میٹھیوں کے قریب تھا جب سلمان کی آواز نے اسے روک دیا۔

”آج حمزہ کی جگہ عمیر ہونا تو کیا پھر بھی تو یونہی کرتا؟“ حارث اپنی جگہ قائم سا گیا۔
 ”نہیں ناں! تب تو جاگ جانی تھی تیرے اندر وہ مشہور زمانہ نفرت، تب تو مجھے عمیر کو قتل کر کے بھی حائقہ کو چھینا پڑتا تو تو چھین لیتا، ہے ناں۔“ حارث نے اس کی طرف دیکھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”ہاں مگر آج حمزہ کی جگہ عمیر نہیں ہے۔“ کہتے ہوئے وہ سڑھیاں اتر گیا۔ ایک ہفتے بعد دونوں کی منگنی ہو گئی۔ حارث ٹھیک طرح سے ماتم بھی نہ کر سکا۔ سلمان اسے بشکل کھینچ کھانچ کے تقریب میں لے کر آیا تھا۔ حمزہ کی آنکھوں سے چھلکتی داریں نکلیاں..... اور حائقہ کے لبوں پر پھیلتی شرمیلی مسکراہٹ وہ سو سو بار مر رہا تھا اور سو سو بار جی رہا تھا۔

”بہت مبارک ہو۔“ اپنے اندر کے ہر طوفان کو ایک سادہ سی مسکراہٹ میں چھپا کے اس نے حمزہ کو گلے لگایا تھا۔ ”آپ کو بھی۔“ حائقہ کو کہتے ہوئے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا مگر یہ بھی تو اس کا فن تھا اندر چاہے آگ لگی ہوتی، باہر سے پانی کی طرح برسکون نظر آتا تھا (سوائے عمیر کے) اب بھی اس نے اپنے دل میں موجزن بے تحاشا چاہت کو آنکھوں سے چھلکنے ہی نہ دیا۔ پلکوں کے پیچھے ہی کہیں مقید کر لیا پتھر کی طرح سخت ہو گیا اتنا کے رات کا اندھیرا اور حائقہ کی بے پناہ یادیں بھی نہ پگھلا سکیں۔ سرد رات کے کاندھے پر سر رکھ کے ایک آنسو بھی نہ بہایا اس نے سب کچھ اندر ہی بند کر لیا۔ عمیر ان دنوں لاہور گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو فرسٹ ایئر کے اسٹوڈنٹس سے پہلی خبر یہی ملی۔

”سر! آپ کو پتا ہے ہر حمزہ کی منگنی ہو گئی ہے۔“ عمیر کے لیے خبر نئی تھی۔

”اچھا..... اداؤ.....“ اسے خوشی ہوئی۔

”سر! میں کہیں سے ہوئی؟“ اسٹوڈنٹس سارے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

”کس سے ہوئی ہے بھی۔“ عمیر مسکرایا تھا۔

”میم حائقہ سے؟“ عمیر کا ایک دم سے منہ گل گیا۔ چند لمحے بول نہ سکا۔ پھر ہولے سے ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

”کاش میں تمہارا چہرہ دیکھ سکتا حارث جاوید کاش.....“ اس کی ہنسی ہی بند نہ ہو رہی تھی۔

☆.....☆

آخر کار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس دن حارث سے ملنے آئی گیا۔ سلمان اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ کیوں آیا ہے؟

”عمیر خدا کا نام ہے یا راہ پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کے زخموں پر مزید نمک نہ چھڑک پلیز۔“ عمیر اس کی بات سن کے مسکرایا۔

”سوری یار! مجھے موقع گنوا نا نہیں آتا۔“ کہتے ہوئے وہ اسٹاف روم کی طرف بڑھ گیا حارث وہیں تھا اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”میں نے سوچا اس بار صرف کارڈ سے کام نہیں چلے گا سو خود ہی آ گیا۔ کیسی طبیعت ہے اب؟“ عمیر کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ نشترتھے جو حارث کے آر پار ہو گئے۔

”تمہیں لگتا ہے میں تمہیں اپنی طبیعت بتاؤں گا۔“ حارث سرد لہجے میں بولا۔

”نہ بتاؤ، وہ تو تمہیں دیکھ کے ہی پتا چل گئی۔“ حارث بول نہ سکا۔

”ویسے تقدیر نے پہلی بار میرا یوں ساتھ دیا ہے ابھی تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ سوچنے سے پہلے ہی حمزہ نے کر دیا۔ واقعی دوست ہو تو حمزہ جیسا۔“ حارث ایک دم آگے کو آیا۔

”صرف دل ٹوٹا ہے۔ مرنے نہیں گیا ہوں جو اتنا خوش ہو رہے ہو۔“ عمیر چپ رہا۔

READING
Section

ردا انجسٹ 225 فروری 2016ء

”اور اگر میں مزید بھی گیا تو بھی تم خوشیاں نہیں مناسکو گے کیوں کہ تمہیں مار کے ہی مردوں گا۔“ عمیر کھڑا ہو گیا۔
 ”ٹھیک ہے پھر مار کے دکھاؤ۔“ مسکرا کے کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا تھا حارث نچیل پر ہاتھ مار کے رہ گیا۔

☆.....☆

آخر عمیر کو دل کے کسی گناہ کو شے میں دفن کر کے میں نے حمزہ سے منگنی کر لی۔ شادی عارث کے میڈیکل میں ایڈمیشن کے بعد ہونے لگی مگر حمزہ منگنی کے بعد ایک ماہ بھی صبر نہ کر سکا۔
 ”ایک ریویو کر دوں تم سے مانو گی؟“ اس رات فون پر بولا تھا۔
 ”یوں نہیں۔ ماٹھے والی ہوئی تو مانوں گی۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”شادی کر لو پلیز۔“ میں اس کی بات پر ایک دم خاموش ہوئی تھی۔
 ”پلیز یار اتھوڑا سا تو ترس کھا لو۔“ حمزہ کا لہجہ ہی فقیروں جیسا ہو گیا۔
 ”جب تک تم نہیں تھیں تو نہیں تھیں بٹ اب نہیں رہا جاتا اکیلے مجھ سے تم جو چاہے کرنا، جیسے چاہے کرنا اگر مگر بھی نہیں کروں گا تمہارے کسی معاملے میں پر اس لیکن میری یہ آزمائش ختم کر دو پلیز کہ تم میری ہو مگر پھر بھی میری نہیں ہو۔“ مجھے اس کی تقریر پر ہنسی آگئی۔

”جتنا مرضی ہنس لڑو مگر نان جاؤ پلیز۔“ اور حمزہ کے تقاضے دن بدن بڑھتے گئے۔ اس کی والدہ کے آئے روز چکر لگنا شروع ہو گئے۔ عارث کا ایف ایس سی کا رزلٹ آنے میں ابھی چار ماہ تھے اور پھر ایڈمیشن ہوتے ہوتے دو تین ماہ اور لگ جاتے۔ حمزہ تو اب ایک ہل کے لیے بھی اکیلا رہنے کو تیار نہیں تھا۔ آخر کار اس کی محنت رنگ لے آئی۔ اگست میں شادی فکس ہو گئی۔ حمزہ کے بقول یہ بھی اس پر ظلم ہی تھا۔ تیاریاں ہوتے ہوتے پتا بھی نہ چلا اور اگست آ گیا۔ میرے نکاح سے ایک ہفتہ پہلے میٹرک کا رزلٹ آیا۔ میں اماں کے ساتھ مارکیٹ گئی ہوئی تھی جب حارث کا فون آیا۔

”جلدی اکیڈمی آئیں، جلدی۔“ میں ہیلو..... ہیلو کرتی رہ گئی مگر اس نے کال کاٹ دی۔ 10 منٹ میں، میں اکیڈمی پہنچی تھی۔ حارث نے مٹھائی کی پلیٹ میرے آگے کی۔
 ”کیا ہوا ہے۔“ میں اب تک حیران تھی۔

”اس بار میٹرک کا ٹاپر تمہاری اکیڈمی کا ہے۔“ میں حیران رہ گئی۔ حارث کی خوشی اس کی آنکھوں سے چھٹک رہی تھی۔

”حائقہ جب سے یہ اکیڈمی ٹوٹی تھی تب سے لے کر آج تک اس کی کوئی ایک پوزیشن بھی نہیں آئی۔ پانچ سال بعد آج پہلی بار یہاں سے کسی نے ٹاپ کیا ہے۔ آج مجھے میری کوششوں کا صلہ ملا ہے اور اس میں بہت بڑا حصہ آپ کا ہے۔“ حائقہ کو بے حد خوشی ہوئی۔ ٹاپ اس بچے نے کیا تھا جو رائل سے یہاں آیا تھا اور رزلٹ کے صرف دو دن بعد رائل سے 16 بچے ہماری اکیڈمی میں آ گئے۔

☆.....☆

”سر جی! آپ کے لیے ایک ڈبہ آیا ہے، میں نے اسٹاف روم میں رکھوا دیا ہے۔“ چہرہ اسی نے اسے کلاس سے لکھتے دیکھ کر اطلاع دی وہ سیدھا اسٹاف روم آیا۔ ڈبہ بند تھا اس نے کھولا اور Get well soon کے سولہ کارڈ اور چھ مٹھائی کا ڈبہ جس میں اینٹی ڈپریشن گولیاں بھی تھیں۔ وہ کھول گیا۔ تبھی اسے حارث کی کال آئی۔

غصے کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے اس نے کال اٹینڈ کی تھی۔

”تم سوچ رہے ہو گے کہ میں خود کیوں نہیں آیا۔ ہے ناں؟ تو کچھ ایسا ہے عمیر راز کہ انسان پر اتنا بوجھ ڈالنا چاہیے جتنا وہ برداشت کر سکے۔ تمہاری اوقات بھی بس اتنے کی ہے جتنا میں نے ڈالا ہے اس سے زیادہ پر تمہیں ویسے ہی کچھ ہو جانا تھا۔“ حارث کی آواز اسے آگ لگا گئی۔ غصہ اتنا شدید تھا کہ اس سے بولا ہی نہ گیا۔

”مجھے پتا ہے بمٹانی تو تم کھاؤ گے نہیں مگر یہ ٹیبلٹ ضرور کھالینا جانی! کیونکہ یہ تو بس شروعات ہے ابھی تو تمہیں بہت کچھ سہنا ہے۔ برداشت کرنا ہے سو.....“ حارث ہنستے ہوئے کال ڈس کنیکٹ کرنے لگا تھا مگر پھر فوراً بولا۔

”اور سنو! وہ بے شک میرے دل سے چلی گئی ہے مگر میری اکیڈمی سے نہیں گئی اور تم جانتے ہو کہ وہ میرے دل میں رہے پانہ رہے اس سے تمہیں فرق نہیں پڑتا، لیکن اس کے میرے اکیڈمی میں رہنے سے تمہیں فرق پڑتا ہے اور میرے لیے یہ بھی کافی ہے۔“ حارث کی ہنسی اب سے تپائے جا رہی تھی۔

”جیت کوئی چیز نہیں ہوتی عمیر، چانس ہوتی ہے۔ کبھی تمہارے پاس کبھی میرے پاس۔“ حارث نے کال ڈس کنیکٹ کی تھی۔ عمیر کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا موبائل اس نے پوری قوت سے سامنے دیوار میں دے کر مارا، پھر ہاتھ مار کے میز پر سے ڈبہ اور کارڈز ادھر ادھر گرائے اور خود دونوں ہاتھ میز پر لگانے کے جھکا آنکھوں سے شزارے نکل رہے تھے میز پر رکھے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔

”بس بہت ہو گیا۔“ اس نے خود سے کہا تھا۔ اس کا خدشہ بالکل درست تھا۔ کل صرف دو اسٹوڈنٹس اس کی اکیڈمی چھوڑ کر گئے تھے۔ آج 16 جلے گئے تھے اور آنے والے کل میں شاید پوری اکیڈمی ہی خالی ہو جانی۔ آج ان کی ایک پوزیشن آئی تھی۔ کل شاید ایک سے زیادہ آجاتیں۔

”تمہیں حارث اب بہت ہو گیا۔ ٹھیک کہا تم نے کہ انسان پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے اور میں..... واقعی میری اوقات تو اس کہنے کی بھی نہیں ہے۔“ اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارا تھا۔

”اور اب میں سہوں گا بھی نہیں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے وہ دروسنے کی جو تم سن سال سے سہ رہے ہو مجھے تمہاری طرح اپنی دراز اس ان کارڈز سے نہیں بھرنی، پہلے بھی جب تم اپنی اوقات سے باہر ہوتے تھے تو میں ہی تمہیں واپس لاتا تھا۔ اب بھی میں ہی لاؤں گا۔“ اس کے ہونٹ بھی کاٹنے لگے تھے۔

”رہ گئی حائقہ، تو بہت اڑ لیا اس نے بہت من مائیاں کر لیں، بہت جشن منالیا اپنے عروج کا، اب میں اس کا زوال ہوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا تمہیں حائقہ ارشد.....“ آج اسے پہلی بار حائقہ سے حارث جیسی نفرت محسوس ہوئی تھی۔

”بہت اچھا ہوا جو تم حازہ کی ہو گئیں۔ کیونکہ حارث سے شاید مجھے زیادہ لڑنا پڑتا۔“ وہ ایک دم کرسی پر بیٹھا تھا۔

”تم نے غلط کہا حارث! جیت موقع نہیں ہوتی، چیز ہوتی ہے، جو ہمیشہ سے میری تھی اور مرتے دم تک میری ہی رہے گی۔ نہ یہ تمہاری تھی اور نہ ہی میں ہونے دوں گا۔“ کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرایا تھا۔

☆.....☆

”جاری! حیران کن رہا ہے۔“ میں چھت پر تھی جب اماں نے نیچے سے آواز لگائی۔ ظہر کی اذانیں شروع

ہو گئی تھیں۔ آج رات کو میرا نکاح تھا۔ فنکشن چونکہ ہال میں رکھا گیا تھا اس لیے گھر میں مہمانوں کا زیادہ رش نہیں تھا۔ اماں کی آواز سن کے میں بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔ سو فیصد یقین تھا۔ حمزہ کی کال ہوگی بھی بغیر دیکھے اٹینڈ کر لی۔

”تو بے حمزہ اب کم از کم چھ سات گھنٹے تو صبر کر لیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اتنے مہینوں سے صبر ہی تو کر رہا ہوں۔“ میں ایک دم چیپ ہوئی تھی۔ وہ حمزہ کی آواز نہیں تھی اور جس کی تھی وہ ابھی اتنا پرانا بھی نہیں ہوا تھا کہ میں پہچان نہ پائی۔

”آج اس صبر کا صلہ دے ہی دو، آ جاؤ۔“ وہ مجھے بلارہا تھا۔ میں سن کھڑی رہ گئی۔

”کیوں؟“ حالانکہ مجھے نہیں پوچھنے چاہیے تھا۔ اس کا ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہیے تھا۔ اس کی آواز پہچانتے ہی کال ڈس کنیکٹ کر دینی چاہیے تھی مگر..... شاید وہ اب بھی میرے دل میں کہیں زندہ تھا۔

”کیونکہ بے شک میں دیر سے سمجھا مگر سمجھ گیا کہ اس دن میں نے تمہاری آنکھوں میں جو کچھ دیکھا۔ وہ صرف میرا خیال نہیں تھا، سچ تھا۔“ اس کا اعتراف میرے دل میں اٹھل پھل مچا گیا۔ میں اسے انکار نہ کر سکی۔ کہہ نہ سکی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سب جھوٹ ہے۔ فون بند نہ کر سکی۔

”آؤ گی ناں۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”کیونکہ آج رات کو میرا نکاح ہے۔ میں نہیں آؤں گی۔“ اب کے میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا تھا۔

”حائقہ! میں تمہارا پیار زندہ کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”عمیر میں نہیں آؤں گی۔“ میں نے خود کو مضبوط کیا تھا۔

”اور اگر میں کہوں کہ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تو.....“ اس نے پوچھا تھا۔

”تو بھی نہیں آؤں گی۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

”اور اگر میں کہوں کہ تم نہ آئی تو شام کو میں آ جاؤں گا۔ عارش کا جنازہ پڑھنے۔“ مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔

”عارش..... کہاں ہے عارش؟“ میں ایک دم پریشان ہوئی تھی۔

”میرے پاس۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

مجھے اب بھی یقین نہ تھا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ عارش تو.....“ عارش ابھی تو یہیں تھا۔

”اماں..... اماں..... عارش کہاں ہے؟“ میں فون کان سے لگائے اماں کو آوازیں دیتی ہوئی باہر آئی تھی۔

”عارش کہاں ہے۔“ اماں کچن میں تھیں۔

”ابھی باہر گیا ہے کسی کے ساتھ کیوں کیا ہو گیا ہے۔“ اماں نہ جانے کیا کچھ پوچھ رہی تھیں۔ میں فون کان سے لگائے سن کھڑی رہ گئی۔ عمیر مسلسل ہنس رہا تھا۔

”اب آیا یقین اگر نہیں آیا تو لو یہ سن لو۔“ عارش کی درد بھری چیخیں مجھے وہلا گئیں۔

”عمیر پلیز! خدا کے لیے اسے کچھ مت کہو پلیز۔“ میرا دل ایک دم تڑپ گیا۔

”تو پھر کب تک آرہی ہو تم؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”عمیر میں کیسے آؤں۔ شام کو میرا نکاح ہے۔ تم آخر چاہتے کیا ہو کیوں کر رہے ہو یہ۔“ میری بات ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ عارش کی ہولناک چیخیں پھر بلند ہوئیں۔

”عمیر کو عمیر رک جاؤ پلیز۔“ میں نے بمشکل خود کو روکنے سے روکا تھا۔

”پانچ منٹ تک نہ آئیں تو..... جوان بھائی کی لاش پر رونے کی تیاری کر لینا۔“ سرد لہجے میں کہتا وہ فون بند کر گیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کروں۔ اماں شاید چھت پر تھیں ابو جی پتا نہیں کہاں تھے۔ عارش کا نمبر ملا یا تو بڑی جارہا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے چادر اوڑھی اور کسی چیز کی پرداہ کیے بغیر باہر نکل آئی اور یہی میری غلطی تھی آنسو بار بار آنکھوں سے باہر آرہے تھے۔ جب میں رائل اکیڈمی میں داخل ہوئی تو سانس بری طرح پھولا ہوا تھا، یا گلوں کی طرح میں ہر کمرے میں عارش کو ڈھونڈنے لگی۔

”میں جانتا تھا کہ پیار کے نام پر پھل تو جاؤ گی مگر مہوم کی طرح پھل کے بھی بہو گئی نہیں۔ وہیں جم جاؤ گی۔ اس لیے بہنے کے لیے راستہ بنانا ضروری تھا۔“ عمیر کی آواز پر میں ایک دم مڑی۔

”کہاں ہے عارش؟“ میں تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔ اس نے ہتے ہوئے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ میں بھاگتی ہوئی اندر آئی تھی اور اندر آتے ہی جیسے سن ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے کسی نے میرا دل مسل کے رکھ دیا ہو۔ عارش کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ شاہر سے لپیٹ کے مضبوطی سے پابند تھا اور چہرے سے خون رس رس کے گردن پر بہ رہا تھا۔ شرٹ جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی اور خون سے رنگین تھی۔ دو جلا دصفت انسان اس کے دائیں بائیں گھڑے تھے ایک کا پستول عارش کی کپٹی سے لگا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں بالکل بند تھیں وہ شاید بے ہوش تھا۔ میں روتے ہوئے اس کی طرف بڑھی تھی مگر عمیر نے مجھے بازو سے پکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔

”عمیر! تمہیں جو چاہیے لے لو۔ جو چاہتے ہو مجھ سے کہو مگر اسے چھوڑ دو پلیز اسے کچھ مت کہو۔ میں بلک بلک کر روئی تھی۔ عارش کی گردن سے بہتا خون دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ تو آدھا حصہ تھا میرا۔ آدھا وجود..... اسے یوں خونم خون کیسے دیکھ سکتی تھی میں۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیہ تم سے بس وہ چھوٹا سا بچہ جو اس دن تمہاری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ آج زبان سے بول دو۔“ عمیر نے مجھے اسے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہا تھا۔

”زیادہ کچھ نہیں۔ بس جھکی آنکھوں کے ساتھ میرے پاس آ کر ایک بار آئی لو یو بول دو۔ اپنی بانہوں کا ہار ایک بار میرے گلے میں ڈال کر کہہ دو کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔“ وہ مجھ سے میری زندگی مانگ لیتا، میری سانسیں مانگ لیتا، قسم خدا کی میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے دے دیتی مگر وہ مجھ سے میرا غرور مانگ رہا تھا۔ میری عزت مانگ رہا تھا۔ حمزہ کا حق مانگ رہا تھا میں کیسے دے دیتی۔

”کیوں کر رہے ہو یہ سب؟“ میں نے بے بسی سے پوچھا تھا۔

”کیونکہ تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے یہ سب کرنے پر، سمجھایا تھا میں نے تمہیں کہ باز آ جاؤ۔ میرے رستے میں مت آؤ، پر تم نہیں سمجھیں، اپنے بیٹے کے لیے یہ گڑھے خود کھودے ہیں تم نے، اب گروگی بھی خود ہی۔“ عارش کو شاید ہوش آیا تھا مگر اس کے پیچھے گھڑے اس جلا د نے اس کے سر میں پستول ماری، عارش کی چیخ مجھے تڑپا گئی۔

”آئی لو یو، آئی لو یو سوچ.....“ میں تین چار بار کہتے ہوئے اس کے قریب آئی تھی عمیر ہولے سے ہنسا ایک

نظر عارش کو دیکھتے ہوئے میں نے ہولے سے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے۔ میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔ ایک بار پھر عارش کی چٹخیں بلند ہوئیں۔ میں نے ایک دم دونوں بازو اس کے گلے میں ڈالے۔

”آئی لو پو۔“ مجھے ٹوٹ کے روٹا آیا تھا۔ عمیر نے ہولے سے میرا چہرہ اونچا کیا۔ وہ مسکراتی نظروں سے مسلسل مجھے دیکھ رہا تھا۔ بہت آہستگی سے اپنے دونوں بازو میرے ارد گرد ہانڈھتے ہوئے اس نے مجھے مزید قریب کیا تھا۔ مجھے اس کی سانسوں کا شور سنائی دینے لگا۔

”پھر کہو۔۔۔“ اس نے ہولے سے سرگوشی کی۔

”آئی لو پو، آئی کانٹ لیدو آؤٹ پو (میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی)“ ہولے ہولے مسکراتے ہوئے اس نے عمیرے سے اپنے لمبوں سے میرے لمبوں کو چھوا تھا اور پھر چند لمحوں بعد مجھے آزاد کر دیا۔

”جاؤ لے جاؤ عارش کو۔“ وہ بولا۔ میں نے تیزی سے عارش کے سر سے رسی کو کھولتے ہوئے وہ شاپراتا رہا تھا اور..... بے یقینی کی انتہا کو چھوتے ہوئے میں نے عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ کھل کے ہنس رہا تھا۔

”نانا کہ میں بہت ظالم ہوں مگر اتنا بھی نہیں کہ اپنے فیورٹ اسٹوڈنٹ کو ہی موت کے گھاٹ اتار دوں۔ نفرت تم سے ہے تمہارے بھائی سے نہیں۔“ وہ عارش نہیں تھا۔ عارش وہاں آیا ہی نہیں تھا اسے تو شاید کسی بات کا پتا ہی نہیں تھا۔ عمیر جیت چکا تھا۔

☆.....☆

”حاری کہاں گئی تھی بغیر بتائے؟“ میں جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ اماں تیر کی طرح میری طرف آئی تھیں۔

”وہ سامنے والی آئی نے بلایا تھا۔ کاغذ بڑھوانے تھے کوئی انہوں نے۔“ میں ہولے سے کہتے ہوئے کمرے میں گھس گئی پتا نہیں انہیں یقین آیا کہ نہیں خود ہی بول بول کر چپ ہو گئیں میرے پورے وجود میں خاموشیاں اتر رہی تھیں ہر آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ چند لمحوں میں جو کچھ ہوا اس کا مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا تو کوئی دوسرا کیسے کرتا۔ اچانک مجھے باہر عارش کی آواز سنائی دی۔ میں تیر کی طرح باہر آئی تھی۔ عارش اماں کے پاس کھڑا کوئی بات کر رہا تھا۔ ایک خراش تک نہیں تھی اس کے چہرے پر مسکراتا ہوا۔ خوش باش، ہر چیز سے بے خبر۔ میں بو بھل دل کے ساتھ واپس اندر آ گئی۔ ہرگز رتا لمحہ میرے دل کی دھڑکن بڑھاتا جا رہا تھا۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا مگر کب ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ یہ بالکل نہیں پتا تھا، چار بجے بیوٹی پارلر والی آگئی، مجھے تیار کرتے ہوئے نہ جانے کیا کچھ بولتی رہی۔ میرے پلے ایک لفظ نہ پڑا۔ جیسے ہی بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا دل اچھل کے حلق میں آجاتا۔ بارات نے دس بجے آنا تھا تقریباً سات بجے کے قریب بیرونی دروازے پر دستک ہوئی، شاید عارش دروازے تک گیا تھا ابو جی ہال جانے کی تیاری میں تھے۔

”کون آیا ہے؟“ ابو جی نے بلند آواز میں پوچھا تھا۔

”سر حمزہ آئے ہیں۔“ عارش کی مدھم سی آواز مجھ تک پہنچی تھی۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ ہاتھوں کی انگلیاں تک لرزنے لگیں۔ حمزہ کیوں آیا تھا۔ میں نے خود سے ایسے پوچھا جیسے مجھے کچھ پتا ہی نہ تھا۔

”حائقہ کہاں ہے؟“ اس نے شاید عارش سے ہی پوچھا تھا۔

”کیا بات ہے بیٹا! خیریت؟“ اماں پریشانی سے بولیں تھیں۔

”حائقہ کہاں ہے؟“ اس کی سرور آواز دوبارہ مجھ تک پہنچی تھی۔

”اندر ہے۔“ کہتے ہوئے اماں اسے اندر لے کر آئیں۔ میری ناگہانوں میں اٹھ کے کھڑا ہونے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا موبائل میری گود میں پھینکا۔ میں اندر تک کانپ گئی۔

”میں دوسروں کا سنا اور کہا دونوں جھٹلا سکتا ہوں مگر اپنی آنکھوں کا دیکھا کیسے جھٹلاؤں حائقہ؟“ اس کے سرد الفاظ میری روح کے اندر تک اتر گئے۔ ابو جی نے میری گود سے موبائل اٹھایا تھا۔

”آئی لو، آئی کانٹ لیو وڈ آؤٹ یو۔“ مجھے میری ہی جھکی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ ابو جی بے یقینی سے مجھے دیکھتے رہ گئے۔

”صرف دو چیزیں حائقہ بالکل سچ سچ.....“ وہ کہتے ہوئے میرے پاس زمین پر بیٹھا تھا۔

”میری طرف دیکھو۔“ اس نے میرا جھکا ہوا چہرہ اپنی طرف موڑا۔ میری دونوں آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ انگلیاں لرز رہی تھیں۔

”تم آج عمیر کے پاس گئی تھیں؟“ اس نے دیر سے سے پوچھا تھا۔ میں بول نہ سکی۔ کاش وہ پوچھ لیتا کہ تم نے یہ سب کیوں کیا مگر اس نے پوچھا بھی تو کیا۔

”صرف ہاں یا ناں۔“ اس نے میرے لڑتے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں مقید کیا تھا۔ میں نے بمشکل نظر اٹھا کے اسے دیکھا امید کا ایک جہان بسا تھا اس کی آنکھوں میں۔

”نہیں گئیں ناں تم آج اس کے پاس نہیں ملیں ناں تم اس سے ہے ناں جھوٹ ہے یہ سب۔ کچھ نہیں کہا ناں تم نے اس سے جھوٹ بکواس ہے ناں یہ سب ہے ناں حائقہ۔ جھوٹ ہے ناں۔ تم نہیں گئیں تھیں اس کے پاس.....“ حمزہ کی آنکھوں کے سوال بڑھتے جا رہے تھے میں نے ہولے سے لبوں کو کھولا حمزہ کا سارا وجود متوجہ ہو گیا۔ میں نے ایک نظر اپنی اماں پر ڈالی۔ پھر ابو جی کو دیکھا غارش کو دیکھا اور حمزہ کو دیکھتے ہوئے دوبارہ نظر جھکا لی۔

”ہاں گئی تھی۔“ حمزہ کے ہاتھوں کی گرفت ایک دم میرے ہاتھوں کے گرد کمزور پڑی تھی۔

”حائقہ.....!“ ابو جی کے لبوں سے سرگوشی سی نکلی۔ میں دوبارہ حمزہ کی آنکھوں میں دیکھ نہ سکی۔

”تم نے یہ سب کہا ہے عمیر سے؟“ پھر مشکل سوال۔ اس بار مجھ میں ہاں کہنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ حمزہ نے ایک دم میرے ہاتھوں کو آزاد کیا تھا۔ چند لمحے وہ یونہی زمین پر بیٹھا رہا جیسے اٹھنے کی ہمت جمع کر رہا ہو اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ نہیں پوچھیں گے کہ میں نے یہ کیوں کیا؟“ میں نے بمشکل ہمت جمع کر کے اس سے پوچھا تھا۔ وہ دروازے کے پاس ہی رک گیا اور ہولے سے مڑا، میں نے اب بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

”تم نے یہ سب کرنے سے پہلے مجھ سے نہیں پوچھا تو میں سب کچھ ہو جانے کے بعد کیوں پوچھوں۔“

حمزہ کا لہجہ انتہائی ٹوٹا ہوا تھا۔ دونوں آنکھوں کو بے دردی سے رگڑتا وہ دروازہ پار کر گیا۔ ابو جی نے ایک دم مجھے جھجھوڑا تھا۔

”حاری! کیوں کیا تو نے یہ سب؟ کیوں.....؟“ ابو جی رورہے تھے۔

”اگر اس سے ہی شادی کرنی تھی تو کہہ دیتی۔ میں اسی سے کروا دیتا۔ پر یہ سب تو نہ کرتی۔“ ابو جی روتے ہوئے زمین پر بیٹھے تھے۔ میں نے تڑپ کے ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا۔

”ابو جی! میری بات سنیں میں نے یہ سب.....“ ابو جی نے مجھے زور سے دھکا دیا۔

”اس سے تو بہتر تھا حاری کہ تو مجھے زندہ درگور کرویتی۔ اپنے ہاتھوں سے میری قبر بنا دیتی مگر یہ سب نہ کرتی۔ میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کیا کہوں گا ان سب لوگوں کو جو بارات کے انتظار میں وہاں ہال میں آئے ہوئے ہیں۔“ ابو جی سر پر ہاتھ مار مار کے رورہے تھے۔ اماں کو عارش نے دونوں کندھوں سے تھاما ہوا تھا۔

”تو نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا حاری! کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بول! کیوں کیا ایسا؟ بول.....!“ ابو جی کو جیسے ایک دم تھرپڑھا تھا۔ انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر جھٹکے دینے شروع کر دیئے۔

”حاری مجھے پتا ہوتا تو یوں میری عزت کا جنازہ نکالے گی تو میں تجھے پیدا ہوتے ہی دفن دیتا۔“ ابو جی نے میرے چہرے پر پھپھروں کی بارش کر دی تھی گھر میں بس اکاؤ کار شینہ وارہی تھے زیادہ تر لوگ ہال چلے گئے تھے۔

”بھائی جی! چھوڑیں اسے چھوڑیں مر جائے گی۔“ ابو جی نے تمام لوگوں کو کمرے سے باہر نکالتے ہوئے دروازہ بند کیا تھا۔

”آج اسے مار کے ہی جاؤں گا میں۔“ ابو جی جوتالے کر مجھ پر برس پڑے۔ عارش کبھی اماں کو سنبھالتا تو کبھی ابو جی کا ہاتھ روکتا۔

”حاری! تو نے میرے منہ پر کالک مل دی، تو نے مجھے زندہ درگور کروا۔“ میرے ماتھے اور ہونٹ سے خون نکل آیا تھا۔ ایک بار بھی میں نے ابو جی کا ہرستا ہوا ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کی۔ اتنا تو حق بننا تھا ان کا۔ میرے چہرے اور بازوؤں پر جا بجا نیل کے نشان پڑ گئے تھے۔ دوپٹہ نہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ آخر ابو جی مار مار کے تھک گئے تو جوتا ایک طرف پھینک دیا اور خود چار پائی پر گر گئے۔ اماں مسلسل ہچکیاں بھر رہی تھیں۔

”اس سے تو بہتر تھا اسے پیدا ہوتے ہی مار دیتی تو آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ پورے شہر کے سامنے اس نے میری عزت رول دی۔ کیا کہوں گا میں لوگوں سے کہ بارات کیوں نہیں آئی؟“ ابو جی بے بسی سے رورہے تھے۔

”اماں! میری بات تو سن لیں۔“ خون تھوکتے ہوئے میں نے ہولے سے کہا تھا۔ اماں نے ایک دم خود کو عارش کے بازوؤں سے چھڑوایا اور میری طرف آئیں۔ دونوں ہاتھوں سے میرا گلا پکڑا اور وباویا۔

”جان چھوڑ دے میری، کاش یہ کام میں تیرے پیدا ہوتے ہی کر سکتی۔“ اماں نے پوری قوت سے میرا گلا وباویا ہوا تھا۔ میری آنکھیں ابل آئیں سانس ایک دم بند ہو گیا۔

”اماں چھوڑیں اسے۔“ عارش نے بمشکل میرا گلا ان کے ہاتھوں سے چھڑوایا تھا۔ میں کھانستی ہوئی دیوار کے ساتھ گر گئی۔

”ابو جی! لوگوں سے کیا کہتا ہے؟“ عارش نے ہولے سے پوچھا تھا۔

”یہ ہی کہ ہماری اولاد ہی نہیں تھی۔ یہ سڑک کنارے بڑی ملی تھی۔ نہ جانے کس کا خون ہے۔ منہ کالا کرتے پکڑی گئی بس.....“ ابو جی مجھے ٹھوکر مارتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں بے یقینی سے عارش اور اماں کو دیکھتی رہ گئی۔

ماتھے سے بہتا خون میرا پورا چہرہ رنگین کر رہا تھا۔ رشتے دار خواتین اماں کو باہر لے گئیں۔ عارش میرے قریب آ کے رکا تھا۔

”عارش! میں نے یہ سب تمہارے لیے.....“ عارش نے میری بات کاٹ دی۔

”حاری! بس کر بس کروے، تجھ میں غیرت ہوتی تاں تو اب تک مر چکی ہوتی۔“ عارش کہتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔ ایسے ہوتا ہے بھلا۔ اولاد پیدا ہونے سے لے کر مرتے دم تک والدین پر ایسا اعتماد کرتی ہے اور والدین ایک لمحے کا بھی اعتبار نہیں کر پاتے، میں اپنے ابو جی کا خون تھی، ان کا مان تھی۔ ان کا بھروسہ تھی۔

روانی ڈائری

میرے دلی جذبات
اور میری جان پیار کے تمام رشتے
تیرے نام

روشنی فاطمہ کی ڈائری سے
ایک نظم

چھوٹی سی زندگی ہے
ہر بات میں خوش رہو
جو چہرہ پاس نہیں
اس کی آواز میں خوش رہو
کوئی روٹھا ہوتم سے
تو اس کے اس انداز میں خوش رہو
جولوٹ کے نہیں آنے والا
ان لہجوں کی یاد میں خوش رہو
اپنی خوشیوں کا انتظار مت کرو
دوسروں کی مسکان میں خوش رہو
کیوں تڑپتے ہو ہر بل کسی کے ساتھ کو
کبھی اپنے آپ میں بھی خوش رہو
چھوٹی سی تو ہے زندگی ہو، ہر حال میں خوش رہو

مہرین کنول کی ڈائری سے
پروین شاکر کا کلام

ان دنوں میری
اپنے آپ سے بول چال بند ہے
میرے اندر ایک بانجھ غصہ

ایم جے قریشی کی ڈائری سے
حسن نقوی کی نظم

سنو
بہت سی
ڈگریاں لے کر
ہنر پہ دسترس پا کر
کسی مفلس کا در و دل
اگر اس کی آنکھوں سے
پڑھنے سے قاصر ہو
تو جاہل ہو

ریمانور رضوان کی ڈائری سے
نامعلوم شاعر کی خوب صورت نظم

بھی رنگ بھرے لمحے
یہ پھول اور کلیاں
فضا میں بکھری گھٹائیں
بیرات جگمگ کی ہوائیں
یہ میرا دل تیرا گھر بنا
میرے وجود سے آشتی
تیرے خیال کی باتیں
یہ صندلیں بدن کی
آنکھوں بھائی ہوئی مغموم ذات
میرے دل کی کلی تم پر مرثی
سبھی خوشیاں میرے من کی

مصباح مسکان رؤف کی ڈائری سے

ایک خوبصورت کلام

رم جم برستی بارش میں، جب چمچی چہہاتے ہیں
یا وضاب کے سنگ جب پتے لہلہاتے ہیں
کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
شخصی ہوا سنگ بارش کے
یادیں پھڑوں کی لاتی ہیں
یاد آتے ہیں اُن سنگ بیتے وہ مل حسین
دل اُٹس ہو جاتا ہے آنکھوں میں جل جل ہو جاتی ہے
یہ یادیں پھڑے پھڑے کی من میں آگ لگاتی ہیں
لے آئے کوئی واپس بھی مسکان
وہ بیتے لمحے، پھڑے دوست، وہ مل حسین
رم جم برستی بارش میں کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
ہم کو بے چین کر جاتے ہیں
رم جم برستی بارش میں

کرن ناز کی ڈائری سے

یروین شاکر کی غزل

الزام تھا دیے پہ نہ تفسیر رات کی ہم نے تو
بس ہوا کے تعلق سے بات کی
ہر صبح جب کہ صبح قیامت کی طرح آئے
ایسے کون ہو گا جو سوچے ثبات کی
تکلیف تو ہوئی مگر اے ناخن ملال
کھلنے لگی گرہ بھی کوئی اپنی ذات کی
زنجیر ہے جزیرہ ہے یا شاخ بے ثمر
اب کون سی لکیر سلامت سے بات کی
مرنے اگر نہ پائی تو زندہ بھی کب رہی
تھا کئی وہ عمر جو تیرے سات کی
پھر بھی نہ میرا قافلہ لٹنے سے بچ سکا
میں نے خبر تو رہی تھی ایک ایک گھات کی

☆.....

پھنکارتا رہتا ہے، نہ مجھے ڈستا ہے
نہ میرے گرد اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہے
نیپو کی سر زمین ایک بار پھر سرخ ہے
فراآت کے پانی پر
ابن زیاد کے طرفداروں کا ایک بار پھر قبضہ ہے
زمین اور آسمان
ایک بار پھر ششما ہے کالہود صول کرنے سے
انکاری ہیں اور

میرے چہرے پر
اب مزید لہو کی جگہ نہیں
فانچ فوج روشنی اور آگ کے فرق کو نہیں سمجھتی
صحرا کی رات کاٹنے کے لیے
انہیں الاؤ کی ضرورت تھی
سوانہوں نے میرے کتب خانے جلا دیے
لیکن میں احتجاج بھی نہیں کر سکتی
میرے بالوں میں سرخ اسکارف بندھا ہے
اور

میرے گلاس میں کوکا کولا نہیں رہا ہے
میرے سامنے ڈالر کی پڈی پڈی ہوئی ہے

مہوش جوادی کی ڈائری سے

مرزا جاذب کا کلام

دیدہ و دل فراش کرتا ہوں
گویا خود کی تراش کرتا ہوں
رات بھراک تیرے تصور سے
فکر سے بود و باش کرتا ہوں
پہلے اک تیری تمنا تھی مگر
اب میں اپنی تلاش کرتا ہوں
اور تیری الفت میں آج کل جاذب
ہر رسم پاش پاش کرتا ہوں

اشعار

زمین شمع کی مانند جلاتا ہوں عدیم
 بچھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا
 حنا علی سیالکوٹ
 ہماری شرط وفا یہی ہے وفا کرو گے وفا کریں
 ہمارا ملنا ہے ایسا ملنا، ملا کرو گے ملا کریں گے
 یہ پوچھنا کیا کہ خط لکھو گے؟ پوچھنے کی ضرورت نہیں
 تمہاری مرضی پر منحصر ہے لکھا کرو گے لکھا کریں گے
 نوشین مدثر لاہور
 دل سلگتا ہے میرا سر رویے سے تیرے
 دیکھ اس برف نے کیا آگ لگا رکھی ہے
 جسے تو حکم کرے دل میرا ایسے دھڑکے
 یہ گھڑی تیرے اشاروں سے ملا رکھی ہے
 امبرین حیدر اسلام آباد
 کیسی محبت کیسی چاہت ہم پر سب روشن تھا
 یونہی ذرا سا شوق ہوا تھا آؤ دل برباد کریں
 رابعہ منیر سرگودھا
 چاہا تو چاہتوں کی حدوں سے گزر گئے
 نشہ محبتوں کا اترنے نہیں دیا
 اس نے ہنسی ہنسی میں محبت کی بات کی
 میں نے عدیم اس کو بکرنے نہیں دیا
 مریم نواز فصل آباد
 ایسے رہا کرو کہ لوگ آرزو کریں
 ایسا چلن چلو کہ زمانہ مثال دے

مریم ماہ منیر لاہور
 تم کو دیکھوں یا پھر چاند دیکھوں
 بات تو ایک ہی ہے مگر تم سمجھو
 ریما نور رضوان کراچی
 کسی نے عجیب سوال کر ڈالا
 مرتے تو مجھ پر ہو تو پھر جیتے کس کے لیے ہو
 سدرہ شاہین خانہ سوال
 کھلونے ٹوٹ جانے پر بہت روتی تھی بچپن میں
 مگر اب دل جو ٹوٹا ہے تو آنسو کیوں نہیں بہتے؟
 ریمل آرزو اوکاڑہ
 پھر پیاس اتری ہے بستوں میں
 گفتگوئے فرات کی جائے
 دھنک ناز کراچی
 خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
 کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی
 لوگ تسخیر بھی ہو سکتے ہیں
 لفظ دل سے ادا کرے کوئی
 صباح ہارون آباد
 اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سٹھے رہیں
 اب اسے ڈھونڈنے میں تاحد سحر جاؤں گا

شاملہ ملک ————— کراچی

کوئی وعدہ نہیں پھر بھی انتظار تیرا تھا
دور ہونے پر بھی اعتبار تیرا تھا
نجانے کیوں بے رخی تو نے ہم سے کی
کیا ہم سے بھی زیادہ کوئی طلب گار تیرا تھا

روشنی فاطمہ ————— کراچی

اہل نظر کے بخت میں کس نے یہ لکھ دیا
رہنا کسی کے ساتھ محبت کسی کے ساتھ
ہوتی ہے اس کے دل کو کسی اور کی طلب
رکھتی ہے عمر بھر اسے قسمت کسی کے ساتھ

سحرش نور ————— گجرات

بے کار خیالوں سے لپٹ کر نہیں دیکھا
جو کچھ بھی ہوا ہم نے لپٹ کر نہیں دیکھا
اس ڈر سے کہ کٹ نہ جائیں بے تابی کے راستے
آنکھوں نے تیری راہوں سے ہٹ کر نہیں دیکھا

کرن ناز ————— گھاریاں

ملو کہ آج کوئی بات روبرو کر لیں
یہ کیوں ہوئیں دوریاں کچھ اس پر گفتگو کر لیں
کریں گے پھر سے زیارت تمہارے چہرے کی
کہ پہلے آنکھوں کو اشکوں سے با وضو کر لیں

ارم سرفراز ————— لاہور

مقرر وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے قضا بھی چھوٹ جاتی ہے
محبت دل کا سجدہ ہے جو ہے توحید پر قائم ہے
نظر کے شرک والوں سے محبت روٹھ جاتی ہے

صدف سحر ————— کمالیہ

اک محبت ہے بدگمان ہونا
اک حقیقت ہے داستان ہونا
تو جو آئے تو بات بنتی ہے
ورنہ عمروں کا رائیگاں ہونا

عینی سید ————— ملتان

وصال میں بھی وہی فاصلے سراب کے ہیں
کہ اس کو نیند مجھے رت جگے کی عادت ہے
تیرا نصیب ہے اے دل سدا کی محرومی
نہ وہ سخی نہ تجھے مانگنے کی عادت ہے

فریال ————— لاہور

کچھ تو مشکل ہے بہت کار محبت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جاسکتی
کوئی ہو بھی تو ذرا چاہئے والا تیرا
راہ چلتوں سے رقابت نہیں کی جاسکتی

نمرہ علی ————— کوئٹہ

بھری پُری میری دنیا میں اک مدت سے
کسی کی اتنی کمی ہے کہ کچھ نہ پوچھو تم
وہ زخم پایا کہ جس کی مثال مشکل ہے
وہ مات اب کے ہوئی ہے کہ کچھ نہ پوچھو تم

زرش ————— پشاور

یہ بھی دن ہیں اس سے پل دوپل ملانا ناممکن ہے
وہ بھی دن تھے کٹ جاتی تھیں راتیں پوری باتوں میں
میں اور تم سے پہنچ گئے آپ جناب کے صیغوں میں
رفتہ رفتہ اتر آئی ہے کیسی دوری باتوں میں

ثناء حیات ————— کراچی

معین جس کے لیے ہم نے سب حدیں توڑ دیں
اسی نے آج کہا ہے اپنی حد میں رہو

☆.....

اس ماہ میں

اس ماہ میں

فرمودات حضرت علیؑ

☆ حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے حکمت خواہ منافق سے ملے لے لو۔

☆ انسان زبان کے پروے میں چھپا ہے۔

☆ ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین

عبادت ہے۔

☆ جو چیز اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں

کے لیے بھی پسند کرو۔

☆ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے کمینے سے بچو۔

☆ گناہ پر عداوت گناہ کو مٹا دیتی ہے نیکی پر

غرور نیکی کو تباہ کر دیتا ہے۔

☆ سب سے بہترین لقمہ وہ ہوتا ہے جو اپنی

محنت سے کمایا جائے۔

☆ جو شخص پاک و امن عورت پر تہمت لگاتا

ہے اسے سلام مت کرو۔

☆ ہمیشہ سچ بولو تاکہ تمہیں قسم کھانے کی

ضرورت نہ پڑے۔

☆ موت کو ہمیشہ یاد رکھو موت کی آرزو کبھی

نہ کرو۔

ملک جو ادنواز قریشی۔ ڈیرہ اسماعیل خان

اس ماہ کے اقتباس

کہتے ہیں کہ جب کوئی اپنا بہت عزیز بہت

پیارا چھڑ جائے تو انسان اپنے جینے کے جواز زندہ رہنے کے بے معنی سہی لیکن بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے تاکہ اگر کبھی وہ چھڑ جانے والا مل جائے تو ان سے زندگی کا جواز نہ مانگے اور اگر مانگے تو وہ جھٹ سے کہیں کہ تیری یاویں تمہیں کچھ نشانیاں کچھ وعدے کچھ ذمہ داریاں تمہیں جن کو نبھانے کے لیے جینا پڑا..... مجبوری تھی سمجھا کرو جس طرح تمہیں چھڑ جانے کی مجبوری تھی اسی طرح ہمیں زندہ رہنے کی مجبوری تھی۔ مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور مروت ہمیشہ انسان رشتوں سے نبھاتا ہے اپنے گہرے اور عزیز رشتوں سے اور رشتے نبھانا آسان بھی نہیں ہوتا۔

نبیلہ عزیز کے ناول ”ایسا اہل دل ہو“ سے اقتباس

فرح ناز محمد رفیق بھٹی

زندگی کا اصل راز

نماز کے دوران غیر اختیاری وسوسے آنے کی وجہ سے مایوسی پا پریشانی کا شکار ہونے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں دراصل انسان کا دل ایک سپر ہائی وے کی مانند ہے اس پر شاہی سواریاں بھی گزرتی ہیں امیر کبیر بھی چلتے ہیں غریب اور فقیر بھی گزرتے ہیں، خوب صورتوں اور بدشکلوں کی بھی یہی گزرگاہ ہے۔ نیکو کاروں، پارساؤں اور دین داروں کے

ہے۔“

☆ ایک امریکی لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔
”مجھے تمہارا نیا بوائے فرینڈ پسند نہیں آیا۔“ سہیلی
نے فوراً کہا۔ ”شکر خدا کا۔“

☆ باپ۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی ایک
گدھے کے ساتھ زندگی گزارے۔“ شادی کا
خواہش مند لڑکا۔ ”اسی لیے تو میں اسے یہاں
سے لے جانے آیا ہوں۔“

نوشین مدثر۔ لاہور

اس ماہ کی کرنیں

☆ رشتے بنانا کوئی مشکل نہیں انہیں بھانا
مشکل ہے۔

☆ زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جذبے
سچے ہونے کے باوجود خلوص اور محبتوں کے عوض
انسان کو کچھ نہیں ملتا۔

☆ سچ امید سے نہیں علم اور خدا پر اعتماد سے
ملتی ہے۔

☆ وقت، خوشبو اور ہوا کبھی قید نہیں ہو سکتے
مگر کیش ہو سکتے ہیں۔

☆ جو باتیں دل سے نکلتی ہیں دل میں جگہ بنا
لیتی ہیں۔

☆ سب کچھ کھونے کے بعد بھی اگر آپ میں
حوصلہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے کچھ نہیں کھویا۔

☆ لوگوں کے آگے جھکنے سے ان سے مایوس
ہونا بہتر ہے۔

☆ حقیقی خوب صورتی کا سرچشمہ ہمارا دل ہے
اگر یہ سیاہ ہو تو چمکتی ہوئی آنکھیں کچھ نہیں کر سکتیں۔

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

☆.....

علاوہ کافروں، مشرکوں، مجرموں اور گناہ
گاروں کے لیے بھی یہی شاہراہ عام ہے۔
عافیت اسی میں ہے کہ اس شاہراہ پر ٹریفک بھی
خود بخود آئے اسے خاموشی سے گزر جانے دیا
جائے اگر اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے بند
کرنے یا اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی گئی تو
دل کی سڑک پر خود پھیبہ جام ہو جانے کا شدید
خطرہ ہے اس راستے کا ٹریفک کنٹرول صرف سبز
بتی پر مشتمل ہے اس میں سرخ بتی کے لیے کوئی
جگہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز کے علاوہ یا نماز
کے اوقات کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی
زندگی کا اصل راز یہی ہے۔

(قدرت اللہ شہاب)

عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کی خوبصورت بات

ہر عمل کھوکھلا ہے جب تک محبت نہ ہو۔
(خلیل جبران)

صباح سحر۔ ہارون آباد

اس ماہ کی ہری مرچیں

☆ خاتون نے ایک کوٹ پسند کیا اور سیلز
گرل سے بولی۔ اگر میرے شوہر کو یہ کوٹ پسند
آیا تو کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ اسے واپس لینے سے
انکار کر دو گی۔

☆ بیوی نے شوہر سے کہا۔ ”تمہارا کہنا
ٹھیک ہے کہ میں بہت زیادہ روپیہ خرچ کرتی
ہوں اس کے علاوہ کوئی فضول خرچی بتاؤ۔“

☆ ”میری بیوی دنیا کی بہترین عورت
ہے۔“ ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ ”اور
یہ میری واحد رائے جس سے میری بیوی بھی متفق

حیرت انگیز

اس میں برکت حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ناجائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کھانا رہتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا۔“ صحیح بخاری کا

سیدہ نورین۔ کراچی

اقوال

- ☆ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کبھی بدلا نہیں لیتا۔
- ☆ حسد کرنے والا موت سے پہلے مرجاتا ہے۔
- ☆ خوشی انسان کو اتنا نہیں سکھاتی جتنا کہ غم۔
- ☆ اذان کے وقت خاموش رہتا کہ موت کے وقت کلمہ نصیب ہو۔
- ☆ جس کا نفس اس کے قابو میں ہے وہ مومن ہے۔
- ☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔
- ☆ دنیا کو جیتنا چاہتے ہو تو آواز میں نرمی پیدا کرو۔
- ☆ محبت کی آزمائش محبت کی توہین ہے۔
- ☆ خوب صورتی ہمیشہ پر خلوص دل اور نرم زبان سے چھلکتی ہے۔
- ☆ کسی کو اتنا وقت نہ دو کہ وہ تم کو بوجھ سمجھنے لگے۔

صباحر۔ ہارون آباد

توبہ

خدا شناسی اور فقر و رویشی کے تقالوں نے دنیا میں کیسے کیسے لوٹا ہوگا، کون جانتا ہے اس راہ میں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا: ”لوگو! قسم ہے اللہ کی مجھے تمہارے ہارے میں صرف دنیا کی زینت (اور مال و دولت) سے خطرہ ہے جو اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا۔“

ایک آدمی نے کہا: ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا خیر سے بھی شر حاصل ہو جاتا ہے؟“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا: ”تم نے کیا سوال کیا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کیا خیر سے بھی شر حاصل ہوتا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”خیر (حلال مال) سے خیر ہی حاصل ہوتا ہے کیا وہ خیر ہے؟ (دنیا کا ہر مال خیر نہیں ہوتا) موسم بہار میں جو بزمہ اگتا ہے اس سے جانور اچھارے کا شکار ہو کر مرجاتا ہے یا مرنے کے قریب ہو جاتا ہے مگر وہ چرنے والا جانور (بچ جاتا ہے) جو کھاتا ہے پھر جب اس کی کوئیں بھر جاتی ہیں تو دھوپ کی طرف منہ کر کے گوبر اور پیشاب کرتا ہے پھر جنگلی کرتا ہے اس کے بعد دوبارہ کھانے لگتا ہے جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اسے

بداعتماد انسان نہ کسی کا رفق ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی حبیب، بداعتمادی کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ انسان کو ایسا کوئی انسان نظر نہیں آتا جس کی تقرب کی وہ خواہش کرے اور نہ ہی وہ خود کو کسی کے تقرب کا اہل سمجھتا ہے۔

نور بانو۔ کوئٹہ

سنہری حروف

✓ پریشانی حالات سے نہیں خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔

✓ بہترین آنکھ وہ ہے جو حقیقت کا سامنا کرے۔
✓ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا اور آسان کام دوسروں پر تنقید کرنا ہے۔

✓ نفرت دل کا پاگل پن ہے۔
✓ انسان زندگی سے ناپوس ہو تو کامیابی بھی نا کامی نظر آتی ہے۔

زارا صدف قرہ۔ کراچی

بچپن

کیونکہ اس گزرے ہوئے پل کو ہی دیکھ لیں جس میں زندگی چمکتے جھلملاتے ستارے کی مانند مگر بے فریب سی تھی۔ خواہشات اور آرزوئیں تو اس وقت بھی بہت تھیں مگر ان کے پورا ہونے اور نہ ہونے کا احساس اتنا زیادہ شدت آمیز نہ تھا نہ دیر پاسکراہٹیں تو آج بھی مل ہی جاتی ہیں مگر وہ لمحات تو تھے ہی مسکراہٹوں کے جو مسکراہٹ ملتی دل تک اثر کرتی جو بات ملتی صحیح لگتی۔ اس وقت دوریوں کا احساس قاصلوں کی بنیاد پر کیا جاتا رہا اور جب نزدیکیاں ملتیں تو بھی دوریاں برقرار رہتیں۔ حرارت اس قدر نہ تھی کہ حالات کی برف سے پھل کر ڈھکے ہوئے احساس نمودار ہو کر دل کی آنکھ کے سامنے آسکتے۔

ردا ڈائجسٹ 240 فروری 2016ء

فریب خوردہ لاکھوں افراد شیطان کے مکر کا شکار ہیں مگر صرف ایک توبہ صرف ایک سچے دل سے توبہ دل و دماغ صاف چمکدار پاک اور وقت پیدا کرنا جیسا نیا ٹکڑا بنا دیتی ہے اور وہی توبہ آئندہ زندگی کی سنگ میل بن جاتی ہے۔

دھنک ناز۔ کراچی

واصف علی واصف کہتے ہیں

☆ انسان عمل کے لیے علم حاصل کرتا ہے لیکن جوں جوں علم پھیلتا ہے عمل کے مواقع سمٹنے شروع ہو جاتے ہیں۔ آج کے انسان کا سب سے بڑا حصول علم ہے اور یہ عمل اس کو فرائض کی بجا آوری کے عمل سے بہت دور کر دیتا ہے۔ سڑک کے کنارے کمرے میں بیٹھ کر زندگی کا مفہوم سمجھنے والا اس زندگی کو نہیں سمجھ سکتا جو سڑک پر سے گزر رہی ہے۔

☆ کچھ لوگ حقیقت کو تلاش کرتے ہیں۔ دراصل یہ تلاش نہ ختم ہونے والی تلاش ہے۔ دراصل محدود و کالامحدود کے لیے سفر کی بیان میں نہیں آسکتا۔ قطرے کے قلمزم آشنا ہونے کے لیے کن مراحل سے گزر رہے ہیں یہ وہی جانتا ہے جس پر یہ مقامات اور مراحل گزرتے ہیں۔

☆ ہر چیز انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھ سکتا پھر وہ مرے بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔

☆ جو لوگ دنیاوی اشیاء اور ضروریات کے حصول کے لیے مضطرب ہیں وہی دراصل تکلیف میں ہوتے ہیں۔

☆ تنہائی کے مسافر پیار و دھوں کی طرح اذیت کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

☆ رفاقتوں کے فیض اعتماد کے دم سے ہیں

READING
Section

اچھا تھا کہ اس وقت تنہائیوں سے آگاہی نہ تھی کہ تنہا ہو کر بھی خود کو تنہا نہ سمجھتے تھے سوچیں صرف محدود تھیں مگر ان کا انجام غیر محدود کسی سے جدا ہو کر ملن کی خواہش کم کم ہی تھی، آنسو آنکھوں ہی سے ٹپکتے تھے مگر دل تک رسائی کچھ بھی نہ تھی اور اگر تھی تبھی تو دماغ سے بالاتر ہو کر چاہتیں عارضی تھیں اور دکھ پل بھر کے لیے ہی ہوتے۔ اب کہ بالعکس روشنیاں زیادہ مسرت آمیز تھیں اور اندھیروں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اب کے بجائے کچھ اور نہیں تو زندگی کا ایک ہی روپ تھا جس میں زمانے نے رنگ بھر لیے اور وقت کے ساتھ ساتھ مختلف رنگوں میں ڈھلتا گیا۔

غرض کہ وہ پل بھی گزر گیا اور جو کچھ اب ہے آنے والے پل میں وہ بھی نہیں رہے گا۔

ملک جو ادنواز۔ ڈیرہ اسماعیل خان

زندگی کی حقیقت

زندگی سمندر کی طرح وسیع ہے جس کا دور دور تک کوئی سرانظر نہیں آتا اور سمندر کی طرح گہری ہے۔ جس کو تانے میں مدتیں گزر جاتی ہیں۔ عظیم انسان وہ ہے جو مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور کئی مدتیں گزار کر اس کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اس کی گہرائی کو ناپتا ہے اور اس میں پوشیدہ ہیرے جواہرات حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سطح کو ہی سب کچھ جان کر اس کی لہروں سے الجھتے الجھتے اپنا وقت ضائع کر دیتے ہیں اور آخر میں ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

یا گل نہیں

لڑکی اپنے ناپید عاشق سے۔

”کاش! تمہاری آنکھیں ہوتیں تو تم میرے

READING
Section

حسن کو دیکھتے۔“
لڑکا: ”اگر تم خوب صورت ہوتیں تو کیا آنکھوں والے تمہیں میرے لیے چھوڑتے؟“
اندھا ہوں یا گل نہیں۔

ریمانور رضوان۔ کراچی

نمک پازے.....!

☆ کچھ لوگ خطوط کی طرح ہوتے ہیں جن کو بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرتا اور دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ ہمارے پاس رہیں۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستے مل جاتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ چائے کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں جن کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈالے بغیر پتا نہیں چلتا کہ ان کا اصل رنگ کیا ہے۔

☆ زندگی ایک ایسا سایہ دار درخت ہے جس کو سانس کی آری مسلسل کاٹ رہی ہے نہ جانے کب کیا ہو جائے۔

☆ اگر ہم کسی سے پیار کرتے ہیں تو یہ ہمارا ذاتی فعل ہے اگر جواب میں وہ بھی ہمیں اتنا ہی پیار دے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔

☆ کسی کو پانے کی تمنامت کرو بلکہ خود کو اس قابل بناؤ کہ لوگ تمہیں پانے کی تمنا کریں۔

☆ دوست بنانے سے قبل اپنے دل میں ایک قبرستان بنا لو تا کہ دوست کی برائیاں دُفن کر سکو۔

☆ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے دل میں اتر کر اس کے دکھ کا اندازہ کر سکے۔

☆ انسان کی شخصیت اتنی گہری ہونی چاہیے کہ اندر کا حال کوئی نہ جان سکے۔

ایس اتمیا احمد۔ کراچی

☆.....

فردا پھر کبھی

پھر بھی اپنی ہی لگتی ہو
میرے دل کو پیاری بہت لگتی ہو
کسی خواب نگر کی شہزادی
کسی مست نگر کی ملکہ
کسی سیب میں بند موتی جیسے
کسی خواہش کی شدت ہو جیسے
تم اتنی ہی دلاری لگتی ہو
تم جان سے پیاری لگتی ہو!

مریم ماہ منیر

محبت

محبت پھر محبت ہے
کبھی دل سے نہیں جاتی
ہزاروں رنگ ہیں اس کے
عجب ہی ڈھنگ ہیں اس کے
کبھی صحرا کبھی دریا
کبھی جگنو کبھی آنسو
ہزاروں روپ رکھتی ہے
بدن جھلسا کے جو رکھ دے
کبھی وہ دھوپ رکھتی ہے
کبھی بن کے یہ اک جگنو
شب عم کے اندھیروں میں
دلوں کو آس دیتی ہے
کبھی منزل کناروں پر

نیا برس

اب کے جو نیا برس آئے گا
ساتھ غموں اور خوشیوں کی
سوغات لائے گا
کہیں خوشیوں کی برأت تو
کہیں غموں کی برسات ہوگی
کہیں وصل کے اُجالے
تو کہیں ہجرت کی رات ہوگی
اس برس بھی آنسوؤں کو
موتیوں میں پر دانا ہوگا
نا چاہتے ہوئے بھی
کچھ لوگوں کو کھونا ہوگا
نئے برس ہم انتظار کے
نئے دیپ جلائیں گے
گزری یادوں کی
خوشبو سے سحر
دل کی دنیا
مہکائیں گے

شہلا گل سحر صالح

اچھی لگتی ہو

تم مجھ کو اچھی لگتی ہو
تم دل کو اچھی لگتی ہو
مانا کہ ہمیں میں نے دیکھا نہیں

پیا سا مار دیتی ہے
 اذیت ہی اذیت ہے
 مگر یہ بھی حقیقت ہے
 محبت پھر محبت ہے
 کبھی دل سے نہیں جاتی

فرزانہ شوکت

بے وفا

تم بے وفا نہیں ہو
 کیسے یقین کروں میں

ہاں

تم بے وفا نہیں ہو

اپنا بنا کر

دل میں بسا کر

وعدے کر کے قسمیں کھا کر

چھوڑ گئے ہو

تہا کر کے

نئے ہمسفر کے ساتھ

نئی منزلوں پر

نئے راستوں پر

پھر بھی

تم کہتے ہو

میں بے وفا نہیں ہوں

گہمت اکرم

غزل

مجا دو دیر حرم میں بچل وفا کا اپنا دکھا کے آپل

خلوص دل سے دعائیں کر لو

ہمارے حق میں اٹھا کے آپل

تمہارے دم سے ہیں رونقیں یہ

تہتہارے جلوؤں سے ہیں اُجالے

READING
Section

اندھیرا محفل میں کر نہ دینا تم
 اپنے رخ پہ گرا کے آنچل
 ذرا تو سوچو کہ ہو گا کیا اب
 وہ دل کی بے تابیوں کا عالم
 کسی کی کیوں جان لے رہے ہو
 یوں اپنے منہ میں دبا کے آنچل
 ہماری منزل ہے جستجو میں بھٹکتے رہنا تمہاری خاطر
 فریب دیتے رہو ہمیں تم ہوا میں اپنا اڑا کے آنچل
 عجیب دلکش تھا وہ نظارہ کہ دیکھ لو ناسخ کا تارہ
 گئے وہ اس ناز سے ادا سے
 ہمارے ہاتھوں چھڑا کے آنچل
 ہمیں یقین ہے کہ روز محشر امتیاز
 رب کو منا کے اپنے وہ بخشوا دیں گے
 سب خطائیں خدا کے آگے بڑھا کے آنچل
 ایس امتیاز احمد

غزل

یہ تو بتا میرے دل کو سکون کب ہو گا

دیوانے ہیں جو دن رات پھرتے ہیں ہم

شام کے گہرے سائے اب تو ڈھلنے لگے ہیں

لوٹ کے اب شہر وفا میں آتے ہیں ہم

تپش تیرے ہجر میں سورج سے بھی زیادہ

ٹوٹے ہوئے دل سے اکثر فریاد کرتے ہیں ہم

ہر پل زمانہ نگاہیں بدلتا ہی رہا ہے

قدم قدم زندگی میں یوں دھوکا کھاتے ہیں ہم

دل سمندر دیکھا نہیں کسی کا ہم نے جاوید

شہر ظلمت میں جی کو لگاتے ہیں ہم

محمد اسلم جاوید

نظم

جو ہنساتے ہیں وہ کبھی کبھی رلا بھی دیتے ہیں

ردا ڈائجسٹ [243] فروری 2016ء

ہاتھوں میں پھول دینے والے
اکثر راہ میں کانٹے بچھا بھی دیتے ہیں
تخت پر بٹھانے والے کبھی کبھی منہ کے بل
فرش پر گرا بھی دیتے ہیں
حوصلہ بڑھانے والے اکثر
حوصلہ گھٹا بھی دیتے ہیں
خلوص دل سے ملنے والے
کبھی کبھی دل دکھا بھی دیتے ہیں
زخموں پر مرہم لگانے والے
اکثر زخموں کو ادھیڑ بھی دیتے ہیں
جن کے بن ایک پل بھی گزارنا
دشوار ہوتا ہے ہاجی
وہ اکثر عمر بھر کی جدائی کا تحفہ
تھما بھی دیتے ہیں

ہاجرہ امین خان ہاجی

نوحہ

اس شہر میں
ایک شورا تھا
شاعر بے چارہ مر گیا
کیسے ہوا سب نے کہا
پیار تھا فاقوں سے تھا
پیسے نہ تھے لینا دوا!

کچھ بھی نہ اس کے پاس تھا
حساس دل گھائل بھی روح
دھچکا لگا اور مر گیا
سب ددڑے اس کے گھر گئے
اور اس کے مردہ جسم کو
کنڈھا دیا

اور اپنے ہاتھوں سے اسے دفن دیا
اس شہر میں اس شہر میں

تعزیتی اجلاس ہوئے
سب نے کہا کتنا بڑا شاعر تھا وہ
ہر آنکھ میں آنسو بھی تھے
ہر لب پر اس کا ذکر تھا
اس شخص کی تعریف میں
مضمون بھی چھپنے لگے
ہر صاحب علم دذکا
اس شخص کی تعریف میں
جتنا بھی کہہ سکتا تھا وہ کہتا گیا
دل کھول کر ہر شخص نے
اس مردہ شاعر کے لیے
پیسہ دیا، تربت بنی، پیسہ لگا
پیسہ کہ جس کی شکل کو
وہ عمر بھر ترسا گیا
زیر زمین سونے ہوئے
اس شخص کی بے چین روح
کہنے لگی یہ بر ملا
زندوں کو کب ہیں پوچھتے
مردوں کو ہم ہیں پوجتے

ریاض حسین قرمر

غزل

ابھی یہ سوچنا ہے
مجھے کب سونا ہے
جدائی سے درمیان ہمارے
کیسے ہوش میں ہوتا ہے
ہونٹوں سے مسکراہٹ خفا ہے
بس یہی رونا ہے
وہ آنکھیں یاد کرتا ہوں
جب ہوتا رونا ہے
وہ زخم دیتا جائے گا

رداؤ اجنٹ 244 فروری 2016ء

Section

میرا کام سب بھولنا ہے
وہ درد کا سوزج ہے
احتیاط سے اسے چھوٹا ہے
جہاں وفا رہتی ہے ساگی
وہ صحرا ڈھونڈتا ہے

زبیرہ نیبیار

نظم

مجھے اس ستم کا پتا نہیں
ہیں زخمی پاؤں اور زخمی وجود
مزہم کہاں سے لاؤں کچھ پتا نہیں
تن من جل کر خاک ہوا
اس درد کی راہ میں نکلی جب
اب عادت اتنی گہری ہے
اس درد کا مجھ کو پتا نہیں

سعدیہ اقبال

نظم

کبھی تو لوٹ کے آؤ
کسی تہاشام
دل ہو جب اُداس اور تیرے لیے غم خوار
تب حلقے سے تم آ کے
میری آنکھوں پہ اتھر رکھ دو
اور دھیرے سے یہ کہہ دو
لوٹیں آ گیا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے
صرف تیرے لیے جاناں
اب کے برس یہ عہد ہے
بھی نہ تھا چھوڑوں گا
ہمیشہ ساتھ تیرے رہوں گا
اب کے ہیں تیرے سارے
دکھ سکھ ہیں میرے
اپنے سارے غم مجھے سوئپ کے
ہو جاؤ بے فکر جاناں
کیونکہ میں لوٹ آیا ہوں
بھی نہ جانے کے لیے
کاش کہ یہ سب تم، بھی تو کہہ دو مجھ سے
اور بھی تو لوٹ کے آؤ، کسی تہاشام

ماریہ یاسر

☆.....

ہے کون جو ہو
پیار سے بیگانہ
نا معلوم ہو جس کو یہ
پیار ہے کیسا خزانہ
جس نے کیا اسے
اسے بھرنا پڑا ایڈیڈ
رہ گیا بن کے
درد پرانا
پچھلے سال کا ہو
جیسے موسم
ٹوٹ چاہے دل دل
اپنا
بیدار نہ ہو یہ من
بس کسی کا نہ چلا اس پر
ہے یہ اک پاگل پن

نور العیاء

درد

میں درد کے رستے میں نکلی ہوں
مجھے درد کی منزل کا پتا نہیں
کبھی اشک رکاوٹ ہو جائیں
کبھی خالی دل کا سونا پن!
روح کیسے کب ویران ہوگی

رواڈ انجسٹ 248 فروری 2016ء

READING
Section

سی نورین سمیت میری تمام پیاری پیاری سی قارئین بہنوں کو سلام محبت قبول ہو۔ سال لو کے ہمراہ موسم سرما کا بھی بالآخر آغاز ہو چلا (کراچی میں) ایسے سرد سرد سے موسم اور شہنشاہی ہواؤں میں گرما گرم سوپ بھاپ اڑاتا کافی کافے اور موگ پھیلوں کے ہمراہ اپنا من پسند ڈائجسٹ ہو تو اس سرد سے موسم کا بھی مزہ دو ہالا ہو جاتا ہے۔ اب بات ہو جائے جنوری کے سرد سے موسم میں اپنے من پسند ڈائجسٹ کی۔ روشن دکھرا دکھرا سا سرورق دل کو بھایا۔ ”گوشہ آگہی“ میں ہمیشہ کی طرح صالحہ آپنی کے قلم سے بکھرے موتیوں جیسے الفاظ روشن نظر آئے۔ آپ کے یہ منفرد سے الفاظوں سے سجا گوشہ آگہی ہمیشہ دل کو چھو جاتا ہے۔ محبتوں کا احساس لیے خوب صورت سنا ناول ”مجھے چاہت تمہاری ہے“ سب اس آگہی بہت اچھا لکھا آپ نے۔ دونوں ناولت بھی اپنی اپنی جگہ خوب رہے۔ ”پارسا“ کا کردار بہت پاور فل تھا جب کہ بسمہ احمد نے بھی اچھا لکھا۔ افسانے وہ بھی اتنے سارے اس بار کا سال نو بھر بلاشبہ افسانہ بھر رہا۔ ان صلی کا انداز بیان بہت زبردست لگا۔ ان کا افسانہ ”روایت ہے“ مختصر مگر جان دار لفظوں سے نمایاں نظر آیا۔ منظر کشی سے لے کر الفاظ تک سب بہت اچھے لگے۔ حب الوطنی کے جذبے سے پورا عائد ذوالفقار کا افسانہ پڑھ کر پاکستانی ہونے پر فخر کے ساتھ ساتھ اسے گندہ کرنے والوں پر بھی شدت سے افسوس ہوا۔ ”تر بیت“ پیاری سی نیا کنول نے مختصر پیرائے میں بہت اہم سبق دیا۔ واقعی اعتبار اجتماع کی دلیل ہے۔ فرح ناز رفیق آپ نے بھی اچھا لکھا خاص کر آخری پیرا گراف۔ دانیہ آفرین کا نام کافی عرصے بعد پڑھنے کو ملا روا میں۔ مختصر افسانے کے ساتھ مختلف موضوع کے ہمراہ بہت اہم پہلو سے روشناس کرایا آپ نے۔ ایک اچھی تحریر ہمیں پڑھنے کو دی۔ اس کے علاوہ ماریہ یاسر، سہیہ اقبال، مہرین کنول، حنا صفر، نظیر قاطنہ بھی نے اچھا لکھا۔ اب بات ہو جائے اس ناول کی جو کافی ماہ

تک ردا کی جان بنا رہا اور پھر اختتام پذیر ہو چلا۔ محبتوں د چاہتوں سے گندھی پیاری کی برسات میں بھیگی خوب صورت کرداروں سے نئی منفرد سی تحریر اپنے پیارے سے ٹائٹل کے ساتھ یادگار نقوش چھوڑتی اختتام پذیر ہوئی اس خوب صورت سے ناول کو اتنے اچھے انداز میں اختتامی موڑ دینے پر نائیلہ طارق آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ جب کہ شازیہ آگہی کا ناول بھی خوب جا رہا ہے اور عائشہ ذوالفقار کا لوک جھونک سے بھرا مسکراہٹ لانا ناول بھی زبردست جا رہا ہے۔ باقی تمام سلسلے خوب رہے۔ سندیے کی محفل تو ہمیشہ بارونق اور خوب سے خوب تر ہوتی ہی ہے۔ میری تمام بہنیں جو وقتاً فوقتاً مجھے یاد کرتی ہیں ان کی محبتوں، دعاؤں کے لیے تمہ دل سے مشکور ہوں۔ معذرت کے ساتھ کچھ کچھ مصروفیت کے باعث اس بار سندیہ طویل نہیں لکھ پائی ہوں۔ انشاء اللہ اگلی بار بھی کو مخاطب کرتے ہوئے طویل سندیے کے ساتھ حاضر محفل ہوں گے تب تک کے لیے اپنی دعاؤں میں ہمیں شامل رکھیے گا!

فرح ناز محمد رفیق۔ کراچی
 السلام علیکم! تمام قارئین کو پیار بھر اسلام۔ عائشہ، قمرش، نائیلہ، شازیہ، انشاں ہمیشہ کی طرح نام سب کے یاد ہیں مگر سٹ لپی ہو جائے گی۔ سب کو بہت سارا پیار تعریفیں کچھ لیٹ اس مگر مصروفیات بھی بہت ہیں تو معذرت کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ نائیلہ صاحبہ یہ مولانا جنٹ ٹائپ ہیرڈن آپ ہی لاسکتی ہیں آپ کی اسٹوری کا نام میرے لیے کچھ یوں ہے کہ جو عارش پر خرمن بنتی وہ عارش ہی جانے اور قمرش خدارا اتنا روئیں لگتا ہے ڈالے کا کردار آپ پر پورا اترتا ہے۔ شکر سے میرے بے ہوش ہونے سے پہلے آپ نے ہاتھ ہلکا کر دیا مگر قسم سے بہت مزہ آیا دل خوش کر دیا۔ شازیہ جی پلیز یہ حسنی کی لڑائی تو کچھ آگے بڑھائیں آپ کا لکھا اشد کمال جیسا کچھ پڑھنے کو دل بے تاب ہے۔ اب بات کی جائے شانکہ دعباد کی تو ویل ڈن

اسی طرح تبصرہ کر کے اپنی قیمتی آراء مجھ تک پہنچاتے رہے گا تاکہ میں مزید بہتری کر سکوں۔ جویریہ بانو کا ناولٹ بھی بہت خوب تھا۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ میری کہانی پسند کرنے پر میں افشاں علی صبا عبدالغنی اور خاص کر قیمتی آراء آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

رابعہ افضل خان — کراچی

ڈھیر ساری محبت، نیک تمناؤں دعاؤں اور خوب صورت سی مسکراہٹ سے سجا سلام صالحہ آپی، نورین ملک اینڈ رفا قارئین و برائٹرز کی خدمت میں حاضر ہے۔ امید واثق ہے کہ آپ تمام لوگ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نیا سال ہم سب کے لیے ڈھیروں خوشیوں کی سوغات اپنے سنگ لائے اب آتے ہیں تبصرے کی جانب سرورق پر موجود نیا نے فوراً توجہ منجھی۔ ”گوشہ آگئی“ اور ”روائے جنت“ میں بکھرے موتیوں کو سمیٹتے شازیہ جی کے ناول ”تجھ کو مانگوں میں تجھ سے“ پر آ کر کے اور ہر بار کی طرح اس وقت بھی ناول پڑھتے ہوئے ہمارے لبوں پر مسکراہٹ نے پہرہ جمائے رکھا۔ اختتام کی جانب رواؤں آپ کا ناول بہت زبردست ہے۔ نائیلہ طارق ”جو عشق میں جیتی وہ عشق ہی جانتے“ بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔ چل اڑ جا اب تیری باری عائشہ ذوالفقار کا ناول بھی بہت اچھا ہے۔ بالکل اپنے نام کی طرح سب اس گل جی مجھے چاہت تھاری ہے اتنے زبردست مکمل ناول کے ساتھ روا میں شامل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ”بارسا“ جویریہ بانو کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ افسانے کی محفل میں ایقان علی، عائشہ ذوالفقار، سعدیہ اقبال، ماریہ یاسر، مہرین کنول، حنا اصغر، نظیر فاطمہ، فرح ناز رفیق، وانیا آفرین، حورینہ سعد سب ہی نے بہت اچھا لکھا اور خوب رونق لگائی ہے تعلق اور ہی بسمہ احمد کا ناولٹ بالکل اپنے نام کی طرح تھا۔ ”روا کی ڈائری“ سے شہلا گل سحر، افشاں علی کا انتخاب پسند آیا۔

اشعار سب ہی اچھے لگے۔ ”اس ماہ میں“ ربیما نور رضوان کی غزل ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”ش سے شوہر“ ایس امتیاز احمد نے کیا خوب تبصرہ کیا۔ ”خوشبو“ میں ہر لفظ ہی خوشبو کی مانند مہکتا ہوا تھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سب کی شاعری لاجواب تھی۔ ”سندیے“ کی محفل بھی خوب بارونق تھی۔ ڈیڑھ افشاں علی سندیے کی پسندیدگی کے لیے جزاک اللہ پیاری ماریہ یاسر افسانے کے ساتھ ساتھ آپ کا تبصرہ بھی ہمیں پسند آیا۔ سوئیٹ سی صبا عبدالغنی میرا سندیہ آپ کو پسند آتا ہے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کو میری برتھ ڈے پاورنگی۔ میرے ساتھ ساتھ میری سسٹرز کو بھی آپ نے ش کیا تم سے یار دل خوش ہو گیا۔ فریدہ فرید سندیے کی محفل سے آپ کہاں عاقب تھیں۔ آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ ڈیڑھ فرزانہ فرزین آپ کو شادی کی ڈھیر ساری مبارک باو اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں عطا کرے، آمین۔ کچن اور سنگھار ہمیشہ کی طرح بیٹ تھے۔ قیمتی آراء جی ہم پر بھی نظر کر م فرمائیں۔ سندیے کی محفل میں سب ہی نے خوب رونق لگائی۔ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شاء کنول اللہ دتہ آپ نے جو کسی اپنے کے نام پیغام لکھا بہت زبردست تھا۔ دل کو چھوٹا ہوا آخر میں روا کے لیے ڈھیر ساری وحائیں اور نیک تمناؤں اس کے ساتھ ہی اپنی دوست رابعہ افضل خان کو اجازت دیجیے، خدا حافظ۔“

صبا عبدالغنی — کراچی

سفر روا کے سنگ چلنے والے خوب صورت، پر خلوص اور محبت کرنے والے لوگوں اور شہزادوں کو سلام الفت قبول ہو۔ السلام علیکم، سر دیوں نے تو لگتا ہے کہ قسم کھائی ہے کہ شہر کراچی میں قدم نہیں رکھیں گی۔ اب اگر جنوری کے روا کی بات کی جائے تو سرورق اچھا تھا۔ سب سے پہلے ”گوشہ آگئی“ سے مستفید ہوئے۔ صالحہ ایسا آپ کی محنت کو نہ سراہنا زیادتی ہے جس طرح آپ، نورین ملک اور روا کی

بار افسانوں کی لمبی قطار ہماری منتظر تھی۔ ایقان علی! آپ کی تحریر میری نظر میں ٹاپ پر تھی۔ آپ کو تو میں ہر بار سینئر رائٹرز کی لسٹ میں سرفہرست رکھتی ہوں۔ بے شک آپ کی تحاریر قابل تعریف ہوتی ہیں۔ عائشہ ذوالفقار! وطن کی محبت سے بھرا آپ کا افسانہ دل کو چھو گیا۔ اگر ہمارے ملک میں برائیاں ہیں تو اچھائیاں بھی موجود ہیں۔ آپ کی اس تحریر کے لیے میں آپ کو بہترین لکھاری کا اعزاز دیتی ہوں۔ سعدیہ اقبال! آپ کی کاوش بہترین تھی۔ ماریہ یاسر! آپ کی یکے بعد دیگرے تینوں افسانوں نے مجھے متاثر کیا۔ ردا میں ہر ماہ اپنی تحاریر کے ذریعے روشنی بکھیرتے رہیے گا۔ مہرین کنول! آپ کا نام ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ افسانوں میں آپ کا نام دیکھ کر ہی تجسس ہوتا ہے کہ اس بار کس طرح کا افسانہ لکھا ہوگا۔ اس بار کی آپ کی تحریر نے متاثر کرنے اور پسندیدگی کی سند حاصل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حاصنہ! آپ کی ردا میں پہلی شرکت ہے اس لیے آپ کو خوش آمدید۔ آپ کی کہانی بہترین تھی۔ کہانی کا ہر کردار پرفیکٹ تھا ویلڈن۔ نظیر فاطمہ! آپ کو بھی ردا میں خوش آمدید۔ مزاح سے بھرپور آپ کی تحریر مجھے بہت پسند آئی۔ ویری ویری گنڈ۔ فرح ناز! آپ کی تحریر اس بار تھوڑی چینی تھی (یعنی ہر بار کی طرح وطن کے متعلق نہیں تھی)۔ لیکن یہ چوتھک پسند آئی۔ بریرہ کا معصوم اور مظلوم سا کردار بہت پسند آیا۔ وانہ آفرین! آپ کی تحریر بے حد خوب صورت تھی۔ آپ کی تحریر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ منال کا کردار بہت اسٹرونگ تھا ایسے کردار ایٹریکٹ کرتے ہیں۔ حورینہ سعد! ردا فیملی میں آپ کو دل سے ویلکم۔ ویسے آپ کا نام بہت پیارا ہے۔ آگے بھی اپنا سفر ردا کے سنگ جاری رکھیے گا۔ ثناء کنول! بے شک اولاد کی تربیت ماں باپ کا اہم فریضہ ہے۔ آپ کی کہانی اور لفظوں نے سیدھا دل پر اثر کیا اور کہانی تو ہمیشہ وہی اچھی ہوتی ہے۔ جو دل پر اثر کر

پوری ٹیم ردا کو سنوارتی ہے وہ بے شک قابل تعریف ہے۔ ردا اسٹاف کا ہر ایک ممبر ہمارے لیے خاص ہے۔ آپ کی نورین آپنی کا اور ردا کے پورے اسٹاف کا بے حد شکریہ جو ہر ماہ ہمارے لیے ردا کو سنوارتے ہیں۔ ”ردائے جنت“ میں آداب کا بیان پڑھتے ہوئے نائیلہ طارق کے ناول کی طرف بڑھے۔ آخری قسط کے ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی حیرانی سی ہوئی۔ یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی اینڈ ہو جائے گا۔ اینڈ بہت اچھا تھا۔ خرمن کے لیے عارش کا سر پرانز بے حد دلکش تھا، نائیلہ آپنی! اتنے اچھے ناول کی کامیابی پر ڈھیروں مبارک باد قبول ہو۔ شازیہ مصطفیٰ! بلاشبہ آپ بہترین رائٹر ہیں اور آپ کا ناول بھی بہت عمدہ ہے ویلڈن۔ عائشہ ذوالفقار! آپ کی تحریر پسندیدگی کی سند پر براجمان ہے۔ آپ کی کہانی میں آپ کا تجربہ بول رہا ہے۔ یونیورسٹی اور جاب کے حوالے سے اتنا کچھ بغیر تجربے کے لکھنا ممکن نہیں ہے۔ حائقہ ارشد کا کردار اٹریکٹو ہے لیکن پلیز حائقہ کی شادی عمیر راؤ سے مت کروائیے گا، اوکے۔ سہاس گل! سب سے پہلے تو شکریہ کہ آپ نے ہمیں اپنی تحریر کے لیے زیادہ انتظار نہیں کر لیا۔ کہانی بے حد اچھی اور متاثر کن تھی۔ ایک بات نوٹس کی ہے میں نے کہ آپ کی کہانیاں عموماً اعتبار کے حوالے سے ہوتی ہیں (ایم آئی رائٹ)۔ عیسیٰ علوی سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی اور رائٹل کے کردار نے بھی متاثر کیا، ویلڈن۔ اس ماہ کے دونوں ناولٹ مجھے بہت پسند آئے۔ جویریہ بانو! آپ کی تحریر دو دماغ پر نقش سی ہو گئی ہے۔ خالص گاؤں کا ماحول، کھیتوں کا منظر اور محبت و ایثار کی داستان سے بھرا ناولٹ ہر کسی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ویلڈن۔ اور ہاں اب غائب مت ہو جائیے گا۔ بسمہ احمد! آپ کی تحریر مجھے بہت پسند آئی۔ محمل کے نام اور معصوم سے کردار نے ایٹریکٹ کیا۔ آپ کی ردا میں شادی پہلی تحریر ہے اس لیے آپ کو دل سے ویلکم۔ اس

دوستوں کے فائدے دینا

تیرا قرض ہے میری زندگی
میری سانسیں تیری امانتیں

جان! آپ کا ساتھ آپ کا پیار میرے لیے
زندگی کا حاصل ہے آپ کا ساتھ پا کر مجھے خود پر
رکھک ہوتا ہے، آپ کے ساتھ میری زندگی مکمل
سی ہو گئی ہے۔ آپ کے سنگ یہ میرا پہلا ویلنٹائن
ہے اور مجھے اپنے ردا سے زیادہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں
لگا۔ آپ سے اپنی چاہت کے اظہار کا خدا آپ کو
بہت سی کامیابیاں عطا کرے اور ہم یونہی محبتوں
کے سائے میں چلتے رہیں۔

مسز احمد - کراچی

زندگی کے نام

یہ جواک سج کا ستارہ ہے
زندگی تیرا گوشوارہ ہے
اے مقدر کوئی حساب تو رکھ
کوئی جیتا ہے کوئی ہارا ہے
رفتہ رفتہ یہ ماجرا کھلا
دل کے سووے میں سب خسارہ ہے
کیسی افتا و بڑ گئی آخر
وقت گزرا نہیں گزارا ہے
عشق کے درمیان بھول گئے
کیا تمہارا ہے کیا ہمارا ہے
رنگ بھی کھل رہا ہے چاہت کا

نینا علی کے نام

میری لولی اور پیاری نینا علی تمہیں تمہاری
شادی کی ڈھیروں مبارک باو خدا کرے کہ تم ہمیشہ
خوش رہو اپنے پیار کے سنگ اور علی بھائی تمہارے
لیے بہترین ہمسفر ثابت ہوں، آمین۔

رائین خالد - گجرات

S.R گروپ کے نام

ہاں تو میری چھٹی اور شرارتی فرینڈ کیسی ہو؟
ہو پ سو مزے میں ہوگی اور سرویوں میں ڈرائی
فروٹ کے مزے لے رہی ہوں گی۔ جی تو یہ آپ
کے گروپ کی سب سے کیوٹ پرسنز تم سب
لوگوں کو نیوایز کی ڈھیروں مبارک باو دیتی ہے اور
پپی ویلنٹائن ڈے خوش رہو میرے ساتھ بھی اور
میرے بعد بھی ہم سب کا یہ ساتھ سدا قائم رہے
اور محبتوں کے یہ سلسلے یونہی رواں دواں رہیں۔
عینی رحمن - لاہور

اپنے ہسپینڈ کے نام

میرے ہمسفر تیری نذر ہیں
میرے دل کی یہ شدتیں
میرے خواب میری بصارتیں،
میری دھڑکنیں میری جاہتیں
میرے روز و شب کے نصاب میں
میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں

معصوم مسکان، دلکش انداز، خوب صورت اخلاق

انمول مجموعہ صفات ہوتی

ڈھیر سارا پیار اور ولی تمنائیں اس پیاری
کے نام جو پچا کو پیاری ہونے جا رہی ہے۔ ہماری
اس خوب صورت سی ہامیٹ اور کیوٹ سی مسکان
والی حلیمہ فیاض پروفیسر ہونے والی ہے کیونکہ
2016ء میں بالآخر اس کو اس کا پرفیکٹ ہامیٹ
سیچ مسٹراٹھ جوئل گیا ہے۔ اللہ کرے کہ اس کی
آنے والی زندگی اور یہ نیا رشتہ اس کے لیے
خوشیوں، راحتوں، پیار و محبت سے بھر پور ہو۔ یہ
ہمیشہ خوش، ہنستی مسکراتی، شاد و آباد رہے۔ خوشیاں
ہمیشہ اس کے قدم چومیں اور پریشانیاں اس کے
گھر اور اس کی زندگی سے میلوں دور رہیں۔ اس
مخلص اور اچھے اخلاق والی معصوم جذبات سے
سچی لڑکی کو اس جیسے ہی پر خلوص اور قدر و ان
لوگ ملیں جن سے اس کی زندگی سدا مہکتی
رہے، آمین ثم آمین۔

مصباح مسکان روف، امینہ روف۔ جہلم

رضوان جی کے نام

تم ہمسر، تم ہم راز ہو

میرے جیون کی بہار ہو

میرے جیون کا نکھار ہو

تمہیں پا کر زندگی مکمل ہوئی

تم ہمسر تم ہی ہم راز ہو

ہسپوڈ صاحب رب العزت تمہیں ہمیشہ صحیح

سلامت رکھے، آمین ہماری زندگی خوشیوں سے

چاند تاروں سے سچی رہے۔ آمین۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

.....☆.....

مذاہب مجسٹ 253 فروری 2016ء

کس نے منظر کو یوں سنوارا ہے

آنکھ بھرنے لگی ہے یادوں سے

شور دریا ہے چپ کنارہ ہے

یہ دے پاؤں کون آیا ہے

کس کی آہٹ نے پھر پکارا ہے

یہ جو اک صبح کا ستارہ ہے

رابعہ منیر۔ سرگودھا

کسی مہربان کے نام

زندگی کی شاہراہ پر ٹکرانے والے کچھ مسافر
ہماری سوچوں کا کچھ حصہ جکے سے اپنے نام
کر جاتے ہیں اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا پھر یوں
ہوتا ہے کہ گزرتے وقت میں کسی کے لہجے کا پیار،
گفتگو کی شیرینی، سادگی اور آنکھوں کی چمک
ماضی کے درپہلوں سے جھاکتی ہے اور اپنے ہونے
کا یوں احساس دلاتی ہے کہ ہم خود فراموشی پر
سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں کر پاتے اور وقت
گزرنے کے بعد ہمیں اس مہربان کی اہمیت اور
قدر ہوتی ہے مگر جانے والے کب لوٹ کر آیا
کرتے ہیں۔

اقصی کنول۔ کمالیہ

حلیمہ فیاض کے نام

لفظ ”دوست“ سے جو صفات ذہن میں آتی

ہیں ان سب کی عمدہ مثال تم ہو۔

ایک سچی مخلص سہیلی ہوتی

نازک سی الیسی ہوتی

ہر اک سے پیار کرتی ہو، ہر سو پیار کھیرتی ہو

نایاب محبت کی مثال ہوتی

ہماری زندگی کا حصہ ہوتی

! : : : ایک نہایت پیارا سا رشتہ ہوتی

READING
Section

کچھ

ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے پہلے سے گرم آئل میں ڈال کر ڈیپ فرائی کریں اور گولڈ براؤن ہونے پر نکال کر کچن پیپر پر رکھ کر اضافی تیل جذب کر لیں اسی طرح ایک ایک کر کے گوشت کے تمام ٹکڑوں کو کوٹ کر تے ہوئے ڈیپ فرائی کر لیں۔

فرائیڈ چکن

کرپسی چکن

اجزاء
چکن

ایک کلو (درمیانے کلوے کاٹ لیں)
دو عدد نمک مرچ ملا کر پھینٹ لیں)

انڈے

ایک کپ

میدہ

حسب ذائقہ

نمک

ایک چائے کاجج

پھیرکا

آدھا چائے کاجج

خشک ساج

آدھا چائے کاجج

سرخ مرچ کٹی ہوئی

ایک چائے کاجج

لہسن، ادرک پیسٹ

فرائی کے لیے

آئل

دو کھانے کے کاجج

سرکہ

ایک چائے کاجج

ہلدی پاؤڈر

ترکیب: چکن کو دو سو کرا ایک پیالے میں ڈالیں اس میں نمک، سرخ مرچ، لہسن، ادرک پیسٹ، سرکہ، ہلدی پاؤڈر ڈال کر خوب اچھی طرح مکس کر کے دس پندرہ منٹ تک ایک طرف رکھ دیں۔ اس کے بعد گوشت کو چاول پھانے والی چھنی میں ڈال کر بیس پچیس منٹ کے لیے رکھ دیں تاکہ گوشت کا سارا پانی نکل جائے۔ ایک پلاسٹک بیگ میں سیاہ مرچ پاؤڈر، پھیرکا، خشک ساج ڈال کر مکس کریں۔ گوشت کے

اجزاء

چکن ونگز

کوکنگ آئل

لیموں کارس

مرچیں

نمک

گرم مصالحہ

لہسن اور ادرک کا پانی

اجوائن

تل

بریڈ کریمز

انڈے

آدھا کلو

حسب ضرورت

دو کاجج

ڈیڑھ کھانے کاجج

حسب ذائقہ

آدھا چائے کاجج

دو چائے کے کاجج

چٹلی بھر

ایک چائے کاجج

ایک کپ

دو عدد

ترکیب: ونگز کو اچھی طرح دھو لیں تاکہ ان پر پر نہ لگے رہ جائیں۔ بعد ازاں تل، بریڈ کریمز اور انڈے کے علاوہ تمام مصالحہ جات نکال کر تقریباً دو سے اڑھائی گھنٹے تک فریج میں رکھ دیں۔ اچھی طرح میرینٹ ہو جائیں تو چوبیسے پچاس پر چھا کر کچھ دیر تک پکالیں۔ اس

منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ منٹ کڑا ہی کا مزہ دو بالا کرنے کے لیے آپ اسے گارلگ بریڈ کے ساتھ پیش کریں۔

فرائیڈ مشر اور مرچیں

کے بعد اتار کر ٹھنڈا کر لیں اور ایک ایک کر کے اٹھے میں ڈبونے کے بعد بریڈ کر مزلگا کر رکھتی جائیں۔ آخر میں سب ونگز کے اوپر تل چھڑک دیں اور کڑا ہی میں ڈال کر فرائی کر لیں۔ مزیدار چکن ونگز تیار ہیں۔

منٹ گرین کڑا ہی

اجزاء

ایک پاؤ

مشر

دو عدد

سبز پیاز

ایک چائے کا چمچ

چینی

پچاس گرام

سبز مرچیں

دو کھانے کے چمچ

تیل

آدھا کھانے کا چمچ

نمک

ترکیب: مشر کو چھیل کر صاف پانی میں دھو لیں۔ سبز مرچیں کاٹ لیں۔ مٹی گرم کریں اور اس میں پیاز، سبز مرچیں ڈال کر پیاز فرائی کریں اب مشر بھی ڈال دیں۔ تقریباً دو منٹ بعد چینی اور نمک بھی شامل کر دیں۔ پانچ منٹ فرائی کریں نہایت لذت آمیز ڈش تیار ہے۔

سبزی کڑا ہی

اجزاء

آدھا حصہ

پھول گو بھی

دو عدد

آلو

ایک کھانے کا چمچ

گرم مصالحہ

ایک عدد (باریک کاٹ لیں)

پیاز

تین درمیانے سائز کے

ٹماٹر

دو کھانے کے چمچ

اورک لہسن پیسا ہوا

دو عدد

ٹنڈے

ایک کھانے کا چمچ

ہلدی

چار عدد

ہری مرچیں

ایک کھانے کا چمچ

زیرہ پاؤ ڈر

اجزاء

بکرے کا گوشت

آدھا کلو

نمک

حسب ذائقہ

لہسن کے جوتے

چار سے چھ عدد

اورک

دو آج کا کٹڑا

پیاز

ایک عدد

ٹماٹر چوپ کیے ہوئے

دو عدد

ثابت کالی مرچ

دس سے بارہ عدد

سفید زیرہ

ایک چائے کا چمچ

ہری مرچیں

چار سے چھ عدد

ہر ادھیا

آدھی مٹی

سویا (باریک کٹا ہوا)

ایک کھانے کا چمچ

دہی

آدھی پیالی

کوکنگ آئل

آدھی پیالی

ترکیب: اورک، لہسن، پیاز، کالی مرچ، زیرہ، ہر ادھیا اور ہری مرچوں کو موٹا موٹا پیس لیں اور اس میں دہی اور نمک شامل کر لیں اس مصالحے سے گوشت کو اچھی طرح میرینٹ کر لیں۔ دو سے تین گھنٹوں کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ کڑا ہی میں کوکنگ آئل کو دو سے تین منٹ گرم کریں اور مصالحہ ملا ہوا گوشت ڈال کر ڈھک دیں۔ شروع میں تین سے چار منٹ آج تیز رکھیں۔ پھر درمیانے آج براتی دیر پکا میں کہ گوشت اچھی طرح گل جائے۔ آج تیز کر کے اتنی دیر بھونیں کہ آئل الگ ہو جائے۔ ٹماٹر اور سویا ڈال کر ہلکی آج پر ڈھک کر پانچ سے سات

ترکیب: ایک پین میں تیل ڈال کر زیرے کو ہلکا سا فرائی کریں۔ پھر چو پڈ ٹماٹر، میتھی، نمک، لال مرچیں، ہلدی، سبز وحنیا، کٹی اورک اور سبز مرچیں ڈال کر اچھی طرح فرائی کریں۔ پھر گئی گو بھی اور گرم مصالحہ ڈال کر ڈھک دیں اور ہلکی آج پرا تھاپکائیں کہ گو بھی گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو سبز وحنیا، سبز مرچیں اور گئی ہوئی اورک ڈال کر کھانے کے لیے پیش کریں۔

مکس سبزی کے کوفتے

اجزاء:
 آلو : آدھا کلو
 شلغم : ایک عدد
 پالک : چھ سات پتے
 نمک اور سرخ مرچ : حسب ضرورت
 ثابت وحنیا اور زیرہ : ایک چائے کا چمچ بھنا ہوا
 کوکنگ آئل : حسب ضرورت تیلنے کے لیے
 مٹر : ایک پاؤ
 گاجر : ایک عدد
 ہری مرچیں : سات عدد
 انڈا : ایک عدد

ترکیب: آلو، مٹر، شلغم کو بال کر پیس لیں۔ پالک اور مرچیں باریک کاٹ لیں۔ گاجر کو کدو کش کر لیں اور تمام سبزیوں کو ملا لیں۔ پھر اس میں نمک و لال مرچ اور زیرہ ملا دیں۔ سب کو اچھی طرح مکس کر کے درمیانے سائز کے کوفتے بنائیں اور انڈا کا کر کوکنگ آئل میں ہلکے برادرن ہونے تک فرائی کر لیں۔ پھر سالن والا مصالحہ بھون کر تھوڑا سا پانی ڈالیں اور کوفتے شامل کر کے ہلکی آج پرا تھوڑی دیر کے لیے دم دے دیں۔ لیجیے منظر اور مزید ارسال تیار ہے

☆.....

اورک : ایک درمیانہ کلزا
 گاجر : ایک عدد
 توری : ایک عدد
 کٹی لال مرچ : دو کھانے کے چمچے
 نمک : حسب ذائقہ
 دہی : آدھا پاؤ

ترکیب: ایک کڑا ہی میں تیل گرم کریں اور پیاز ڈال کر ہلکا گلابی رنگ ہونے تک فرائی کریں، پھر اورک، لہسن پسا ہوا ڈال کر مکس کریں۔ ایک منٹ کے بعد کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال کر نمک، کٹی لال مرچیں، ہلدی، زردہ پاؤ ڈر اور گرم مصالحہ پاؤ ڈر ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور ساری سبزیوں ڈال دیں۔ مکس کر کے دہی بھی ڈال دیں اور تین چار منٹ تک بھونیں۔ پھر ہرا وحنیا اور کٹی ہوئی اورک ڈال کر مکس کریں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر دم پر نکالیں۔ تیار ہونے پر ہری مرچوں، ہرا وحنیا اور گئی ہوئی اورک کے ساتھ پیش کریں۔

پھول گو بھی اور میتھی کی سبزی

اجزاء:
 پھول گو بھی : ایک کلو
 گرم مصالحہ پاؤ ڈر : ایک چائے کا چمچ
 لال مرچیں : ایک چائے کا چمچ
 نمک : حسب ذائقہ
 قصوری میتھی : ایک کھانے کا چمچ
 تیل : پون کپ
 سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ
 اورک (باریک کٹی ہوئی) : دو کھانے کے چمچے
 ہلدی : آدھا چائے کا چمچ
 ٹماٹر : دو عدد
 سبز مرچیں : تین عدد
 سبز وحنیا : پون کٹھی

ہسٹری

دماغ دھبوں سے پاک جلد

دھوپ، ناقص خوراک اور خراب صحت چہرے کی جلد کو متاثر کرنے کا سب سے اہم سبب ہیں، انسانی جلد حیرت انگیز حفاظتی رد عمل رکھتی ہے۔ جلد کی گہری اندرونی تہہ میں خلیے میلانین پیدا کرتے ہیں، جب ہم دھوپ میں آتے ہیں تو میلانین کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ عمل جب ایک دفعہ پیدا ہوتا ہے تو جلد کی بیرونی تہہ میں آ جاتا ہے اور اس سے جلد پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے جلد کو دھوپ سے بچانا چاہیے اور ایسی مصنوعات کا استعمال کرنا چاہیے جو جلد کو دھوپ کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں سن اسکرین کا استعمال انتہائی مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن کسی بھی سن اسکرین کریم کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ان میں کیمیائی اجزاء کی تعداد زیادہ نہ ہو۔ حسن و خوب صورتی کے ماہرین کے مطابق جلد کی حفاظت قدرتی مصنوعات سے کی جائے تو وہ نہ صرف جلد کے دھبوں کو ختم کرتی ہیں بلکہ اسے اندر تک صحت مند بھی بناتی ہیں۔ جلد کے لیے سنڈل کی لکڑی پر مشتمل سن اسکرین دھوپ سے تحفظ کے لیے مثالی ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ جلد کی حفاظت کے لیے دوسرا اہم امر اس کی باقاعدگی سے کلیزنگ ہے۔ سن اسکرین خریدتے وقت ایسے برانڈ کا

انتخاب کریں جس میں گلیسرین اور لیموں کا رس بھی پایا جائے، لیموں کے رس پر مشتمل فیس ماسک لگانے سے بھی جلد کی تہہ میں چھپا سارا میل باہر نکل آتا ہے اور جلد تروتازہ رہتی ہے۔ اسی طرح خراب صحت اور ناقص خوراک بھی چہرے کی جلد کو بے رونق بنا دیتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اچھی خوراک کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ جلد کی قدرتی نمی کے لیے خون میں نمکیات اور وٹامنز کی مقدار برقرار رکھی جائے۔ پھل، سبزی اور سلاڈ وغیرہ جلد کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ دن میں کم از کم تین گلاس جوس جلد کے لیے بہت مفید ہے۔ گاجر، سیب یا مالٹے اور کینو وغیرہ کا جوس جلد کو تروتازہ اور صحت مند بنانے کے لیے ادویات اور میک اپ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

ہاتھوں کی دلکشی

ہاتھ انسانی جسم کا بہت ہی اہم اور نمایاں عضو ہے جس طرح چہرہ خوب صورت اور تروتازہ رکھنے کے لیے کوششیں کی جاتی ہیں اسی طرح ہاتھ بھی توجہ کے مستحق ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے یہاں کی اکثر خواتین چہرے کی خوب صورتی پر توجہ دیتی ہیں مگر ہاتھوں کو نظر انداز کر دیتی ہیں جس سے ہاتھوں کی خوب صورتی اور دلکشی برقرار نہیں رہتی اور ہاتھ خشک اور کھردرے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ موسم خواہ گرم ہو یا پھر سرد

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

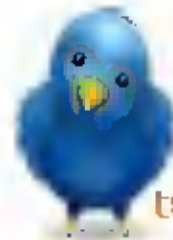
WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہاتھوں کی حفاظت اور ان کی دیکھ بھال انتہائی ضروری ہے۔ ہاتھوں کے ارد گرد تھوڑے سے نیم گرم تیل کی مالش کریں اور پھر اسے اچھی طرح صاف کر لیں تاکہ چکنائی کا نام و نشان باقی نہ رہے پھر ہائیڈروجن پر آکسائیڈ کے تین چمچ، امونیا کے ایک چمچ میں ملائیں اور پھر کورونکے ٹکڑے سے انگلیوں اور ہاتھوں پر لگائیں دو یا تین منٹ کے بعد ہاتھوں کو دھو کر خشک کر لیں اگر آپ کے ہاتھ خراب ہیں اور آپ ان کو نمایاں کرتے وقت احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہیں تو تھوڑی سی توجہ سے آپ کے ہاتھ خوب صورت بن سکتے ہیں کیونکہ ہاتھوں کی خراش تراش کی جائے تو ان کی خوب صورتی کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اپنے ناخنوں کو بھی صاف ستھرا رکھیں اور تراشے وقت سب سے پہلے شفاف بیس کوٹ ناخنوں پر لگائیں جب یہ خشک ہو جائے تو پورے ناخن کو یا تو شفاف یا پھر قدرتی گلابی رنگ کی نیل پالش دیں اور ناخنوں کے صرف سامنے والے سرے پر لگائیں۔ جب یہ خشک ہو جائیں تو قدرتی گلابی رنگ کی نیل پالش استعمال کریں۔ سونے سے نل اپنے ہاتھوں پر کریم لگائیں۔

ہاتھ اور پاؤں خراب ہونے کی وجوہات
 ☆ ہاتھوں اور پاؤں کی مکمل صفائی نہ کرنے کی وجہ سے ہاتھوں اور پاؤں میں لکیریں پڑ جاتی ہیں۔

تھک جوتا پہننے سے بھی پاؤں سوج جاتے ہیں اور ان پر نشان پڑ جاتے ہیں۔

☆ سرویوں میں ہاتھوں اور پاؤں پر خشکی آجاتی ہے اس کی وجہ سے ہاتھ پاؤں پھٹ جاتے ہیں اور ہاتھوں اور پاؤں کی رنگت کالی پڑ

جاتی ہے۔
 ☆ بار بار دھونے سے بھی ہاتھ خراب ہو جاتے ہیں۔

☆ جوتا ہمیشہ آرام دہ استعمال کریں۔
 بال خوب صورت ملائم رکھنے کا طریقہ

☆ کھل سے سردھوئیں۔ سرسوں کی کھل کوٹ کر رکھ لیں۔ نہانے سے پہلے گرم پانی میں بھگو دیں اور پھر سر میں مل کر پانی سے دھوئیں۔ بال نرم ملائم ہو جائیں گے۔

☆ آٹے، ہریڑ، بیڑہ ہم وزن لے کر کوٹ لیں۔ ایک گلاس گرم پانی میں سفوف ڈالیں۔ اس سے سردھوئیں۔ بال خوب صورت رہیں گے۔

☆ سیکا کائی اور ریٹھے ہم وزن لے کر سفوف بنا لیں جن کے بال زیادہ گھنے ہوں وہ یہ سفوف استعمال کریں۔

☆ لیموں کا رس تیل میں ملا کر جڑوں میں مالش کریں۔

☆ گلوچی پین کر اس کے ساتھ سردھوئیں۔
 بال نرم و ملائم ہو جائیں گے۔

چہرے کا میل صاف کرنے کے لیے

جو کے آنے کے استعمال سے بھی چہرے کا میل صاف ہو جاتا ہے۔ تھوڑے سے آنے میں چند قطرے زیتون کا تیل اور آدھا چمچ شہد ملائیں۔ اس میں تھوڑا سا پانی ڈالیں اور پھر اس آمیزے کو چہرے پر خوب مل لینے کے بعد پانی سے منہ کو دھو لیں۔ جو کا آٹا بازار سے با آسانی مل جاتا ہے اور آپ گرائنڈر میں ثابت جو پیس بھی سکتی ہیں۔ اس آمیزے میں لیموں کے عرق کے چند قطرے بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے بھی میل صاف ہو جاتا ہے۔ ☆☆